S.e.S

Cut by [illegible]

مضامین فرحت

حصۂ دوم

مرزا فرحت اللہ بیگ

قیمت

تین روپے

پرنٹر:- شاہی پریس لکھنؤ

ناشر:- مکتبہ کلیاں لکھنؤ

فہرست مضامین

بہادر شاہ
اور
پھول والوں کی سیر

سعدی علیہ الرحمۃ نے کیا خوب کہا ہے ؎

"رعیت چو بیخ است سلطاں درخت ٭ درخت اے پسر باشد از بیخ سخت"

یہ جڑوں ہی کی مضبوطی تھی کہ دلی کا سرسبز و شاداب چمن اگرچہ حوادث زمانہ کے ہاتھوں پائمال ہو چکا تھا اور فلاکت کی بجلیوں اور باد مخالف کے جھونکوں سے سلطنت مغلیہ کی شوکت و اقتدار کے بڑے بڑے ٹہنے ٹوٹ ٹوٹ کر گر رہے تھے۔ پھر بھی کسی بڑی سے بڑی طاقت کی ہمت نہ ہوتی تھی کہ اس برائے نام بادشاہ کو تخت سے اُتار کر دلی کو اپنی سلطنت میں شریک کرے۔ مرہٹوں کا زور ہوا۔ پٹھانوں کا زور رہا۔ جاٹوں کا زور رہا۔ انگریزوں کا زور رہا۔ مگر دلی کا بادشاہ دلی کا بادشاہ ہی رہا۔ اور جب تک دِلی بالکل تباہ نہ ہولی۔ اُس وقت تک کوئی نہ کوئی تخت پر بیٹھنے والا نکلتا ہی رہا۔ دلی کے رزیڈنٹ نے بہت کچھ چاہا کہ بادشاہ کے اعزاز و احترام میں کمی کر دے۔ گورنر جنرل نے بڑی کوشش کی کہ شاہی خاندان کو قطب میں منتقل کر کے قلعہ پر قبضہ کرے۔ کورٹ آف ڈائرکٹرز نے بہت زور دیا کہ دلی کی بادشاہت کا خاتمہ کر دیا جائے۔ مگر بوڑھے اس پر کسی طرح تیار نہ ہوئے وہ جانتے تھے کہ دلی کا بادشاہ کیا ہے اور اس کے اثرات کہاں تک پھیلے ہوئے ہیں۔

بڑے بڑے مباحثے ہوئے۔ نوجوانوں نے بہت جوش و خروش دکھایا مگر انگلستان کے جہاندیدہ بڈھوں کے سامنے کچھ نہ چلی جب بورڈ میں مسٹر ملکر نے کھڑے ہو کر کہا عزیزو! میں پچاس سال ہندوستان میں رہا ہوں۔ میں وہاں کے رنگ سے اچھی طرح واقف ہوں میں جانتا ہوں کہ دلی کا قلعہ کیا ہے۔ اس کی بنیاد اگر ایک طرف کابل تک گئی ہے تو دوسری طرف راس کماری تک۔ ایک جانب آسام تک ہے تو دوسری جانب کاٹھیاواڑ تک۔ ذرا قلعہ کو ہاتھ لگایا۔ تو وہ زلزلہ آئے گا کہ سارا ہندوستان ہل جائے گا۔ یہ برائے نام بادشاہت جس طرح چل رہی ہے اسی طرح چلنے دو"۔ آخر بورڈ میں بڈھے جیتے اور جوان ہارے۔ دلی کے بادشاہ کا اقتدار ضرور کم ہو گیا۔ مگر جو عقیدت رعایا کو بادشاہ سے تھی اُس میں ذرہ برابر فرق نہ آیا اور جو محبت بادشاہ کو رعایا سے تھی وہ جیسی کی ویسی رہی۔ رعایا کی وہ کون سی خوشی تھی جس میں بادشاہ حصہ نہ لیتے ہوں اور بادشاہ کا وہ کون سا رنج تھا جس میں رعایا شریک نہ ہوتی ہو۔ بات یہ تھی کہ دونوں جانتے اور سمجھتے تھے کہ جو ہم ہیں وہ یہ ہیں اور جو یہ ہیں وہ ہم ہیں۔

شاہ عالمگیر ثانی کے قتل کے واقعہ ہی پر نظر ڈال لو۔ دیکھو کہ ہندو مرد تو مرد عورتوں کو بھی بادشاہ سے کیسی محبت تھی اور خود بادشاہ اس محبت کی کیسی قدر کرتے تھے۔

عالمگیر ثانی کو فقیروں سے بڑی عقیدت تھی۔ جہاں سُن پاتے کہ کوئی فقیر آیا ہوا ہے اُس کو بلاتے نہ آتا تو خود جاتے۔ اس سے ملتے بہت کچھ دیتے دلاتے اور فقیر نوازی کو توشۂ آخرت سمجھتے۔ غازی الدین خاں اس زمانہ میں دلی کا وزیر تھا۔ خدا جانے اس کو بادشاہ سے کیوں دلی نفرت تھی۔ قلعہ میں تو ہاتھ ڈالنے کی ہمت نہ پڑی۔ دھوکے سے بادشاہ کو مارنے کا جال پھیلایا۔ قلعہ میں مشہور کر دیا کہ پرانے کوٹلہ میں ایک بزرگ آئے ہوئے ہیں۔ بڑے صاحبِ کرامات ہیں۔ بڑے خدا رسیدہ ہیں۔ مگر نہ کہیں خود جاتے ہیں

نہ کسی کو آنے دیتے ہیں۔ ادھر بادشاہ کو ملنے کا شوق ہوا۔ اُدھر لوگوں نے شاہ صاحب کی کرامتوں کے اور پل باندھے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ایک دن بادشاہ تن تنہا قلعہ سے نکل کر کوٹلہ پہونچے۔ اِدھر اُدھر کھنڈروں میں تلاش کی۔ یہاں تو پہلے ہی سے دشمن لگے ہوئے تھے۔ چار نمک حراموں نے ایک بُرج میں سے نکل کر بادشاہ کو شہید کر دیا۔ اور لاش جمنا کی ریتی میں پھینک دی۔ خدا کی قدرت دیکھو ادھر سے ایک برہمنی رام کنور آرہی تھی۔ اُس نے جو لاش پڑی دیکھی تو ذرا ٹھٹکی۔ بھاگنے کا ارادہ کیا۔ پھر ذرا غور کیا تو کیا دیکھتی ہے کہ ہیں' یہ تو بادشاہ سلامت کی لاش ہے۔ رات بھر اُس بے کس شہید کا سر زانو پر لئے بیٹھی روتی رہی۔ صبح جمنا جی کے اشنان کو لوگ آئے انھوں نے بھی لاش کو دیکھ کر پہچانا۔ تمام شہر میں کھلبلی پڑ گئی اس بے کس شہید کی لاش دفن ہوئی۔ شاہ عالم ثانی بادشاہ ہوئے۔ انھوں نے رام کنور کو بلایا بہت کچھ انعام و اکرام دیا اور اس برہمنی کو اپنی منھ بولی بہن بنایا۔ تھوڑے دنوں میں سلونوں کا تہوار آیا۔ بھائی کے لئے بہن موتیوں کی راکھی لے کر پہونچی۔ بادشاہ نے خوشی خوشی راکھی بندھوائی۔ بہن کو جوڑا دیا۔ اس کے رشتہ داروں کو خلعت دئے۔ یہیں سے راکھی بندھن کی رسم قلعہ کی رسموں میں شریک ہو گئی۔ جب تک قلعہ آباد رہا۔ اس برہمنی کے خاندان اور قلعہ والوں میں بھائی چارہ رہا۔ ہر سال راکھیاں آتیں۔ بادشاہ اور شہزادیوں کے باندھی جاتیں۔ جوڑے دئیے جاتے۔ یہ سلسلہ اُس وقت ٹوٹا جب بادشاہ سے قلعہ چھوٹا۔

پھول والوں کی سیر بھی اسی محبت باہمی کا نتیجہ تھی۔ ہوا یہ کہ اکبر شاہ ثانی اپنے منجھلے بیٹے مرزا جہانگیر کو ولیعہد بنانا چاہتے تھے۔ سراج الدین ظفر بڑے بیٹے تھے مگر باپ بیٹے میں صفائی نہ تھی۔ مرزا جہانگیر کو بادشاہ بہت چاہتے تھے اور کیوں نہ چاہتے۔ مرزا کی والدہ نواب ممتاز محل کا قلعہ میں زور تھا۔

بادشاہ سلامت اور بادشاہ بیگم دونوں نے رزیڈنسی میں کوشش کی کہ کسی طرح مرزا جہانگیر ولیعہد ہوجائیں۔ اس زمانہ میں دلی کے رزیڈنٹ سیٹن صاحب تھے۔ ایسا بادشاہ پرست انگریز شاید ہی ہندوستان میں کوئی آیا ہو۔ اکبر شاہ کی وہ ایسی ہی عزت کرتے تھے جیسی خود اپنے بادشاہ کی کرتے تھے۔ ٹوپی اتار کر بھر ا گاہ سے آداب بجالاتے۔ کرسی دی جاتی تو بادشاہ کے سامنے کبھی نہ بیٹھتے گفتگو میں آداب شاہی ملحوظ رکھتے۔ بادشاہ کی ہر خواہش کو پورا کرنے کی کوشش کرتے۔ غرض سب کچھ کرتے تھے مگر اس بات پر راضی نہ ہوتے تھے کہ مرزا جہانگیر ولی عہد ہوں۔ بظاہر اس کی ایک وجہ تو یہ تھی کہ وہ سلسلۂ تخت نشینی کو درہم برہم کرنا نہیں چاہتے تھے اور دوسری یہ تھی کہ وہ مرزا جہانگیر کے علاوات و اطوار سے مطمئن نہ تھے۔

مرزا جہانگیر بلا کے پینے والے اور غضب کے منہ پھٹ تھے۔ اس مخالفت سے دلوں میں بیر تو پڑ ہی گیا تھا۔ ایک دن سر دربار مرزا جہانگیر نے سیٹن صاحب کو "لُولُو ہے بے" کہدیا۔ صاحب کسی نہ کسی طرح پی گئے۔ تھوڑے دنوں بعد یہ غضب کیا کہ ان پر گولی چلائی۔ آخر کہاں تک طرح دی جاتی۔ قید ہو کر الہ آباد گئے۔ ممتاز محل کو بڑا صدمہ ہوا منت مانی کہ مرزا جہانگیر چھوٹ کر آئیں گے تو حضرت خواجہ قطب الدین بختیار کاکی رحمتہ اللہ علیہ کے مزار پر چادر اور پھولوں کی مسہری چڑھاؤں گی۔ خدا کی قدرت اور سیٹن صاحب کی شرافت دیکھئے کہ ان ہی کی سفارش پر صاحب عالم اس قید سے رہا ہوئے۔ دلی آئے۔ بادشاہ بیگم نے منت بڑھانے کی تیاریاں کیں بڑی دھوم دھام سے چادر گئی۔ شہر بھر کے تمام ہندو مسلمان شریک ہوئے۔ قطب میں کئی دن تک میلہ لگا رہا۔ پھول والوں نے جو مسہری بنائی، تو اُس میں خوبصورتی کے لئے ایک پھولوں کا پنکھا بھی لٹکا دیا۔ سراج الدین ظفر ولیعہد سلطنت نے

"پنکھا" کہہ کر گذر جاتا۔

نورِ الطاف و کرم کی ہے یہ سب اسکے جھلک ۔۔۔ کہ وہ ظاہر ہے بلبک او رہے باطن میں فلک
اس تماشہ کی نہ کیوں دھوم ہو افلاک تلک ۔۔۔ آفتابی سے خجل جس کے ہے خورشید فلک
یہ بنا اس شہ اکبر کی بدولت پنکھا

شائق اس سیر کے سب آج ہیں با دیدہ دل ۔۔۔ واقعی سیر ہے یہ دیکھنے ہی کے قابل
چشم انجم ہو نہ اس سیر پہ کیوں کر مائل ۔۔۔ سیر یہ دیکھے ہے وہ بیگم والا منزل
جس کے دیواں کا رکھے ماہ سے نسبت پنکھا

رنگ کا جوش ہے ماہی سے زلبس ماہ تلک ۔۔۔ ڈوبے ہیں رنگ میں ہوش سے آگاہ تلک
آج رنگین ہے رعیت سے لگا شاہ تلک ۔۔۔ زعفراں زار ہے اک بام سے درگاہ تلک
دیکھنے آئی ہے اس رنگ سے خلقت پنکھا

بادشاہ کو میلہ بہت پسند آیا۔ دلی والوں سے پوچھا کہ اگر ہر سال بھادوں کے شروع میں یہ میلہ ہوا کرے تو کیسا؟ مسلمان درگاہ شریف پر پنکھا چڑھائیں۔ ہندو جوگ مایا جی پر چڑھائیں۔ مسلمانوں کے پنکھے میں ہندو اور ہندوؤں کے پنکھے میں مسلمان شریک ہوں۔ میلہ کا میلہ ہو اور دونوں قوموں میں میل جول بڑھے۔ بھلا کسکی اور پوچھ پوچھ۔ دلی والے راضی ہو گئے۔ لیجئے پھول والوں کی سیر کی بنیاد پڑ گئی۔ بادشاہ سلامت خود قطب جاتے وہاں رہتے۔ شہزادے میلہ میں شریک ہوتے۔ بڑھتے بڑھتے یہ میلہ کچھ کا کچھ ہو گیا۔ اُسی زمانہ میں یہ گانا چلا۔

قطب کو چلا میرا اکبر ہٹیلا ۔۔۔ نہ رستہ میں جنگل نہ ملتا ہے ٹیلا

بہادر شاہ کے زمانہ میں تو اس کا وہ زور ہوا کہ بیان سے باہر ہے اگر یہ دیکھنا ہو کہ اس زمانہ میں پھول والوں کی سیر کیسی ہوتی تھی۔ تو ذرا آنکھیں بند کر لیجئے میں دکھائے دیتا ہوں۔

۱۲۶۷ھ کا ساون بھی غضب کا ساون تھا۔ یا تو برستا ہی نہ تھا۔ یا برسا تو ایسا برسا کہ جل تھل بھر گئے۔ بدھ بدھ پندرہ دن ہو گئے مینھ نہ آج کھلتا ہے نہ کل۔ اوپر پانی کا یہ حال ہے کہ دھائیں دھائیں یکساں برسے چلا جاتا ہے۔ جمنا بڑھ کر نگمبود گھاٹ تک آ گئی۔ کیلا گھاٹ میں سے پانی ہو کر شہر میں گھس آیا۔ چاندنی چوک کی نہر ابل کر کناروں سے نکل گئی۔ بیچارے چھوٹے چھوٹے مکانوں کا تو ذکر ہی کیا ہے۔ بڑی بڑی حویلیاں چپ بول گئیں۔ اڑا اڑا دھم کی آوازیں چلی آ رہی ہیں۔ اس مکان کی چھت بیٹھی، اُس کا پاکھا گرا۔ شاید ہی کوئی مکان ہوگا جس کی کم سے کم چھت نہ گری ہو۔ غریب غربا گھر چھوڑ کر باہر نکل آئے جامع مسجد کے نیچے سامان کا ڈھیر ہو گیا کسی نے پلنگ بچھا اوپر سے دری ڈال چھوٹی سی کوٹھری بنالی کسی نے چھپر کھٹ کے گرد چادر گھیر، عورتوں کے لئے جگہ نکال لی۔ غرض ایک عجیب پریشانی کا عالم تھا۔ دو سال پہلے بھی ڈھائی ڈھوئی مینھ برسا تھا۔ مگر یہ تو کچھ اور ہی رنگ تھا۔ سبھی اپنی مصیبت میں مبتلا تھے۔ بھٹیارے اپنے حال میں گرفتار۔ آخر رہیں تو کہاں رہیں اور کھائیں تو کیا کھائیں۔

دلی میں بہادر شاہ برائے نام بادشاہ تھے۔ سارا انتظام کمپنی بہادر کے ہاتھ میں تھا۔ بھلا کمپنی کو کیا غرض پڑی تھی جو ان غریب شہر والوں کی خبر لے شہر والے جانیں اور اُن کا کام جانے۔ خیر۔ بادشاہ سلامت کو خبر ہوئی۔ بیچارے کے جو کچھ اختیار میں تھا وہ کیا۔ سارے سرکاری مکان کھلوا دیئے۔ کوٹ قاسم کی مال گزاری انہی دنوں میں آئی تھی وہ سب کی سب اس مصیبت ماری رعیت پر خرچ کر دی۔ مسلمانوں کو دونوں وقت کھانا پہنچایا۔ ہندوؤں کو غلہ دیا۔ سر چھپانے کو جگہ دی۔ غرض یہ مصیبت کے دن بھی کسی نہ کسی طرح گذر گئے سولھویں دن ذرا پانی نے دم لیا۔ ابر پھٹا۔ سورج کا کونا دکھائی دیا۔ لوگوں کی جان میں جان آئی۔ دو چار دن

مکانوں کی مرمت اور حالت کی درستی میں لگے۔ اس کے بعد یاروں کو میلہ کی سوجھی۔

بھلا جمنا ایسی بھرپور چلے اور دلی والے چپکے بیٹھے رہیں۔ ڈھنڈورا پٹ گیا کہ کل تیراکی کا میلہ ہے۔ صبح ہی سے قلعہ کے سامنے لوگوں کا ہجوم ہونے لگا۔ آٹھ نو بجے تک تو یہ حالت ہوئی کہ شہر خالی ہو، بیلہ[1] آباد ہو گیا۔ پنواڑیوں، کاچھیوں، بساطیوں، داگروں غرض ہر قسم کے سودے والوں کی دوکانیں لگ گئیں۔ جنگل میں منگل ہو گیا۔ بادشاہ سلامت بھی نکل ثمن[2] برج میں آ بیٹھے۔ شہزادوں کے لئے دیوان خاص کے صحن میں فرش ہو گیا۔ بیگمات اور شہزادیوں کے لئے موتی محل، خاص محل اور اسد برج کی جالیوں کے سامنے مسندیں بچھ گئیں۔ تیراکوں کے اُستاد اپنے اپنے شاگردوں کو لے جمنا میں اُترے اور تیراکی کے کمال دکھانے شروع کئے۔ کوئی چت تیرا تو اس طرح گویا تختہ بہتا چلا آتا ہے۔ کسی نے ڈُبکی ماری تو ایسی کہ گھنٹے تک پانی سے باہر نکل آیا۔ کوئی ہے کہ گٹھری بنا بہاؤ پہ چلا جاتا ہے۔ کوئی شیر کے ہاتھ مارتا چڑھاؤ پہ سیدھا چڑھ رہا ہے۔ اِدھر تیراکی ہو رہی تھی اُدھر قلعہ والوں اور شہر والوں میں کنکوے بازی شروع ہوئی۔ پتنگیں لڑیں تو ایسی کہ چکراتی چکراتی مقبرہ[3] سے آگے نکل گئیں۔ پتنگ لڑے تو ایسے کہ سارا آسمان کنکوؤں سے چھپ گیا۔ غرض یہ معلوم ہی نہ ہوتا تھا کہ دو دن پہلے اس شہر میں آفت بپا تھی۔ شام ہوتے ہوتے میلہ بچھڑنا شروع ہو گیا رات کے نو دس بجے بیلہ پھر وہی جنگل کا جنگل ہو گیا۔ ہاں دونوں اور آبخوروں کے ڈھیر، پیکوں کے نشان اور چھلکوں کے انبار یہ ضرور بتاتے تھے کہ یہاں کوئی بڑا شہر تھا جو دم بھر میں بسا اور دم بھر میں غائب ہو گیا۔

ساون ختم ہوا، بھادوں لگا۔ جھڑیوں کا زمانہ گیا۔ بھوار کا زمانہ آیا۔ دلی والوں کے

۱؎ جمنا کی ریتی کے برابر جھاؤ کا جو جنگل ہے اُس کو بیلہ کہتے ہیں۔
۲؎ قلعہ میں تسبیح خانہ سے ملا ہوا یہ ایک ہشت پہل برج ہے۔ نام تو اسکا مثمن برج لیکن دلی والے اسکو ثمن برج کہتے ہیں۔
۳؎ مقبرہ سے مراد ہمایوں کا مقبرہ ہے۔ یہ عمارت دلی سے کوئی تین میل کے فاصلہ پر ہے۔

دلوں میں پھر گدگدی شروع ہوئی۔ قطب کا سبزہ آنکھوں کے سامنے پھرنے لگا۔ پھول والوں کی سیر کی سوجھی۔ شرفا دہلی میں سے دو ہندو اور دو مسلمان لال حویلی[۱] پہنچے اطلاع کرائی۔ باریابی ہوئی۔ اِدھر اُدھر کی گفتگو کے بعد حرفِ مطلب زبان پر لائے۔ کہا "پیر و مرشد۔ پھول والوں کی سیر کا زمانہ آگیا ہے۔ جھرنا اور شمسی تالاب بھر کر کٹورہ ہو گئے ہیں۔ کوئی تاریخ مقرر فرمادی جائے۔ اگر جہاں پناہ بھی تشریف لائیں تو زہے نصیب" بادشاہ نے فرمایا "ہاں اماں[۲] ٹھیک تو ہے۔ جو تمھاری خوشی۔ ۱۵ ار تاریخ مقرر کردو۔ رہا ہمارا آنا۔ تو جہاں تم وہاں ہم۔ کیوں نہ آئیں گے" تاریخ مقرر ہونا تھا کہ شاہی روشن چوکی کا شہنائی نواز چاندی کی نفیری ہاتھ میں لئے حاضر ہوا۔ نفیری پر شادیانہ بجایا۔ لیجئے سیر کی ۱۵ ار تاریخ پکی ہوگئی۔ سارے شہر میں نفیری بج گئی کہ پندرھویں کو پھول والوں کی سیر ہے۔ لوگوں نے تیاریاں شروع کیں۔ بادشاہ سلامت دربارِ خاص سے اُٹھ کر تسبیح خانہ میں گئے ہی تھے کہ تمام بیگمات اور شہزادیاں جمع ہونی شروع ہوئیں۔ ایک آتیں سلام کرکے بیٹھ جاتیں دوسری آتیں بیٹھ جاتیں۔ تھوڑی دیر میں سارا قلعہ، تسبیح خانہ میں جمع ہوگیا لیکن سب ہیں کہ منہ سے چپ ہیں۔ مگر نگاہیں صاف کہہ رہی ہیں کہ قطب چلئے۔ بادشاہ سلامت بھی سمجھ گئے۔ فرمایا۔

"اماں۔ میں تمھارا مطلب سمجھ گیا۔ سیر کی تاریخ مقرر ہوگئی ہے۔ آج دس ہے۔

ح ۱ دہلی کے قلعہ کو لال حویلی یا صرف حویلی بھی کہتے تھے۔ حافظ عبدالرحمٰن احسان کا شعر ہے:-

میری تنخواہ لوٹی ان لٹیروں نے حویلی میں — دہائی ہے بہادر شاہ غازی کی دہائی ہے

ح ۲ آخر زمانہ میں شاہان دہلی انھی معنوں میں "اماں" کا لفظ استعمال کرتے تھے جن معنی میں ہم آجکل "کیوں جی" کا لفظ بولتے ہیں۔ مولوی عبدالحق صاحب سکریٹری اُردو کا یہ خیال تھا کہ یہ لفظ شاید "اے میاں" کا مخفف ہے چنانچہ اب بھی دہلی میں اے میاں کو مختصر کرکے "امیاں" بولا جاتا ہے۔ ان کے اس خیال کو پیش نظر رکھ کر میں نے دہلی کے شہزادوں سے اس کی مکرر تحقیق کی۔ معلوم ہوا کہ بادشاہ سلامت اس لفظ کو اپنے اصلی یعنی "ماں" کے معنوں میں استعمال کرتے تھے۔ اس لفظ کا استعمال حیدرآباد دکن میں اب بھی عام طور سے ہوتا ہے۔

پندرہ کوس پر ہے۔ اچھا ہو گا کہ سب سے پہلے ہم چلے چلیں۔ بعد میں گئے تو شہر والوں کو تکلیف ہوگی۔ دو تین دن قطب کا لطف اُٹھالو۔ اور پھر قطب دلی والوں کے سپرد کر دو۔ لو جاؤ چلنے کی تیاری کرو۔ انشاء اللہ کل سویرے سویرے روانہ ہوں گے۔ اور ہاں میاں دارا[۵۱] تم ہماری سواری کا بندوبست کرو۔ کوتوال سے کہہ دو قلعہ دار سے کہہ دو۔ حکیم[۵۲] صاحب سے میں خود کہہ دوں گا۔ کل صبح سویرے نکل گئے تو سلطان جی ہوتے ہوئے شام تک انشاء اللہ قطب پہونچ جائیں گے" یہ سب لوگ تو اتنا سننے کے لئے جمع ہی ہوئے تھے ایک ایک اُٹھ مجرا کر رخصت ہوا۔ سامان بندھنے لگا۔ سامان بندھتا اور داروغہ توشک[کذا] کے پاس پہونچ جاتا۔ تھوڑی دیر نہ گذری تھی کہ بیسیوں پیٹیاں، سیکڑوں بوغبندے، ہزاروں گٹھریاں۔ لاکھوں پوٹلیاں غرض الم غلم منوں سامان جمع ہو گیا۔ کچھ چھکڑوں میں لادا گیا۔ کچھ اونٹوں پر چڑھایا گیا۔ کچھ شکرموں[۵۳] میں رکھا گیا۔ کوئی بارہ ساڑھے بارہ کا عمل ہوگا کہ سامان چلنا شروع ہوا۔ خدا خدا کر کے کہیں دو بجے اس لین ڈوری کا تانتا ختم ہوا۔ اس وقت کہیں جا کر بیچارے داروغہ کو دم لینے کی فرصت ملی ابھی پوری طرح دم نہ لیا تھا کہ ماہر وابیگنی نے حکم پہونچایا کہ "حضرت جہاں پناہ کا ارشاد ہوا ہے کہ توشک خانہ شاہی ابھی روانہ ہو۔ جنگلی محل میں قیام ہوگا۔ اس لئے خیموں، سراپردوں اور شامیانوں کو بھیجنے کی ضرورت نہیں ہے۔ ہاں شہر والے اگر یہ سامان طلب کریں تو دے دیا جائے۔ دوسرے حکم کا انتظار نہ کیا جائے۔ اور حکیم صاحب کے ذریعہ سے شہر کے لوگوں کو اس حکم کی اطلاع کرا دی جائے" حکم پہونچنا تھا کہ داروغہ صاحب پھر کمر باندھ، اپنے پیش دستوں کو لے۔ سرکاری سامان باندھنے کی فکر میں لگ گئے۔

---

۵۱ مرزا دارا بخت ولیعہد سلطنت تھے۔

۵۲ احترام الدولہ۔ عمدۃ الحکما معتمد الملک۔ حاذق الزماں حکیم محمد احسن اللہ خاں ثابت جنگ بہادر وزیر اعظم تھے۔ ان ہی کی شہادت نے بیچارے بادشاہ کو دن نگون دکھایا۔

۵۳ اونٹ گاڑی کو پہلے شکرم کہتے تھے۔ پھر یہ لفظ بند گھوڑا گاڑی کے لئے بھی بولا جانے لگا۔

یہاں انتظام والے تو اپنی مصیبت میں گرفتار تھے اور وہاں قلعہ والوں کی یہ حالت تھی کہ گویا شادی رچی ہوئی ہے۔ چوڑی والیاں بیٹھی دھانی چوڑیاں پہنا رہی ہیں رنگ ریزنیں سرخ دوپٹے رنگ رہی ہیں۔ کہیں مہندی لپس رہی ہے۔ کہیں کڑاہیاں نکالی جا رہی ہیں۔ کہاں کا کھانا اور کہاں کا سونا۔ اسی گڑبڑ میں رات کے بارہ بجا دیئے۔ کوئی دو بجے ہوں گے کہ سواری کا بگل ہوا۔ قلعہ کے لاہوری دروازہ کے سامنے نوبت خانہ سے ملا ہوا جو میدان ہے اُس میں سواریاں آ لگیں۔ انّائیں، مغلانیاں۔ خواصیں[۱]۔ چھوکریاں، لونڈیاں، سرتیں[۲] سوار ہونا شروع ہوئیں، بہارکسوں۔ منجھولیوں۔ اور بہلیوں میں وہ ٹھسا ٹھس ہوئی کہ خدا کی پناہ، سانگیوں[۳] اور ماچیوں[۴] میں پہلے تو اٹاٹ سامان بھرا۔ اوپر سے جی دو دو تین تین چھوکریاں اور مامائیں دھنس گئیں۔ غرض کسی نہ کسی طرح سے یہ مشکل بھی آسان ہوئی، بیل لگائے گئے اور یہ قافلہ قطب کو روانہ ہوا۔ مشعلچی مشعلیں اور تیل کی کپیاں ہاتھوں میں لئے ساتھ ہوئے۔ یہ لوگ قلعہ سے باہر ہی ہوئے ہوں گے کہ بیگمات اور شہزادیوں کے رتھیں ڈولیاں نیمے[۵]۔ میانے[۶]۔ پالکیاں[۷]، چوپہلے[۸] چنڈول اور سکھپال۔ موتی محل کے برابر آ لگے۔ شاہزادہ ولیعہد بہادر بھی باہر نکل آئے۔ وگلہ پلٹن کے سپاہیوں نے راستے بند کئے۔ ترکنوں اور گرجنوں نے قناتیں کھینچیں۔ جو بیگم یا شہزادی باہر آتیں، اُن کو بلحاظ اُن کے درجہ

---

۱ اُس زمانہ میں بیگمات اور شہزادیوں کی مصاحبوں کو خواص کہتے تھے۔ درجہ میں یہ مغلانیوں سے بڑی ہوتی تھیں۔

۲ زر خرید لونڈیاں سرتیں کہلاتی تھیں۔ سریہ عربی میں لونڈی کو کہتے ہیں۔

۳ و ۴ بہارکسوں اور بہلیوں کے سامنے بانس باندھکر ادوسوت کا جال بنا کر جو جگہ نکال لیتے ہیں اس کو سانگی اور اسی طرح پیچھے گھانس وغیرہ بھرتے کو جو جھولی سی بنا لیتے ہیں اس کو ماچی کہتے ہیں۔

۵ ۶ ۷ اور ۸ آدھی پالکی کو نیمہ کہتے ہیں اس میں صرف ایک آدمی بیٹھ سکتا ہے اس سے بڑی میانہ چوپہلے بھی پالکی کی وضع کے ہوتے ہیں۔ مگر ان کی شکل بجائے مستطیل کے چوکور ہوتی ہے۔

کی سواری ہلتی۔ ہر سواری کے ساتھ ایک قلماقنی اور ایک اردابیگنی مقرر ہو جاتی۔ تین ساڑھے تین بجے ہوں گے کہ پہلی رتھ روانہ ہوئی۔ آگے آگے رتھیں۔ اُن کے پیچھے دوسری سواریاں۔ سب کے آخر میں نواب زینت محل کا سکھپال۔ لاہوری دروازہ پر سواری پہونچی تھی کہ کپتان ڈگلس قلعدار نے اُتر کر سلامی دی۔ دروازہ کے باہر سے تلنگہ پلٹن کا ایک پرا آگے ہو لیا اور ایک پیچھے۔ شہزادیوں کی سواری کے ادھر اُدھر قلماقنیاں مردانہ لباس پہنے کھڑکی دار پگڑیاں باندھے، ساتوں ہتیار سجائے ساتھ ہوئیں۔ بیگمات کی سواریوں کو ترکنوں کی پلٹنوں نے بیچ میں لیا۔ ان کا بھی مردانہ فوجی لباس۔ گورے گورے چہرے۔ شانوں پر کاکلیں پڑی ہوئیں۔ سر پر چھوٹا سا عمامہ۔ اس میں سفید پروں کی اونچی کلغی۔ ہاتھ میں چھوٹی چھوٹی برچھیاں۔ پشت پر ترکش۔ شانہ پر کمان۔ پہلو میں تلوار۔ ڈاب میں پیش قبض۔ بس یہ معلوم ہوتا تھا کہ ترکوں کی فوج دلی میں گھس آئی ہے۔ نواب زینت محل[1] کی سواری کا بڑا ٹھاٹ تھا۔ آگے آگے دو حبشنیں گھونگر والے بال۔ اُن پر سرخ پگڑیاں۔ پگڑیوں میں سفید بقیش کے پھندنے۔ موٹے موٹے ہونٹ۔ لال لال دیدے۔ سُرخ گورنٹ کے ڈھیلے ڈھالے کوٹ۔ گھوڑوں پر سوار۔ ہاتھوں میں پتلی پتلی چوبیں۔ سامنے گھوڑوں کی پشت پر زربفت سے منڈھے ہوئے ڈنکے۔ ایک چوب مارتی۔ دوسری پکارتی "ادب سے نگاہ روبرو۔ حضرت بادشاہ بیگم سلامت"۔ سکھپال کے دونوں طرف دو دو گرجنیں۔ ایک کے ہاتھ میں

---

[1] نواب زینت محل خاندان شاہی سے نہ تھیں نواب علی قلی خاں کے خاندان میں نواب شمشیر الدولہ کی لڑکی سے بادشاہ نے بڑھاپے میں شادی کی تھی۔ خدا کی قدرت سے اولاد ہوئی۔ جواں بخت نام رکھا گیا۔ انہی کی ولیعہدی کے جھگڑوں نے قلعہ میں تفرقہ ڈالا۔ بیگم کی محبت میں بادشاہ ایسے گرفتار تھے کہ جو وہ چاہتیں بلا چون و چرا کرتے۔ آخر انہی حماقتوں نے رنگون پہونچا دیا۔ یہ بیگم جب نکلتیں ڈنکا ان کے ساتھ ہوتا۔ اسی لئے ان کو ڈنکے والی کہا جاتا تھا۔ قلعہ میں کم رہتی تھیں۔ لال کنوئیں پر نیا محل بنوایا تھا۔ غدر کے بعد وہ محل پٹیالہ والوں کو ملا۔ اب وہ بھی ٹھکانے لگ گیا۔

مورچھل دوسرے کے ہاتھ میں چنور، ہر ہر قدم پر بسم اللہ بسم اللہ کہتی چلی آتی تھیں سب سے پیچھے اردا بیگنیوں کی پلٹنیں۔ مردانہ لباس پہنے ہتھیار لگائے انکی بھی ساتھ ساتھ تھیں۔ تھوڑے تھوڑے فاصلہ پر مشعلچیں، کسی کے ہاتھ میں مشعل اور کسی کسی کے ہاتھ میں دوشاخہ کسی کے ہاتھ میں پنج شاخہ سواری کے ساتھ آہستہ آہستہ بڑھ رہی تھیں۔ یہ جلوس دلی دروازہ تک تو اسی سلسلہ سے گیا۔ دروازہ کے باہر نکل کر رتھیں تو ترکمان دروازہ کی طرف سے ہوتی ہوئی قطب کی سڑک پر پڑلیں اور دوسری سواریاں دروازہ کے باہر ہی ٹھیر گئیں۔

کوئی چار بجے ہوں گے کہ بادشاہ سلامت بیدار ہوئے۔ حوائج ضروری سے فارغ ہو کر، گرڈ[1] کا شربت پی کر معدہ صاف کیا۔ خاصاں نے یاقوتی کی سربمہر پیالی پیش کی۔ مہر توڑ کر یاقوتی نوش جان کی اور فرمایا "اماں سب لوگ سدھارے" عرض کی "جہاں پناہ کے اقبال سے سب انتظام ہو گیا، میر تزک[2] حاضر ہیں۔ کیا ارشاد ہوتا ہے۔" فرمایا "اچھا بسم اللہ کرو۔" حکم ہونا تھا کہ نکل ہو گیا۔ ولیعہد بہادر کے لئے تام جھام۔ مرزا شاہ رُخ کے لئے تخت رواں۔ مرزا فخرو کے لئے بوچہ اور خود بادشاہ سلامت کے لئے ہوادار، دیوان خاص میں آگیا۔ باقی سب شاہزادے اور سلاطین زادے گھوڑوں پر سوار ہوئے۔ ادھر بادشاہ سلامت نے باہر نکل ہوادار میں قدم رکھا اور چوبدار نے آواز لگائی: ادب سے۔ تعظیم سے۔ مجرا بجا لاؤ حضرت

---

[1] بہادر شاہ مرحوم کا دستور تھا کہ صبح اٹھتے ہی گرڈ کا شربت پی کر جوں کا توں نکال دیتے تھے۔ اس طرح کل رطوبات فاسدہ خارج ہو کر معدہ صاف ہو جاتا۔

[2] قلعہ میں میر تزک کا بڑا درجہ تھا۔ دربار اور جلوس کا انتظام اور لوگوں کو باریاب کرنے کی خدمت انہی کے سپرد تھی۔ ایک یہ ہی شخص تھے جن کو دربار میں جریب لیکر کھڑے ہونے کی اجازت تھی۔ ذرا کسی نے آداب شاہی میں اونچ نیچ کی اور انھوں نے گھٹ سے جریب پاؤں پر ماری۔ یہ خدمت سعادت خاں رنگین کے خاندان میں مدت تک رہی۔

بادشاہ سلامت و شہزادوں نے تلوار میان سے نکال کر سلامی دی۔ دوسرے لوگ جھک کر آداب بجا لائے۔ بادشاہ سلامت کے بعد ولی عہد بہادر، مرزا شاہ رخ اور مرزا فخرو سوار ہوئے۔ ہوادار کے پیچھے ایک خواصی نے چتر شاہی کھولا دوسرے نے سورج مکھی لی اور یہ جلوس آہستہ آہستہ قلعہ کے دہلی دروازہ کی طرف چلا۔ دروازہ کے باہر پہلے سے فوج کی مثل بندھی ہوئی تھی۔ سب سے آگے نشان کا ہاتھی اس پر شاہی پرچم۔ اس کے پیچھے نقارہ کے اونٹ۔ اونٹوں کے بعد ترک سواروں[۱] کا رسالہ۔ رسالہ کے بعد روشن چوکی کے تخت بختوں کے پیچھے میر تزک۔ اس کے بعد سلاطین زادوں کی سواریاں۔ شہزادوں کے گھوڑے مرزا فخرو کا بوچہ۔ مرزا شاہ رخ کا تخت رواں۔ مرزا دارا بخت کا تام جھام۔ ان کے پیچھے دور باش[۲] اور دور باغ کے پیچھے بادشاہ سلامت کا ہوادار۔ ہوادار کے پیچھے فوج کا پرا آخر میں قلعہ کے نوکر چاکر، بہیر و بنگاہ۔ سڑک کے کنارے کنارے مشعلچیوں کی قطاریں۔ غرض قلعہ[۳] کے دلی دروازہ سے جو مثل بندھی تو پرانے کوٹلہ پر جا کر ختم ہوئی۔ سواری قلعہ کے دروازہ سے نکلی ہی تھی کہ شہدوں نے غل مچایا حضرت پیر و مرشد۔ ہمارا حق بھی مل جائے۔ خدا تعالیٰ عمر و اقبال میں ترقی کرے۔ آمین۔ اور صدوں سال یہ سایہ دلی والوں کے سروں پر قائم رکھے۔ آمین۔ خدا شہزادے شہزادیوں کو

---

[۱] دلی کی جو فوج انگریزی لباس اور انگریزی ہتھیاروں سے آراستہ تھی اُس کو ترک سوار کہتے تھے وجہ یہ تھی کہ اس زمانہ میں ترکوں کا بھی یہی فوجی لباس تھا۔

[۲] دور باش ایک خوبصورت رنگین پھریرہ ہوتا تھا جس پر برچھیاں لگی ہوتی تھیں۔ یہ سواری کے آگے آگے رہتا تھا کہ کوئی بادشاہ پر حملہ نہ کر بیٹھے۔

[۳] قلعہ کے دو دروازے ہیں۔ لاہوری دروازہ اور دلی دروازہ شہر پناہ کے دروازوں کے بھی یہی نام ہیں۔ لاہوری دروازہ کھاری باؤلی کے کنارہ پر تھا وہ زمین کے برابر کر دیا گیا۔ دلی دروازہ موجود ہے۔ فیض بازار کے سرے پر ہے اور اسی میں سے ہو کر پرانے قلعہ کو سڑک گئی ہے۔

سلامت رکھے۔ آمین سیر آ رہی ہے۔ کچھ ایسا ملے کہ ہم بھی جہاں پناہ کے صدقہ میں سیر کی بہار دیکھ لیں۔" بادشاہ سلامت نے اشارہ کیا۔ خواصی نے مٹھیاں بھر بھر کر روپئے ہوادار پر سے نچھاور کئے۔ پھر کیا تھا۔ روپوں کے ساتھ شہدے سڑک پر بچھ گئے۔ کسی نے ہاتھ پھیلائے کسی نے جھولی پھیلائی۔ سواری چلنی مشکل ہو گئی۔ تھوڑی دیر تک یہی ہنگامہ رہا۔ جب دل بھر کر روپیہ لوٹ چکے۔ تو شہدے دعائیں دیتے رخصت ہوئے اور ہوادار آگے بڑھا۔ لوگوں کو پہلے ہی سے خبر ہو گئی تھی۔ کہ آج پچھلی رات کو سواری مبارک، قطب جائے گی۔ رات کے بارہ ہی بجے سے خاص بازار سے لگا فیض بازار اور شہر کے دلی دروازہ تک خلقت کا ہجوم تھا بازاروں میں آدمیوں کے ٹھٹ کے ٹھٹ لگے تھے۔ چھتوں اور کمروں پر ہزاروں عورتیں بیٹھی جلوس کا انتظار کر رہی تھیں۔ ہر شخص اپنے بادشاہ کو دیکھنے کے لئے بے چین تھا۔ وقت کم تھا اس لئے بازاروں میں آئینہ بندی تو نہیں ہوئی تھی۔ ہاں بعض بعض مکانوں کے دروازے۔ کمروں کے روکار اور دوکانیں سجا کر روشنی کر دی تھی۔ جلوس آہستہ آہستہ ان سڑکوں پر سے گزرا۔ ایک سناٹے کا عالم تھا۔ مگر ہر شخص کے بشرہ اور آنکھوں سے جوش ٹپک رہا تھا۔ بادشاہ سلامت بھی اس جوش سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے۔ ایک پھریری سی آئی اور آنکھوں سے خود بخود آنسو نکل کر رخساروں پر بہہ آئے۔ کیا خبر تھی کہ نو برس نہ گزریں گے کہ اسی سڑک پر سے گزرنا ہوگا۔ مگر کس حالت میں کہ سڑک ویران ہوگی۔ دلی والے تباہ ہو گئے۔ گولوں کی مار سے مکانات مسمار ہو گئے۔ اور بے گناہوں کے خون سے زمین رنگین ہوگی۔ اس کے چند ہی دنوں بعد اسی سڑک سے پھر شہر میں داخل ہونا ہوگا مگر کس حالت میں کہ خود قید ہوں گے۔ چاروں طرف جنگی پہرہ ہوگا۔ بیٹیوں بھانجوں اور بھتیجوں کی لاشیں میدانوں میں بے گور و کفن پڑی ہوں گی مجل

ویران ہوں گے اور محل والیاں خدا جانے کہاں ہوں گی اور کس حالت میں ہوں گی
غرض، سواری مبارک ان سڑکوں پر سے گزر کر دلی دروازہ پہونچی۔ محافظوں نے سلامی دی اور جلوس سلطان جی[1] کی سڑک پڑ لیا۔ جو زنانہ سواریاں پہلے سے روانہ ہوکر یہاں ٹھیری ہوئی تھیں وہ بھی جلوس کے آخر میں شریک ہوگئیں کہاروں نے یہاں سے ذرا قدم تیز کر دئیے۔ اور سورج نکلنے سے پہلے پہلے سواری پرانے قلعہ پہونچ گئی۔ شیر شاہ کی مسجد کے سامنے ہوادار رکھا گیا۔ بادشاہ سلامت نے مسجد میں نماز پڑھی، وظیفہ پڑھا۔ کوئی گھنٹہ آدھ گھنٹہ قیام کر کے یہاں سے سواری بڑھی اور ابھی دن پوری طرح نہ نکلا تھا کہ ہمایوں کا مقبرہ پہنچ گئی۔ مقبرہ میں پردہ ہوگیا۔ سواریاں اُتریں۔ باہر کے دروازہ سے بادشاہ سلامت کا ہوادار کہاریوں نے سنبھال لیا۔ اور مقبرہ کے دروازہ پر جا لگایا۔ سامنے کے صحن میں پہلے سے فرش ہوگیا تھا۔ مسند بچھی ہوئی تھی بادشاہ سلامت مسند پر جا بیٹھے وظیفہ ختم کیا مقبرہ کے اندر گئے۔ خاندان شاہی کے سیکڑوں لوگ اس مقبرہ کے تہہ خانوں میں موت کی میٹھی نیند سو رہے ہیں۔ ہر ایک کی قبر پر جا کر فاتحہ پڑھی۔ شاہ زادے ساتھ تھے۔ سب کو ایک ایک قبر دکھاتے۔ نام بتاتے اُن کے کارنامے سُناتے۔ اپنی اور ان کی حالت کا مقابلہ کرتے اور بے اختیار روتے[2] فاتحہ سے فارغ ہوکر پھر ہوادار میں سوار ہوئے۔ اور جس ترتیب سے یہ قافلہ آیا تھا اُسی ترتیب سے آگے بڑھا درگاہ شریف قریب ہی ہے۔ تھوڑی دیر میں وہاں پہونچ گئے۔ دلی والوں کو خاص اس درگاہ سے جو عقیدت ہے وہ بیان نہیں ہوسکتی کسی قوم اور کسی ملت کا آدمی نہیں

---

[1] حضرت سلطان المشائخ خواجہ نظام الدین اولیا، محبوب الٰہی رحمۃ اللہ علیہ کو دلی والے سلطان جی کہتے ہیں۔ ان کا مزار مبارک دلی دروازہ سے ۳ میل پر ہمایوں کے مقبرہ کے بالکل سامنے ہے۔

[2] آخر میں بہادر شاہ مرحوم کا دل ایسا رقیق ہوگیا تھا کہ بات بات پر آنسو نکل آتے تھے۔

جو اس چوکھٹ پر سر نہ جھکاتا ہو۔ اور کوئی بدنصیب ہی ہوگا جو یہاں سے نامراد جاتا ہو۔ پردہ کا انتظام پہلے سے ہوگیا تھا۔ ہوادار باولی پر رکھا گیا۔ بادشاہ سلامت نے اُتر کر وضو کیا۔ شہزادوں نے ہاتھ مُنہ دھویا۔ شہزادیوں کے لئے باولی کے طاقوں کے سامنے اوٹ لگ گئے تھے۔ کسی نے وضو کیا۔ کسی نے غسل کیا۔ کوئی پانی میں پاؤں لٹکائے بیٹھی رہی۔ بادشاہ سلامت وضو کرکے ہوادار میں آ بیٹھے۔ اردابیگنی نے عرض کی "جہاں پناہ۔ باولی میں تیرنے کے لئے خادموں کے لڑکے آئے ہیں کیا حکم ہوتا ہے" فرمایا "ہاں۔ اماں۔ ہاں۔ بلاؤ۔ وہ حق دار ہیں اپنا حق لینے آئے ہیں۔ کیوں نہ ملے گا۔ ضرور ملے گا" حکم ہونا تھا کہ سات سات آٹھ آٹھ برس کے بیس پچیس لڑکے اندر آئے۔ مجرا بجالائے۔ اجازت چاہی اور گنبد پر چڑھ گئے سیڑھیوں پر سے بیگمات اور شہزادیوں نے باولی میں روپیہ پھینکنے شروع کئے۔ ادھر روپیہ گرا اور اُدھر کوئی نہ کوئی لڑکا گنبد پر سے کودا۔ ڈبکی لگائی اور روپیہ نکال لایا۔ تھوڑی دیر تک یہی تماشہ ہوتا رہا۔ اس کے بعد سب کے سب درگاہ شریف میں گئے۔ پہلے حضرت امیر خسروؒ کے مزار پر فاتحہ پڑھی۔ وہاں سے حضرت سلطان جی کے مزار پر آئے۔ بادشاہ سلامت تو اندر چلے گئے۔ عورتوں نے گنبد شریف کے دروازہ پر کھڑے ہوکر فاتحہ پڑھی۔ کسی نے زنجیر پکڑ کر دعا مانگی۔ کسی نے چوکھٹ کی مٹی لے کر منہ پر ملی۔ کسی نے گود پھیلا کر دل ہی دل میں تلاوت شروع کی۔ کسی نے مسجد کے کٹورے کا قصہ شروع کیا۔ کہ دیکھنا بوا یہ کٹورہ سونے کا ہے۔ بڑا بھاری ہے۔ کئی سیر کا ہوگا۔ یہ سامنے جو تسبیح خانہ ہے اس میں بھی ایک ایسا ہی کٹورہ لٹکا ہوا تھا۔ دادا جان کے زمانہ میں ایک بڑھیا مصیبت کی ماری درگاہ شریف میں آئی اور عرض کی کہ یا حضرت۔ سات بیٹیاں ہیں۔ کھانے کو پیسہ پاس نہیں۔ یہ پہاڑ کیوں کر اُٹھیں گے۔ آپ ہی مشکل آسان کیجئے۔ وہاں سے اُٹھ، جو

تسبیح خانہ میں آئی تو کٹورہ گنبد سے اُتر اس کی گود میں آگیا۔ خوشی خوشی گھر آئی، بڑی دھوم دھام سے بیٹیوں کی شادیاں رچائیں۔ مزے سے ہنسی خوشی رہنے لگی۔ دِلّی کے ایک امیر تھے اُن کو جو یہ خبر ہوئی تو انھوں نے بھی درگاہ شریف میں جا کر دعا مانگی۔ وہاں سے اس مسجد میں آئے۔ بڑی دیر تک کٹورے کو دیکھتے رہے کٹورہ جہاں تھا وہیں رہا جل گئے۔ مزدوروں کو بلوا، پاڑ باندھی جتنی پاڑ اونچی ہوتی۔ کٹورہ اور اونچا ہوتا جاتا۔ پاڑ گنبد کی چھت تک پہونچی تو کٹورہ غائب ہوگیا۔ ادھر پاڑ کھلی اور اُدھر کٹورہ اپنی جگہ آموجود ہوا۔ سچ ہے لالچ بُری بلا ہے۔ کٹورہ تو کیا ملتا پاڑ باندھنے کا خرچ مفت گلے پڑا۔

بادشاہ سلامت فاتحہ سے فارغ ہو۔ درگاہ شریف سے باہر آئے۔ محمد شاہ بادشاہ کے مزار مرزا جہانگیر[1]۔ مرزا نیلی[2]، اور جہاں آرا بیگم[3] کی قبروں پر گئے۔ فاتحہ پڑھی یہاں سے پھر پالولی پر آئے۔ خادموں کو انعام دیئے۔ فقیروں کو خیرات تقسیم کی۔ اور وہاں سے نکل منصور کے مقبرہ کی سیدھی سڑک پر ہو لئے۔ یہاں دو ڈھائی گھنٹہ آرام کیا۔ خاصہ تناول فرمایا۔ کوئی چار بجے یہاں سے روانہ ہو۔ شام ہوتے ہوتے قطب پہنچ گئے۔ جنگلی محل اور مرزا بابر[4] کی کوٹھی پہلے سے آراستہ تھی۔ جو

---

[1] مرزا جہانگیر وہی شہزادے ہیں جن کی وجہ سے پھول والوں کی سیر قائم ہوئی۔ واپس آنے کے بعد انھوں نے پھر بے اعتدالیاں کیں پھر الہ آباد بھیج دیئے گئے اور وہیں اُن کا انتقال ہوگیا۔ نواب ممتاز محل نے اُن کی لاش الہ آباد سے دلی منگوائی اور سلطان جی میں ایک نہایت خوبصورت سنگ مرمر کا محجر بنوا دفن کر دیا۔

[2] مرزا نیلی شاہ عالم ثانی کے منجھلے بیٹے تھے۔ انتقال کے بعد اُن کو بھی مرزا جہانگیر کے محجر میں دفن کیا گیا۔

[3] جہاں آرا بیگم شاہجہاں بادشاہ غازی کی بیٹی تھیں۔ حضرت سلطان المشائخ سے بڑی عقیدت تھی اُن کا مزار درگاہ کے پائینتی ایک سنگ مرمر کے محجر میں ہے۔ سرہانے کتبہ لگا ہوا ہے۔ کتبہ کا یہ شعر بڑا دردناک ہے۔

بغیر سبزہ نپوشد کسے مزار مرا کہ قبر پوش غریباں ہمیں گیاہ بس است

[4] مرزا بابر اکبر شاہ ثانی کے بیٹے تھے۔ اُن کی ایک بڑی کوٹھی انگریزی وضع کی ابتک قطب میں موجود ہے اُس کا ایک دروازہ تو درگاہ شریف میں ہے دوسرا جنگلی محل میں اور تیسرا جنگل میں جھرنے کی طرف نکلتا ہے۔

سواریاں سیدھی قطب آئی تھیں، اُنھوں نے سب سامان قرینہ سے جما دیا تھا۔ خاصہ تیار تھا۔ دن بھر کے سب تھکے ماندے تھے۔ کھا پی، نماز پڑھ، ایسے سوئے کہ جب چار بجے کی نوبت بجی اُس وقت کہیں جا کر آنکھ کھلی۔

جنگلی محل اب تو واقعی جنگلی محل ہے۔ ہاں کسی زمانہ میں بڑا عندار محل تھا پہلے ہی کچھ کم پرانا نہ تھا۔ بہادر شاہ نے دیوان خاص۔ دیوان عام۔ خاص محل اور باب ظفر بنوا کر اس کو اور بڑا کر دیا۔ دروازہ کیا ہے خود ایک چھوٹا سا محل ہے۔ سرتاپا سنگ سُرخ کا ہے۔ رنگکار پر سنگ مرمر کی پٹیاں۔ حاشیہ اور پھول دے کر اس کی رونق کو اور بھی دوبالا کر دیا ہے۔ دروازہ کی بلندی کوئی ۱۶-۱۷ گز ہے۔ پہلو میں ۱۷ سیڑھیوں کا چکردار زینہ ہے۔ محراب کے عین اوپر شاہی بارہ دری ہے۔ یہیں سے بیٹھ کر بادشاہ سلامت اور بیگمات پنکھوں کا تماشہ دیکھتے تھے۔ دروازہ سے ملا ہوا، درگاہ شریف کا دروازہ ہے۔ جھرنے سے پنکھے اُٹھ کر ادھر آتے۔ پہلے دن جوگ مایا جی کا پنکھا اُٹھتا دوسرے دن درگاہ شریف کا۔ درگاہ شریف کا پنکھا تو برابر والے دروازہ سے مزار شریف پر چلا جاتا۔ جوگ مایا جی کا پنکھا شاہی دروازہ کے سامنے کچھ دیر رُکتا۔ اس کے بعد حکیم احسن اللہ خاں کے مکان کے سامنے سے ہوتا ہوا، مندر چلا جاتا۔ باب ظفر کے اندر کا حصہ دیکھنے کے قابل ہے۔ بڑے پھاٹک سے لگا کر اندر محل تک سات ڈیوڑھیاں ہیں۔ پھر ہر ڈیوڑھی پر پہرہ داروں کے لئے سہ دریاں بنی ہوئی ہیں۔ پھاٹک پر تو وِلگہ پلٹن کا پہرہ تھا۔ اندر کی ڈیوڑھیوں پر ترکنوں[1]، قلماقنیوں[2]۔ اردا بیگنیوں[3]۔ شدلوں[4]۔ اور گرجنوں[5] کی نشست ہوتی[6]۔ بھلا

---

[1] آخر زمانہ میں ترکستان، حبش اور گرجستان سے عورتوں کی آمد ہو گئی تھی۔ پہلے سے جو خاندان دلی میں بس گئے تھے انھیں میں سے یہ پلٹنیں بھری جاتیں۔ لباس ان سب کا مردوں کا سا ہوتا تھا۔ یہ سب مردانہ کرتب جانتی تھیں ان کا کام تماشہ میں پہرہ دینا تھا۔

[2] قلماقنیاں پہرہ دینے اور حکم احکام پہونچانے پر مقرر تھیں۔ (باقی صفحہ ۲۰ پر ملاحظہ ہو)

کیا مجال کہ محل میں پرندہ تو پر مار جائے۔ پھاٹک سے گھستے ہی اُلٹی طرف، پہلی ڈیوڑھی کے پاس سے زنانہ کو راستہ جاتا تھا۔ غرض اس محل میں اتنی گنجائش تھی کہ سارا قلعہ اس میں سما جاتا۔ اور پھر بھی جگہ رہتی۔ اب مردانے اور زنانے سب مکانات ٹوٹ پھوٹ کر برابر ہو گئے۔ ایک باب ظفر رہ گیا ہے۔ اسی سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ جس محل کا یہ دروازہ ہے وہ محل کیا ہو گا۔ بادشاہ کی کہی ہوئی تاریخ دروازہ کی روکار پر کندہ ہے۔

ایں درِ عالی چو شد مکرم بنا حسب المراد
گفت دِل، سالِ بنا، بابِ ظفر پاینده باد

سنہ ۱۱ جلوس ۱۲۶۴ھ

زمانہ کے ہاتھوں اس دروازہ کا بھی وہی حشر ہوتا جو اندر کے محلوں کا ہوا وہ تو کہو محکمۂ آثارِ قدیمہ نے اس کو اپنی نگرانی میں لے کر سنبھال لیا ہے۔

خیر، تو صبح کی نوبت بجی ہی تھی کہ محل میں چہل پہل شروع ہوئی۔ منہ ہاتھ دھو کپڑے بدل، نماز پڑھ، ناشتہ کر، سب شہزادے شہزادیاں، بادشاہ سلامت کے سلام کو آئیں۔ مطلب یہ تھا کہ چلئے۔ یہاں بیٹھنے تھوڑی ہی آئے ہیں۔ جہاں پناہ بھی وظیفہ سے فارغ ہو کر بیٹھے تھے۔ سب کا سلام لیا۔ دعائیں دیں ان سب کا

(بقیہ صفحہ گزشتہ) اُن کے لباس کا ذکر اوپر آ چکا ہے ان عورتوں کو شادی کرنا ممنوع تھا۔

۵۳ اردابیگنیاں بھی محل کا انتظام کرتیں اور شاہی حکم احکام پہنچاتی تھیں۔ ان کا صرف مردانہ لباس ہی نہیں ہوتا تھا بلکہ نام بھی مردوں کے سے ہوتے تھے۔ گفتگو بھی مردوں کی طرح کھری کھری زبان میں کرتی تھیں۔ تھیں تو عورتیں مگر شکل و صورت وضع قطع چال ڈھال سے بالکل مرد معلوم ہوتی تھیں۔ دلّی میں اُن کو بڑدابیگنیاں کہتے تھے۔ پھر یہ لفظ اردو میں ایسی لڑکیوں کے لئے استعمال ہونے لگا جو بڑی شریر اور دنگئی ہوں۔ اور جن پر اکبر کا یہ شعر صادق آتا ہو۔ ؎

لڑکی وہ لڑکیوں میں جو کھیلے
نہ کہ لونڈوں میں جا کے ڈنڈ پیلے

مطلب سمجھ گئے۔ فرمایا "کہو، اماں، کہاں کا ارادہ ہے۔ جھرنے کا یا قطب صاحب کی لاٹھ کا" سب نے عرض کی "پیر و مرشد۔ پہلے جھرنے تشریف لے چلئے ابر آیا ہوا ہے اس وقت جھرنے پہ بہار ہوگی" فوراً اردا بیگنی کو پردا کرانے کا حکم دیا گیا۔ وگلہ پلٹن کے سپاہیوں نے ناکہ بندی کردی۔ اردا بیگنیوں، قلماقنیوں نے راستہ کا انتظام کیا رشد نہیں اور گر جنیں بیگمات اور شہزادیوں کے ہمراہ ہوئیں، ماماؤں، اصیلوں، خواصوں اور سرتیوں کا غول نکلا۔ اور سیدھا جھرنے کا رخ کیا۔ شہزادیوں نے پہلے درگاہ شریف میں حاضری دی۔ وہاں سے مرزا بابر کی کوٹھی میں سے ہو جنگل میں نکل گئیں۔ پہلے جہاز[1] پر جا کر ذرا دم لیا۔ شمسی تالاب کا لطف اٹھایا۔ میلوں تک پانی ہی پانی تھا۔ برجی[2] بیچ میں آگئی تھی۔ پانی کا یہ عالم دیکھ کے بہتوں کے جی میں آیا کہ کود پڑیں۔ پھر خیال آیا کہ بادشاہ سلامت سے اجازت لئے بغیر پانی میں اترنا ٹھیک نہیں چپکی ہو رہیں۔ تھوڑی دیر یہاں ٹھیر کر سب کے سب اولیا مسجد[3] پہونچے مصلّوں پہ نفل پڑھی۔ اتنے میں بادشاہ سلامت کی سواری بھی آگئی۔ شہزادے ساتھ تھے۔ آگے آگے سواری چلی پیچھے پیچھے عورتوں کا یہ غول روانہ ہوا۔ اولیا مسجد سے جھرنا دور ہی کتنا ہے۔ تھوڑی دیر میں سب کے سب وہاں پہونچ گئے۔

---

[1] شمسی تالاب کے کنارے جہاز کی شکل کی ایک بہت بڑی اور خوبصورت عمارت قدیم زمانہ کی بنی ہوئی ہے اس عمارت کو جہاز کہتے ہیں۔

[2] اسی تالاب کے بیچ میں ایک چھوٹا سا کھلا ہوا برج ہے اور برج کے نیچے ایک سنگ خارا پر گھوڑے کے سم کا نشان ہے اس سم کے متعلق عجیب روایتیں مشہور ہیں عام طور سے اس کو براق کا سم کہتے ہیں کنارے سے برجی اتنی دور ہے کہ وہاں تک جاتے جاتے اچھے اچھے تیراکوں کے دم ٹوٹ جاتے ہیں۔

[3] یہ ایک چھوٹی سی مسجد شمسی تالاب کے کنارے پر ہے صحن میں دو مصلّے ہیں۔ کہتے ہیں ان مصلّوں پر حضرت خواجہ معین الدین اجمیریؒ اور حضرت خواجہ قطب الدین بختیار کاکی رحمتہ اللہ علیہما نماز پڑھا کرتے تھے۔

جس نے پہلے زمانہ کا جھرنا نہیں دیکھا اس نے دلّی میں کچھ خاک نہیں دیکھا۔ معلوم ہوتا تھا کہ کسی نے بہشت کا ایک کونہ کاٹ کر مہرولی[1] میں جوڑ دیا ہے۔ خدا کی قدرت دیکھو کہ یہ بنا کس لئے تھا اور ہو گیا کیا۔ فیروز شاہ تغلق نے شمسی تالاب کا بند باندھ۔ اس کا پانی نوکھی نالہ میں ڈالا تھا۔ اور اس نالہ کو تغلق آباد کے نالوں سے ملا دیا تھا، تاکہ قلعہ میں پانی کی قلت نہ ہو۔ تغلق آباد ویران ہو گیا۔ نالہ ٹوٹ گیا۔ تالاب کا پانی جنگل میں بہنے لگا۔ یہ دیکھ کر سنہ ۱۷۰۰ع میں نواب غازی الدین[2] فیروز جنگ بہادر نے شمسی تالاب کے بند کے سامنے حوض بنوائے۔ نہریں نکالیں فوارے لگائے اور اس ٹکڑے کو بہشت کا نمونہ کر دیا۔ رفتہ رفتہ یہاں بارہ دریاں دالان، اور مکانات بن گئے۔ چار دیواری کھنچ گئی۔ درخت بڑھ کر جھرنے پر چھتر ہو گئے اور تھوڑے دنوں میں یہ جگہ کچھ سے کچھ ہو گئی۔ بند سے سوتوں کی شکل میں پانی جھر جھر کر یہاں آتا تھا۔ اسی لئے اس مقام کا نام جھرنا ہو گیا۔ بند سے ملا ہوا جو سہ درہ دالان ہے وہی جھرنے کی جان ہے۔ دالان کی چھت اندر سے کھوکھلی ہے۔ بند کا پانی پہلے چھت میں آتا ہے۔ چھت میں درزیں چھوڑ دی ہیں۔ درزوں میں سے پانی اس طرح گرتا ہے گویا دالان میں مینھ برس رہا ہے۔ دالان کے سامنے کی جو دیوار ہے اُس میں چراغ رکھنے کے لئے سیکڑوں طاق بنے ہوئے ہیں۔ چراغوں کے سامنے پانی کی چادر گرتی ہے۔ بس یہ معلوم ہوتا ہے کہ کسی نے یا تو پانی میں آگ لگا دی ہے یا سونا پگھل پگھل کر برس رہا ہے۔ چھت کی منڈیر

---

[1] مہرولی ہی کو قطب کہتے ہیں یہ دلی سے گیارہ میل پر ایک چھوٹا سا گاؤں ہے۔ محمد شاہ بادشاہ کے زمانہ میں یہاں خاصی رونق ہوتی تھی۔ وہ قطب کے عاشق تھے۔ جہاں ذرا ابر آیا اور ان کی سواری قطب چلی۔ کہا کرتے تھے کہ ابر بہارے قطب جانے کا نقیب ہے۔

[2] نواب غازی الدین فیروز جنگ شاہان دہلی کے وزیر اور آصف جاہ اول کے فرزند تھے یہ وہ غازی الدین فیروز جنگ نہیں ہیں۔ جنھوں نے عالمگیر شاہ ثانی کو کوٹلہ میں شہید کرایا تھا۔

کے نیچے ۳ پرنالے ہیں پرنالوں ہیں سے ہوکر پانی چھجہ پر آتا ہے۔ چھجہ کے نیچے ایک بڑا حوض ہے۔ پرنالوں کا پانی چھجہ پر پھیل کر اس زور سے حوض میں گرتا ہے گویا دھواں دھار بارش ہورہی ہے۔ حوض کے سامنے ۸ گز لمبی ۲ گز چوڑی اور گز بھر گہری ایک نہر ہے۔ حوض کا پانی اُبل کر اس نہر میں آتا ہے جہاں نہر ختم ہوئی ہے وہاں سلامی کے پتھر دے کر ایک چادر سی بنا دی ہے۔ اس سلامی کے پتھروں پر ایسی اچھی منبت کاری کی ہے کہ پانی کے بہنے سے چادر پر مچھلیاں سی تڑپتی معلوم ہوتی ہیں۔ اس چادر کے نیچے شمال اور جنوب سے دو نہروں کے پانی اور آن ملے ہیں۔ آگے چل کر یہ پانی پھر تین نہروں میں بٹ جاتا ہے۔ بڑی نہر تو بارہ دری کے منڈوے[1] کے نیچے سے چلی گئی ہے اور چھوٹی دونوں نہریں چکر کھا کر منڈوے کے دونوں طرف سے چار دیواری کے باہر نکل جاتی ہیں۔

محمد شاہ کے زمانہ سے لگا کر بہادر شاہ تک شاید ہی کوئی دلّی کا بادشاہ ہوگا جس نے جھرنہ میں کوئی عمارت نہ بنوائی ہو۔

خود محمد شاہ نے تو بڑی نہر کے اوپر بارہ دری کا منڈوا بنوایا۔ شاہ عالم ثانی نے جنوب کی طرف تیج درہ دالان نکالا۔ اکبر شاہ ثانی نے شمال کی جانب دوھرا دالان تعمیر کیا۔ بیچ میں جو جگہ رہی تھی اس میں بہادر شاہ نے سنگ سرخ کی بارہ دری بنوا کر جھرنہ کی عمارتوں کو مکمل کر دیا۔

جھرنہ کے قریب ہی دو چیزیں دیکھنے کے قابل ہیں۔ ایک "پھسلنا پتھر" دوسرے "امریاں"۔ پھسلنا پتھر محمد شاہ بادشاہ کی جدت پسند طبیعت کی یادگار ہے

---

[1] اس بارہ دری کی چھت نہیں ہے۔ بلکہ ٹٹیاں لگا کر پھولوں کی بیلیں چڑھا دی ہیں۔ پھول کھلنے سے ساری چھت ڈھک جاتی ہے۔

یہ پتھر کوئی سوا چھ گز لمبا اور ۲ ۱/۴ گز چوڑا ہے اور جھرنے کی مشرقی دیوار سے ملا کر اس کو ذرا جھکا ہوا گاڑ دیا ہے۔ یہ پتھر اس بلا کا چکنا ہے کہ ذرا کوئی بیٹھا اور پھسلا پھول والوں کی سیر میں لوگوں کا اس پر چڑھنا اور پھسلنا ایک تماشہ ہو جاتا ہے۔ اسی پتھر کے استعارہ سے ذوق نے یہ شعر کہا ہے۔

میں کہاں سنگ در یار سے ٹل جاؤں گا
کیا وہ پتھر ہے پھسلنا کہ پھسل جاؤں گا

بارہ دری کے منڈوے سے ملا ہوا جھرنے کا دوسرا دروازہ ہے اور اس کے باہر امریاں۔ آموں کے درخت تو ہر جگہ ہوتے ہیں مگر یہاں کے درختوں پر کچھ اور ہی بہار ہے۔ جھرنے کے پانی سے بارہ مہینے سرسبز رہتے ہیں اور اتنے گھنے ہو گئے ہیں کہ آسمان بھی مشکل سے نظر آتا ہے۔ ادھر ان کی سبزی ادھر نیچے گھانس کی سبزی۔ بس یہ معلوم ہوتا ہے کہ زمین اور آسمان سبز مخمل کے بن گئے ہیں۔ جھرنے میں چادروں کا گرنا۔ فواروں کا اچھلنا۔ پانی کا بہنا۔ اگر "جنت نگاہ" ہے تو امریوں میں موروں کی جھنگار۔ پپیہے کی پکار۔ اور کوئل کی کو کو "فردوس گوش" ہے۔ غرض جھرنا ایک عجیب چیز تھا کہ ہر موسم میں ایک نیا لطف دکھاتا تھا۔ اور ہر شخص کو نئی لذت بخشتا تھا۔ اب اس کی کبھی بہار گئی شمسی تالاب کٹ چھنٹ کر حوض بن گیا۔ بند اس سے دو بجا پڑا۔ پانی کا رسنا موقوف ہوا۔ نہریں خشک ہو گئیں۔ حوض ملبہ سے اٹ گئے درخت سوکھ ساکھ کر کٹ گئے۔ پھسلنا پتھر ٹوٹ کر ٹکڑے ٹکڑے ہو گیا۔ ہاں عمارتیں کھڑی رہ گئی ہیں۔ کچھ دنوں میں ان کا بھی وقت آ لگے گا۔ اس کے بعد جھرنے اور امریوں کا بس نام ہی نام رہ جائے گا۔

سچ ہے ؎ ہمیشہ رہے نام اللہ کا

تو۔ ہاں بادشاہ سلامت کے جھرنے پہنچتے ہی قلماقنیوں نے شاہی پنگورا کھڑا کر اس میں مسند بچھا دی۔ ہوا دار پنگورے کے پاس جا لگا۔ بادشاہ اتر اس میں جلبیٹھے

دو خواصیں مور چھل لے پیچھے جا کھڑی ہوئیں۔ دو نے آہستہ آہستہ ہنگورے کو ہلانا شروع کیا۔ تھوڑی دیر آرام لینے کے بعد بادشاہ سلامت نے فرمایا "کہو اماں۔ کیا ارادہ ہے۔ اب تیرنا[1] ہوتا ہے یا جھولا جھولنا"؟

"اچھا کچھ جھرنے میں رہو کچھ امریوں میں چلو۔ یہاں کا بھی لطف اُٹھاؤ۔ وہاں کا بھی مزہ دیکھ لو۔ ہم تو امریوں میں جاتے ہیں۔" یہ کہہ بادشاہ اُٹھ کھڑے ہوئے، اور ٹہلتے ٹہلتے بارہ دری کے دروازہ سے امریوں میں آ گئے۔ یہاں پہلے سے انتظام ہو گیا تھا۔ ایک طرف بادشاہ سلامت اور بادشاہ بیگم کے تخت بچھ گئے تھے۔ دوسری طرف شہزادیوں کے لئے دری۔ چاندنی اور قالینوں کے فرش کر کے تکیے لگا دیئے گئے تھے۔ درختوں میں بیسیوں جھولے پڑ گئے تھے۔ پہلے بادشاہ سلامت تخت پر بیٹھے۔ اس کے بعد سب سلام کر کے اپنی اپنی جگہ بیٹھ گئے۔ انتظار تھا کہ کب حکم ہو اور کب جھولوں پر جائیں۔ بادشاہ نے فرمایا "واہ۔ جی۔ واہ خالی جھولا کیسا۔ کڑھائی چڑھاؤ۔ جھولتے جاؤ۔ کھاتے جاؤ۔" تاج[2] محل نے عرض کی "جہاں پناہ۔ ہم پہلے ہی سے یہ انتظام کر کے آئے ہیں۔ حکم کی دیر ہے۔ ابھی سب کچھ ہوئے جاتا ہے۔" یہ کہہ لونڈیوں کی طرف دیکھا۔ وہ تو حکم کی منتظر ہی کھڑی تھیں۔ ذرا سی دیر میں بیسیوں کڑھائیاں آ گئیں۔

---

[1] قلعہ میں شہزادے اور شہزادیاں دونوں کو مردانہ فن سکھائے جاتے تھے۔ شاذ ہی کوئی ہوگا جس کو تیر، تلوار، بندوق چلانا، سوار ہونا۔ اور تیرنا نہ آتا ہو۔ بابر بادشاہ کے زمانہ سے یہ خاندان پانی کا عاشق ہے۔ قلعہ ہی کو دیکھ لو آدھا قلعہ نہروں اور حوضوں نے گھیر لیا ہے۔

[2] نواب تاج محل کا قلعہ میں بڑا زور تھا۔ تھی تو ڈومنی مگر جب سے بادشاہ نے اُس کو محل میں داخل کیا تھا اس وقت سے بادشاہ اُس کی مٹھی میں آ گئے تھے۔ بغیر اس کے حکم کے قلعہ میں پتہ تک نہیں ہل سکتا تھا۔ آخر نواب زینت محل نے اس کا کفر توڑا۔ قلعہ سے نکالی گئی اور ایسی نکالی گئی کہ پھر قلعہ کی صورت دیکھنا نصیب نہ ہوئی۔

درختوں کی جڑوں میں چولھے لگ گئے۔ کسی کسی بیگم کے سامنے انگھی آ گئی۔ اب ہے کہ کوئی تو بیٹھا بیسن پھینٹ رہا ہے۔ کوئی گلگلوں کے آٹے میں کھانڈ ملا رہا ہے۔ کوئی سہال، اور اندرسے تلنے کی تیاری کر رہا ہے۔ کوئی اندرسہ کی گولیوں کا سامان نکال رہا ہے۔ کوئی چھاج پر کھجوریں بنا رہا ہے۔ غرض تھوڑی دیر میں خاصہ بازار سا لگ گیا جب سامان سے لیس ہو گئے تو ایک نے بڑھ کر بادشاہ سلامت سے عرض کی کہ "حکم ہو تو کڑھائی میں گلگلہ پڑے۔" فرمایا "نہیں۔ اماں۔ ابھی نہیں۔ جھولوں پر لوگ بیٹھ لیں اُس وقت پکوان شروع ہو۔" یہ کہہ نواب زینت محل اور نواب تاج محل کی طرف دیکھا۔ وہ دونوں کھڑی ہو گئیں۔ تاج محل تو ایسی خوبصورت نہ تھی، ہاں۔ زینت محل کی کچھ نہ پوچھو۔ عجب قبول صورت پائی تھی۔ شہر بھر میں ایک تھیں۔ ان کی جامہ زیبی اور حسن کی تعریف ہی سن کر بادشاہ نے ان سے شادی کی تھی۔ رنگت ایسی سُرخ وسفید تھی جیسے گلاب کی پتی۔ یا شہاب اور میدہ۔ کتابی چہرہ۔ بڑی بڑی روشن آنکھیں۔ لمبی ستواں ناک۔ ہاں بھویں بالکل نہ تھیں۔ اِس کمی کو سرمہ کی بھویں بنا کر پورا کیا جاتا۔ ہاتھوں میں دھانی چوڑیاں۔ سر پر تاروں بھرا گلنار دوپٹہ۔ جسم پر سُرخ انگیا کرتی۔ بادون کلی کا سبز زربفت کا پیجامہ۔ موتیوں جڑی گھیتلی جوتی۔ آنکھوں میں گہرا گہرا سُرمہ۔ دانتوں میں مسّی۔ ہونٹوں پر لاکھا۔ بس یہ معلوم ہوتا تھا کہ پرستان کی پری امریوں میں اُتر آئی ہے۔ زینت محل نے تاج محل کو ناک بھوں چڑھا کر دیکھا۔ تاج محل نے زینت محل کو بُرے بُرے دیدوں سے گھورا۔ حکم سے لاچار تھیں۔ بادشاہ سلامت کے سامنے جو جھولا تھا اس کے لال سبز ریشم کے رسے اور گنگا جمنی پیڑیاں تھیں دونوں اُٹھ، اس میں جا بیٹھیں۔ زینت محل نے پاؤں جوڑے۔ تاج محل نے جھونٹے لینے شروع کئے۔ بادشاہ سلامت نے فرمایا: "واہ، جی، واہ۔ ایسا سونا جھولا

ہم کو تو پسند نہیں۔ بی ٹر منھی خانم اور دلدار کو بلواؤ۔ بھلا بیگمات جھولیں اور یہ دونوں جھرنہ میں گھسی رہیں"۔ یہ سُنتے ہی دوار دا بیگنیاں۔ جا۔ دونوں کو جھرنہ میں سے پکڑ لائیں۔ دونوں بیچاریاں جھرنے میں نہا رہی تھیں۔ سارے کپڑے شور بور تھے۔ پہلے تو سامنے آتے ذرا جھجکیں مگر جب بادشاہ سلامت نے خود فرمایا۔ "آؤ۔ اماں۔ آؤ۔ قطب کی بہار یہی ہے"۔ تو اُس وقت ذرا ہمت بڑھی۔ کپڑے نچوڑتی ہوئی دونوں جھولے کے ادھر اُدھر کھڑی ہو گئیں۔ اور شہزادیاں بھی آواز ملانے آ گئیں۔ اِدھر اُنھوں نے ملار شروع کیا اور اُدھر کڑھائی میں گلگلہ پڑا۔ ٹر منھی خانم اور دلدار تو خیر رنڈیاں تھیں۔ تاج محل ڈومنی تھیں۔ مگر شہزادیوں کی آوازیں بھی رس میں کچھ کم نہ تھیں۔ محمد شاہ بادشاہ کے زمانہ سے شاید ہی کوئی محل والی ہوگی جو گانا نہ جانتی ہو۔ تان رس خاں اسی لئے نوکر تھے۔ تاج محل اسی لئے محل میں آئیں۔ بی ٹر منھی خانم اور دلدار کی اسی گانے سے بادشاہ کے حضور میں رسائی ہوئی۔ اب جھولے کے ساتھ گانا شروع ہوا۔

جھولا کِن ڈارو رے۔ امریاں جھولا کِن ڈارو رے۔ امریاں

رین اندھیری۔ تال کنارے۔ مرلا جھنگارے۔ بادل کارے۔ بوندیاں جھنیاں پھنیاں

جھولا کِن ڈارو رے۔ امریاں

دو سکھی جھولیں۔ دو ہی جھولائیں۔ چار مل گیاں بھول بھلیاں۔ جھولا کِن ڈارو رے امریاں

---

۱ ے ۵ میں نہیں جانتا کہ اس لفظ کی کیا املا ہے ٹر منھی کے معنی "ٹیڑھے منہ والی" ہے لقوے سے اس کا منہ ذرا پھر گیا تھا۔ جو املا میری سمجھ میں آیا میں نے لکھ دیا جو آپ کی سمجھ میں آئے وہ پڑھ لیجئے۔ ٹر منھی خانم غضب کی گانے والی تھی۔ تان رس خاں بھی اس سے ذرا کنیاتے تھے آخر اسی سے لڑ کر نکل گئے۔ بادشاہ کی غزلیں حضوری میں یہ ہی گاتی تھی۔ دلدار اس کی چھوٹی بہن تھی دونوں ڈیرہ دار رنڈیاں تھیں۔ بڑی بہن کی نواسی دونی جان اور چھوٹی بہن کی نواسی کالی جان دلی کی مشہور طوائفیں گزری ہیں۔

وہ لوز کے گلے۔ وہ رسیلی آوازیں وہ اونچی تانیں۔ وہ وقت کی راگنی وہ سہانا وقت۔ پتے پتے اور ٹہنی ٹہنی سے۔ جھولا کِن ڈار و۔ رے۔ امریاں کی آواز آرہی تھی۔ مور درختوں سے اُتر۔ جوش میں آ۔ سامنے ناچنے لگے۔ درختوں کے جانور چہکنے لگے۔ پپیے کی پیہو پیہو اور کوئل کی کوکو سے سارا جنگل گونج اُٹھا۔ غرض ایسا سما باندھا کہ ایک دفعہ ہی فراٹے سے مینھ کا چھینٹا آیا۔ لوگ اِدھر اُدھر بھاگنے لگے۔ بادشاہ سلامت نے فرمایا۔ "واہ۔ اماں۔ واہ۔ قطب میں مینھ سے بھاگتے ہو۔ بھادوں کا چھینٹا ہے ابھی برسا ابھی نکل گیا۔ ہاں بی دلدار کوئی اور چیز ہو جائے اور ہاں تم سب ایک ہی جھولے کو کیوں گھیرے کھڑے ہو۔ دوسرے جھولوں پر جاؤ۔ گاؤ بجاؤ۔ کھاؤ۔ پیو۔ کچھ لطف اُٹھاؤ۔" یہ سننا تھا کہ جھولوں کی طرف سب دوڑ پڑے۔ دو چار جھولوں پر تو بچوں نے قبضہ کر لیا جو باقی رہ گئے اُن پر شہزادیاں ہو بیٹھیں۔ جب ذرا یہاں چھیڑ ہوئی تو دلدار نے دوسری چیز شروع کی۔

"سنو سکھی سیاں جوگیا ہو گئے۔ سنو سکھی سیاں جوگیا ہو گئے۔ میں جوگن تیرے ساتھ
سنو سکھی سیاں جوگیا ہو گئے۔

جوگیا بجائے۔ بین بالنسری۔ جوگیا بجائے۔ بین بالنسری۔ جوگن گائے ہے ملار
سنو سکھی سیاں جوگیا ہو گئے۔

جوگیا نے چھائی جنگل جھونپڑی۔ جوگیا نے چھائی جنگل جھونپڑی۔ جوگن نے چھایا ہے بدیس
سنو سکھی سیاں جوگیا ہو گئے۔

جوگیا نے پہنے۔ لال لال کپڑے۔ جوگیا نے پہنے۔ لال لال کپڑے۔ جوگن کے لمبے کیس
سنو سکھی سیاں جوگیا ہو گئے۔"

اب کیا پوچھتے ہو گرم گرم پکوان آرہا ہے۔ کھا رہے ہیں۔ جھولا جھول رہے ہیں کوئی اندرسے کی گولیاں منہ میں دبائے ہے۔ کسی کے منہ میں سہال کا ٹکڑا ہے کسی کے حلق میں بیسن کی پھلکی پھنس گئی ہے۔ سانس رکا جاتا ہے۔ مگر ملار ہے کہ چل رہا ہے۔ مینھ برس کر نکل گیا تھا۔ پھر بھی پانی کی بوندیں درختوں میں سے ٹپ ٹپ گر رہی تھیں۔ ادھر بوند کڑاہی میں گری تیل اُڑا۔ اور اُدھر کسی نہ کسی کے منہ سے "اوئی" کی آواز نکلی۔ کسی کے ہاتھ پر چھینٹا پڑا۔ تو کسی کے منہ پر۔ کوئی تو "اوئی توبہ ہے" کہہ کر رہ گئی۔ کوئی کلہ سہلاتی اُٹھ کھڑی ہوئی۔ دوسرول نے پھر پکڑ یہ کہہ بٹھالیا کہ "واہ بوا۔ تو ج کوئی ایسا نازک بن جائے چھینٹا پڑتا ہی ہے۔ یوں کڑاہی چھوڑ کر کوئی نہیں اُٹھ کھڑا ہوتا۔"

بچوں کے جھولے پر کچھ اور ہی مزا تھا۔ پکوان کی سب سے زیادہ کھیت یہیں تھی۔ دو جھولے تو لڑکوں کے قبضہ میں تھے باقی پر لڑکیاں جھول رہی تھیں لڑکے تو جھولے میں کھڑے ہو۔ وہ لمبے لمبے پینگ بڑھا رہے تھے کہ خدا کی پناہ ہاں لڑکیاں جھولوں میں چھوٹی چھوٹی لال سبز پیڑیاں ڈالے۔ پاؤں جوڑے۔ جھول رہی تھیں۔ وہ بے سرا ملار چل رہا تھا کہ واہ جی واہ۔ کسی کی تان کدھر جاتی تھی۔ کسی کی کدھر۔ لڑائی بھی ہوتی جاتی تھی کہ "لو بوا بس اترو۔ بہت جھول چکیں۔ اب ہماری باری ہے"۔ لیکن گانے کا سلسلہ نہ ٹوٹتا تھا۔ گیت بھی بڑے مزے کا تھا۔ ذرا سنئے :-

اماں۔ آڑو جامن گھلے دھرے	اماں۔ میں نہیں کھاتی میری ماں
اماں۔ بتا پانی بھرا دھرا	اماں میں نہیں نہاتی میری ماں
اماں۔ دھانی جوڑا سلا دھرا	اماں۔ میں نہیں پہنتی میری ماں
اماں۔ بھائی بھاوج ملن کھڑے	اماں۔ میں نہیں ملتی میری ماں

غرض پھوپھا، پھوپھی سے لگا ماماؤں اور اناؤں تک سب ملنے کو کھڑے ہیں۔ مگر لڑکی کسی سے ملنے کا نام نہیں لیتی۔ آخر تان اس پر ٹوٹی تھی کہ :-

اماں۔ ساجن ڈولا لئے کھڑا ؛ اماں۔ میں نہیں جاتی میری ماں

یہاں تو یہ ہو رہا تھا۔ اور وہاں جھرنہ پر کچھ اور ہی بہار تھی۔ ادھر بادشاہ سلامت جھرنہ سے نکل، امریوں میں آئے اور اُدھر شاہزادیوں نے کواڑ بند کر۔ ڈھیلے پائجامے اُتار، تنگ پائجامے پہن۔ دھم سے جھرنہ میں غوطہ مارا، کوئی ڈبکیاں لگا رہی ہے۔ کوئی تیر رہی ہے۔ کوئی کمر کمر پانی میں کھڑی چھینٹے لڑ رہی ہے۔ بچے اُچھل نہروں میں کھڑے اودھم مچا رہے ہیں۔ کچھ حوض کے سہ درہ دالان میں کھڑی نہا رہی ہیں۔ کچھ پھسلواں پتھر سے پھسل رہی ہیں۔ نیچے گر گر قلابازیاں کھاتی ہیں۔ کیچڑ میں لت پت ہوتی ہیں۔ حوض میں آکر کود پڑتی ہیں۔ نہانے والیاں غل مچاتی ہیں کہ "نکلو، سارا پانی گدلا کر دیا" غرض ہر ایک اپنے اپنے رنگ میں ایسا مست تھا کہ دنیا و مافیہا کی خبر نہ تھی۔ اتنے میں پرچہ لگا کہ حضرت جہاں پناہ ناظر کے باغ تشریف لے جا رہے ہیں۔ اب کیا تھا سب نے پانی میں سے نکل جھٹ پٹ کپڑے بدلے۔ بچوں کو گھسیٹ گھسیٹ کر نہروں میں سے نکالا۔ یہ اِدھر اُن کے کپڑے لینے گئیں اور اُدھر وہ دھم سے پھر نہر میں کود گئے۔ بڑی مشکل سے بچوں کو پونچھ پانچھ کپڑے بدلوائے۔ جھرنہ کے دروازے کھل گئے۔ سب کے سب وہاں سے نکل امریوں میں آئے۔ تھوڑا بہت جھولا جھولا۔ پکوان کھایا اور ناظر کے باغ کا راستہ لیا۔

ناظر کا باغ جھرنہ سے قریب ہی ہے۔ محمد شاہ بادشاہ کے ناظر روز افزوں نے بنوایا تھا۔ امریوں کے سامنے ہی اس کا بڑا دروازہ ہے دروازہ پر یہ تاریخ کندہ ہے۔

پے تاریخ سالش گفت ہاتف ؛ خدایا رہے بود باللہ مبارک

باغ کے گرد پختہ چار دیواری ہے۔ اندر چاروں طرف سنگِ سُرخ کی چار بارہ دریاں ہیں۔ بیچ میں ایک بڑی خوبصورت عالیشان بارہ دری ہے بیچ کی بارہ دری کے چاروں طرف چار حوض ہیں۔ ان حوضوں میں کئی کئی فوارے ہیں۔ جھرنہ کا پانی اس باغ میں آتا ہے۔ ان چاروں حوضوں سے چار نہریں نکالی ہیں۔ تھوڑی دور نہر گئی اور دوسرے حوض میں گر گئی۔ اس سے نکلی تیسرے حوض میں جا گری۔ اسی طرح حوضوں میں سے یہ نہریں ہوتی ہوئی اور سامنے کی بارہ دریوں کے گرد گھوم کر باہر نکل جاتی ہیں۔ ان نہروں کی وجہ سے باغ کے چار حصہ ہو گئے ہیں نہروں کے دونوں کناروں پر چلنے پھرنے کے لئے پختہ روشیں ہیں۔ اس کے بعد گھانس کے تختے ہیں۔ اور ان تختوں سے ملی ہوئی پھولوں کی کیاریاں اور کیاریوں کے بعد گھنے سایہ دار درخت۔ شروع بھادوں تھا۔ آم کے درختوں پہ بہار تھی۔ گوندنی کی طرح لدے ہوئے تھے۔ بھلا بغیر اجازت کے کون ہاتھ لگا سکتا تھا۔ ڈرتے ڈرتے بادشاہ سلامت سے اجازت چاہی۔ اجازت ملنی تھی کہ سب کے سب درختوں پر ٹوٹ پڑے۔ آدھے کھائے۔ آدھے پھینکے۔ گٹھلیاں چلیں۔ چھلکے چلے۔ تھوڑی دیر میں نئے کپڑے عجیب شان کے ہو گئے۔ بارہ دری کے حوضوں میں پھر سب جا کر نہائے۔ کپڑے بدلے۔ خاصہ پر آ کر بیٹھے۔ مگر کیسا کھانا اور کہاں کا کھانا پکوان اور آموں سے پیٹ بھر چکے تھے۔ منہ جھوٹا کرنے کو بیٹھ گئے تھے۔ ذرا سی دیر میں دسترخوان بڑھ گیا۔ اس کے بعد سب ہیں اور وہی آموں کے درخت۔ شام تک کئی کئی جوڑے بدل گئے۔ غرض کہ سارے کا سارا دن اسی جھرنے۔ امریوں اور باغ کے پھیر میں گزر گیا۔ شام کو جنگل محل میں آن کر وہ لمبی تانی کہ صبح کی خبر لائے۔

دوسرے دن قطب صاحب کی لاٹھ۔ علائی دروازے[1] امام ضامن کے مقبرے

---

[1] یہ دروازہ سلطان علاء الدین کا بنوایا ہے۔ لاٹھ کے بالکل پاس ہے اور خوبصورتی میں لاجواب سمجھا جاتا ہے۔

بھیم کی چھٹنگی۔[۵۱] کڑوے[۵۲] میٹھے نیم۔ اور بارہ بادشاہوں[۵۳] کی قبروں کا چکر رہا تیسرے روز چہل تن چہل من۔[۵۴] بکاولی[۵۵] کے قلعہ۔ جمالی کمالی کے مزار اور اندھیریا باغ[۵۶] کی سیر کی غرض تین دن میں سارا قطب چھان مارا۔ تھک کر چور ہو گئے۔ پھرتے پھرتے پاؤں میں چھالے پڑ گئے۔ جب کہیں جا کر کل سے بیٹھے۔ چودھویں تاریخ بھی آگئی تھی۔ صرف جنگلی محل اور مرزا بابر کی کوٹھی قلعہ والوں کے پاس رہی۔ باقی سارے قطب پر دلی والوں نے قبضہ کر لیا ہے۔

دِلّی والے سیر کا انتظام تو پورے سال کرتے رہتے ہیں۔ ہاں تاریخ مقرر ہونے کے بعد اس میں ذرا تیزی آجاتی ہے۔ اِدھر تاریخ مقرر ہوئی اور اُدھر کارخنداروں

---

۵۱ مہرولی میں شمال کی طرف کوئی میل بھر کے فاصلہ پر ایک بہت بڑا پتھر۔ پہاڑ کی چٹان پر رکھا ہوا ہے۔ بچہ بھی ہلائے تو اس طرح ہلتا ہے کہ اب نیچے جا پڑے۔

۵۲ چھٹنگی کے قریب ہی ایک بزرگ کے مزار پر یہ درخت ہے کہتے ہیں رائے پتھورا کی بیٹی ان کے ہاتھ پر مسلمان ہوگئی تھی۔ اس کی قبر پر بھی اس نیم کا سایہ ہے۔ نیم کے درخت کا جو حصہ ان بزرگ کے مزار پر ہے اُس کے پتے میٹھے اور جو حصہ راجہ کی لڑکی کی قبر پر ہے اس کے پتے کڑوے ہیں۔

۵۳ یہ پٹھان بادشاہوں کی قبریں ایک کھلے چبوترے پر بنی ہوئی ہیں۔

۵۴ اولیا مسجد کے سامنے چالیس شہیدوں کے مزار ہیں۔ کہتے ہیں کہ یہ کسی طرح گنتی میں نہیں آتے بے ترتیبی کی وجہ سے بھول چوک ہو جاتی ہے۔

۵۵ چہل تن چہل من کے پاس ہی ایک ویران عمارت ہے سنتے ہیں رات کے وقت اس میں سے گانے کی آوازیں آتی ہیں۔

۵۶ اندھیریا باغ قطب کی جان ہے۔ شمسی تالاب کے جنوبی کنارہ پر اس خوبصورتی سے لگایا ہے کہ دور سے گہرے ابر کا دھوکہ ہوتا ہے گھنا ایسا ہے کہ دن کی دھوپ بھی مشکل سے اسکے پتوں میں سے چھنتی ہے۔ محمد شاہ بادشاہ نے اس باغ میں دنیا کے جو مزے اُٹھائے ہیں وہ کسی بادشاہ کے خواب خیال میں بھی نہیں آسکتے۔ اب اس سے زیادہ کیا لکھوں۔ خیر جو تھا سو تھا اچھی گزار گئے۔ بہادر شاہ کے بیٹے مرزا فخرو کا مزار باغ کے بیچ میں ایک چبوترہ پر بنا ہوا ہے۔ اب یہ باغ کسی قدر چھدرا ہو گیا ہے۔

(کارخانہ داروں) کے ہاں بتی پڑی جب مقدور سب نے اس میں چندہ دیا۔ یہ تو قطب میں کھانے پینے کا خرچ ہوگیا۔ اب رہے دوسرے خرچ۔ تو۔ وہ تم جانو اور تمھارا کام جانے۔ جی چاہے اُٹھاؤ جی چاہے نہ اُٹھاؤ۔ تیرہ تاریخ سے دلی خالی ہونی شروع ہوئی۔ اجمیری دروازہ سے لگا۔ قطب تک دو کانیں لگ گئیں۔ امیروں کی پالکیاں جا رہی ہیں۔ رنڈیوں کی رتھیں نکل رہی ہیں۔ ایک ایک رتھ ایسی کہ نظر لگے مخمل کی بُرجی۔ اُس پر زردوزی کے پھول۔ اوپر سنہری کلس۔ اطلس کے پھندنے۔ کلابتوں کی ڈوڑیاں۔ سفید براق پہیے۔ ان پر رنگین بیل بوٹے۔ ناگوری بیل۔ ان پر زردوزی کام کی جھولیں۔ گلے میں چاندی کے گھنگرو سینگوں پر نگوٹیاں ریشم کی ناتھیں۔ اندر بناؤ سنگار کئے رنڈیاں بیٹھی ہیں۔ ایک رتھ نکل گئی۔ دوسری آئی نکل گئی۔ دِلّی کے شرفا گھوروں پر سوار مخمل کے کارچوبی زین پوش لیسیں ٹکی ہوئی لگامیں۔ گنگا جمنی گہنا پہنے ہوئے گھوڑے رنگی اور گندھی ہوئی ایالیں۔ ریشمی باگ ڈور تھامے، سائیس۔ ان کے صاف شفاف کپڑے۔ چھوٹی چھوٹی سُرخ پگڑیاں ایک ہاتھ میں باگ ڈور دوسرے میں چوہری۔ سوار ہیں کہ شہ سواری کے انداز دکھاتے چلے جا رہے ہیں۔ غریبوں کا کچھ عجیب رنگ ہے صرف ایک تہمت بندھی ہے۔ نہ جسم پر کرتہ ہے نہ سر پر ٹوپی۔ نہ پاؤں میں جوتی۔ ہاں ایک چھوٹا سا مٹکا سر پہ اوندھائے سرپٹ اُڑے جا رہے ہیں۔ اب یہ نہ پوچھو کہ اس مٹکے میں کیا ہے۔ بس یہ سمجھ لو کہ سیر کا سارا ذخیرہ اسی مٹکے میں ہے تحفہ تحفہ کپڑے ہیں۔ لیس دار کارچوبی ٹوپی ہے۔ لپواں سلیم شاہی جوتی ہے۔ روپے ہیں، پیسے ہیں۔ بچھونا ہے۔ غرض سب ہی کچھ بھرا ہے۔ مٹکے میں اس لئے رکھا ہے کہ بھیگ نہ جائے۔ ترکیب

لہ لفظ تو "تہ بند" ہے۔ اس سے تہمد ہوا۔ پھر تہمت بن گیا۔ شاہ مبارک آبرو کا شعر ہے۔

آبرو کے قتل کو حاضر ہوئے کس کے کمر ⁂ خون کرنے کو چلے عاشق پہ تہمت باندھکر

اچھی نکالی ہے۔ سامان کا سامان بچا اور ملکہ قطب میں کام آیا۔

تیرھویں کی صبح سے جو یہ لین لگی تو کہیں چودھویں کی شام کو جا کر ختم ہوئی ساری دلی خالی ہو گئی شاید ہی کوئی گھر ہو گا جس میں مرد یا بچہ رہ گیا ہو۔ اب رہی عورتیں تو انھوں نے دلی میں سیر منائی۔ سبزی منڈی نکل گئیں۔ باغوں کی سیر کی جھولے ڈالے۔ کڑھائیاں چڑھائیں۔ آم کھائے۔ حوضوں میں نہائیں۔ غرض دل کے پورے ارمان نکال لئے۔ شاہی حکم تھا کہ جب سرکاری باغ میں دلی والیاں جانا چاہیں۔ تو جانے دو۔ پہرا کرا دو۔ باہر پہرے لگا دو۔ کہ کوئی مرد اندر نہ جا سکے آگے یہ جائیں اور باغ جانے۔ انھوں نے بھی دو روز میں سارے باغوں کو لنڈورا کر دیا۔ آموں کی گٹھلیوں اور چھلکوں کے ڈھیر لگا دیئے۔ دن میں کئی کئی دفعہ اُٹھائے جاتے۔ اور پھر وہی پہاڑ کے پہاڑ لگ جاتے۔

سیلانیوں نے پہلے تو قطب میں اپنے لئے کونے تلاش کئے۔ بھلا قطب میں ٹھہرنے کے لئے جگہ کی کیا کمی تھی۔ سرکاری ڈیرے تھے۔ شاہی مکانات تھے پُرانے کھنڈر تھے۔ اُمرا تو اپنے مکانوں میں جا ٹھیرے۔ روپے پیسے والوں نے سڑک کے دونوں طرف جو کوٹھے تھے وہ کرایہ پر لے لئے۔ غربا کچھ تو ڈیروں اور سرکاری مکانات میں جا پڑے۔ کچھ جھرنے میں جا ٹھیرے۔ کچھ ناظر کے باغ میں اُتر گئے لیکن جن کو قطب کا لطف اُٹھانا تھا انھوں نے آسمان کے نیچے ڈیرا کیا۔ مینہ برستا ہے برسنے دو۔ یہی قطب کی بہار ہے۔

مہرولی کے بازار کی کچھ نہ پوچھو۔ اس سرے سے اُس سرے تک سارا آئینہ بند تھا۔ دنیا بھر کے سودے والوں کی دوکانیں لگ گئی تھیں۔ میوے مٹھائیاں اور کھلونوں سے بازار پٹا پڑا تھا۔ ایک طرف حلوائیوں کے ہاں پوریاں۔ کچوریاں۔ بیوڑیاں۔ سہال اور اندرسے تلے جا رہے تھے تو دوسری

طرف کبابوں۔ پراٹھوں۔ بریانی۔ مزعفر اور متنجن کی خوشبو سے سارا بازار پڑا مہک رہا تھا۔ گاہک ہیں کہ ٹوٹے پڑتے ہیں۔ لیا۔ کھایا۔ سٹکے، وہیں پھینک آگے بڑھے۔ پنواڑن کی دوکان پر پہونچے۔ بی پنواڑن ہیں کہ بالوں میں تیل ڈالے، کنگھی کئے۔ آنکھوں میں سرمہ لگائے۔ دانتوں میں مسی ملے۔ بڑے ٹھاٹھ سے بیٹھی پان بنا رہی ہیں۔ دیسی پان لال لال صافیوں میں لپٹے، سامنے دھرے ہیں۔ پان بن رہے ہیں۔ مذاق ہو رہا ہے۔ یار لوگوں نے پان لئے خود کھائے۔ دوسروں کو کھلائے۔ پیک تھوکی۔ آگے بڑھے۔ پھول والوں کی دوکانوں سے گجرے لئے۔ گلے میں ڈالے۔ ساقی کے پاس ٹھیرے، دو دم حقہ کے مارے۔ ایک دو پیسے دئیے۔ آگے قدم بڑھایا، ساقی کا رنگ بھی آج کچھ نیا ہے، حقہ کیا ہے ایک تماشہ ہے۔ کوئی گز بھر اونچا نیچہ، اُس پر اتنی بڑی چلم کہ ڈیڑھ پاؤ تمباکو آوے۔ نے ہے کہ یہاں سے وہاں تک چلی گئی ہے۔ نے کو سنبھالنے کے لئے کئی کئی گھوڑیاں دے رکھی ہیں۔ نے پر خس چڑھا ہے، اوپر موتیا اور چنبیلی کی لڑیاں لپٹی ہیں۔ گھوڑیوں کے اوپر روشنی کے چھوٹے چھوٹے گلاس لگے ہیں۔ ساقی خود بھی سفید کپڑے پہنے سبز بنارسی سیلہ باندھے لال ٹیکا لپیٹے۔ کھڑے حقہ پلا رہے ہیں کوٹھے والوں کو پلانا ہو تو "نے" سیدھی کر دی۔ انھوں نے بھی دو کش کھینچ لئے۔ ادھر کسی نے مہنال پر ہونٹ رکھے اور ادھر انھوں نے شعر پڑھنے شروع کئے۔

حقہ جو ہے حضور معلیٰ کے ہاتھ میں
گویا کہ کہکشاں ہے ثریا کے ہاتھ میں

شام ہوتے ہوتے بازار اتنا بھرا کہ تل رکھنے کو جگہ نہ رہی۔ تھالی پھینکو تو سروں پر جائے۔ مغرب کی نماز کے بعد ہی جھرنے سے نفیری

کی آواز آئی۔ لیجئے پنکھا اُٹھا۔ اب ہر شخص ہے کہ جھرنہ کی طرف جا رہا ہے۔ کچھ جا رہے ہیں، کچھ واپس آ رہے ہیں۔ ریلے پر ریلہ پڑ رہا ہے۔ جو ذرا دم خم والے ہیں وہ اِن جھٹکوں کو سینہ اور پشت پر سہ رہے ہیں۔ جو ذرا کمزور ہیں وہ یہ کہہ کر ایک طرف ہٹ جاتے ہیں کہ "ارے بھئی، جانے بھی دو۔ کون اس بلا میں پڑے۔ آگے چل کر پنکھا دیکھ لیں گے۔"

پنکھا جھرنے سے اُٹھا شمسی تالاب سے ہوتا ہوا مہرولی کی سڑک پر آیا۔ یہاں پہلے ہی سے مشعلیں لالٹینیں، گلاس، ہانڈیاں، فانوس اور دیوارگیریاں جل چکی تھیں۔ روشنی ایسی تھی گویا دن نکلا ہوا ہے۔ اب پنکھے کا جلوس بازار میں سے گذرنا شروع ہوا۔ آگے آگے ڈھول تاشے والے، روپہلی ٹھپہ ٹکے ہوئے سبز کرتے، لیس لگی ہوئی گول لال ٹوپیاں۔ کسی کے گلے میں ڈھول، کسی کے گلے میں تاشہ، ہاتھوں میں چوبیں۔ دھوں دھوں کرتا اس طرح گذرا کہ سب کے کان گنگ کر دئیے۔ ان کے پیچھے دو جھنڈے۔ زربفت کے پھریرے، بفنفشی رنگ کے پھندے کلابتوں کی ڈوریاں۔ جھنڈوں کے سروں پہ رنگ برنگ کے شیشوں کی ہشت پہل لالٹینیں۔ ایک لالٹین کے سرے پر سنہرا ہلال، دوسرے پر روپہلی چکر۔ ان کے بعد شرف الحق کوتوال کا گھوڑا۔ اردلی میں پولیس والوں کا پرا۔ ان کے پیچھے نوبت خانے کا تخت۔ تخت کیا ہے خاصی بارہ دری ہے۔ تخت کے اوپر بانسوں کی بارہ دری کھڑی کر، اوپر کھپچیوں کا گنبد بنا، کپڑا منڈھ، پنی لگا، کاغذوں کے پھولوں سے سجا۔ دروں میں گیندئی پردے ڈال، ڈوریوں سے کس دئیے۔ نوبت والے اندر جا بیٹھے۔ تخت کو کہاروں نے اُٹھایا اور یہ خاصہ مکان کا مکان جلوس کے ساتھ چلنے لگا۔ نوبت خانہ کے پیچھے دلی کے اکھاڑے ہر اکھاڑے کے ساتھ ایک ایک اُستاد بیس بیس پچیس پچیس شاگرد بنے ہوئے تیار جسم۔ چوڑے چوڑے سینے بھرے بھرے ڈنڈ۔

بھری ہوئی مچھلیاں، پتلی پتلی کمریں، جسم پر چسپت جانگئے۔ گلے میں سونے کے چھوٹے چھوٹے تعویذ، کوئی بنوٹی کا چکر باندھ رہا ہے۔ کوئی لیزم ہلا رہا ہے۔ کوئی تلوار کے ہاتھ نکال رہا ہے، کہیں پھری گتکہ سے مقابلہ ہو رہا ہے کہیں بانک اور بنوٹ کے کرتب دکھائے جا رہے ہیں۔ غرض دور تک اکھاڑے ہی اکھاڑے پھیلے ہوئے تھے۔ ان کے پیچھے نفیری والے اور اُن کے ساتھ دلی کے سقّے سفید براق کپڑے پہنے۔ لال کھاروے کی لنگیاں کمر سے لپیٹے سبز سیلے سروں پر باندھے۔ ہاتھوں میں مُنجھے منجھائے پیتل کے کٹورے لئے نفیری اور جوڑی کے ساتھ کٹوروں کی آواز ملاتے چلے آ رہے تھے۔ نفیری والوں کے بعد ڈنڈے والوں کی سنگتیں تھیں۔ ہاتھوں میں لال سبز ڈنڈے۔ پندرہ بیس کا حلقہ بیچ میں طبلہ سارنگی والے۔ تال سُر پر ڈنڈوں کی کھٹا کھٹ عجیب مزا دے رہی تھی ان کے پیچھے تخت رواں تختوں پر رنڈیاں بھاری بھاری پشوازیں پہنے، کارچوبی دوپٹے اوڑھے۔ پاؤں میں گھنگرو باندھے چھم چھم ناچ رہی ہیں۔ ان کے بعد انگریزی باجہ اور ترک سواروں کا رسالہ۔ سُرخ بانات کی وردیاں، اُن میں بانات کے کف اور کالر، شانوں پر فولادی جال۔ پاؤں میں کالی برجسیں۔ لک[۵۱] کے چمڑے کے اونچے بوٹ۔ سر پر سُرخ منڈاسے۔ ہاتھوں میں لمبے لمبے برچھے لئے۔ گھوڑوں کے کنوتیاں ملائے آہستہ آہستہ بڑھ رہے ہیں۔ سواروں کے پیچھے روشن چوکی اور سیلانیوں کا اژدہام۔ سب کے صاف ستھرے کپڑے، کارچوبی ٹوپیاں۔ مداخل ٹکے ہوئے نیچے چولی کے انگرکھے ایک برے پیجامے سلیم شاہی جوتیاں۔ ان کے بعد بچھیرا پلٹن[۵۲] کی چار قطاریں۔ کم عمر گورے گورے لڑکے۔ سر پر دھانی منڈاسے

---

۵۱ لک (PATENT LEATHER) کو دلی میں لک کہتے ہیں۔

۵۲ شرفاء دہلی کے لڑکوں اور کم عمر شہزادوں اور سلاطین زادوں کی یہ فوج بادشاہ نے بنائی تھی۔ تھے تو لڑکے مگر غدر میں باڑے کے نیچے سب ڈھیر ہو گئے ان کے قصے دلی کے بڈھے بیان کرتے تھے اور روتے تھے تاریخ میں ان کے کارناموں کا کوئی ذکر نہیں ہے خدا معلوم کیا بات ہے۔ ہاری ہوئی فوج تھی شاید اسلئے ان کا ذکر بے ضرورت سمجھا گیا۔

منڈاسوں پر چھوٹی چھوٹی کلغیاں۔ سبز[1] اطلس کے کوٹ۔ سفید اطلس کی کسی ہوئی برجیس سیاہ چمڑے کے انگریزی جوتے۔ ہاتھوں میں سبز پھریروں کے چھوٹے چھوٹے نیزے۔ بڑی آن بان سے قدم ملاتے چل رہے ہیں۔ ان کے پیچھے دلّی کے شرفاء اور عمائد کا ہجوم۔ نیچی نیچی قبائیں اور چغے۔ ہندوؤں کے سروں پر چھوٹی چھوٹی گیندئی پگڑیاں۔ مسلمانوں کے سروں پر زعفرانی عمامے اور چوگوشیہ ٹوپیاں۔ ہاتھوں میں رنگ برنگ کی جریبیں۔ ہشاش بشاش چہرے گلے میں پھولوں کے کنٹھے۔ ہاتھوں میں مولسری کی لڑیاں۔ موسم کا لطف اُٹھاتے میلہ کی رونق بڑھاتے خراماں خراماں چلے آرہے ہیں۔ ان کے بعد شاہی شہنائی نوازوں کا گروہ۔ نفیری کے کمال دکھاتا۔ موسم کی چیزیں بجاتا۔ خود بھی اپنے کمال کے مزے اُٹھاتا۔ پنکھے کے ساتھ ساتھ ہے۔ سب سے آخر میں پنکھا اور پنکھے کے پیچھے پھول والوں کا غول۔

بھلا اس جلوس کو دیکھو اور پنکھے کو دیکھو۔ بانس کی کھپچیوں کا بڑا سا پنکھا بنا۔ پنی چڑھا۔ آئینے لگا۔ پھولوں سے سجا۔ ایک لمبے رنگین بانس پر لٹکا دیا تھا۔ یہ پنکھا نہ تھا بلکہ جوش محبت اور یگانگت کا نشان تھا جس نے چھوٹے بڑوں ہندو، مسلمانوں، غرباء، امراء، غرض ہر قوم و ملت اور ہر طبقہ کی رعایا کو ایک جگہ جمع کر دیا تھا اور خود بادشاہ کو قلعہ سے نکال مہرولی میں لے آیا تھا۔ یہ پنکھا نہ تھا۔ بلکہ عقیدت اور محبت کے مظاہروں کا مرکز تھا۔ اور یہ مہرولی نہ تھی۔ بلکہ لگن تھا جس میں خود بادشاہ شمع تھے اور رعایا ان کے پروانے۔

غرض، خلقت کا یہ ہجوم پھوار میں بھیگتا خس کے پنکھے جھلتا۔ آہستہ آہستہ مہرولی کی سڑک پر سے گزرا۔ باجہ والے اور نفیری والے ہر کمرہ کے سامنے

---

[1] دہلی کا شاہی رنگ سبز تھا۔

ٹھیرتے۔ ایک آدھ چیز سناتے۔ انعام لیتے اور آگے بڑھتے۔ ہوتے ہوتے یہ جلوس شاہی دروازے کے سامنے پہنچ گیا۔ بادشاہ سلامت اوپر کی بارہ دری میں برآمد ہوئے۔ بیگمات کے لئے چلمنیں پڑ گئیں۔ اب ساری بھیڑ سمٹ سمٹا کر باب ظفر کے سامنے آگئی۔ پھاٹک کے سامنے بڑا کھلا میدان تھا۔ یہاں باجے والوں نے اپنے کمال دکھائے۔ اکھاڑے والوں نے اپنے کرتب دکھائے۔ سقوں نے کٹورے بجائے۔ ڈنڈے والوں نے اپنے ہاتھ دکھائے۔ رنڈیوں نے اپنا ناچ دکھایا۔ سب کو حسب مراتب انعام ملا۔ کسی کو سیلا ملا۔ کسی کو دوشالہ ملا۔ کسی کو مندیل ملی۔ کسی کو کڑے ملے۔ اتنے میں پنکھا بھی سامنے آگیا۔ شہر کے شرفا اور امرا مجرا بجا لائے۔ اوپر سے سارے مجمع پر گلاب پاشوں سے گلاب اور کیوڑہ چھڑکا گیا۔ عطر اور پان سے تواضع کی گئی۔ بادشاہ کے اشارہ کرتے ہی ولیعہد بہادر نیچے اُتر آئے۔ لوگوں کے گلے میں پھولوں کے کنٹھے ڈال کر سب کو رخصت کیا۔ یہاں سے سلاطین زادے اور شہزادے بھی جلوس کے ساتھ ہوگئے۔ کوئی بارہ بجے ہوں گے کہ پنکھا جوگ مایا جی پہونچ گیا۔

یہ مندر قطب صاحب کی لاٹھ سے کوئی دو ڈھائی سو قدم پر ہے۔ بڑی لمبی چار دیواری ہے۔ کونوں پر برجیاں ہیں۔ احاطہ کے اندر (۲۰-۲۲) عمارتیں اور بیچ میں دیوی کا استھان ہے۔ کہتے ہیں کہ یہ دیوی کشن جی کی بہن تھیں۔ بجلی بن کر الوپ ہوگئیں۔ اور یہاں آن پڑیں۔ راجہ یدھشٹر نے مندر بنوا دیا۔ مندر زمین کے برابر ہوگیا تھا۔ پھول والوں کی سیر شروع ہوئی تو اکبر شاہ ثانی کے ایما سے لالہ سیڈومل نے نیا مندر بنوایا۔ رفتہ رفتہ اور عمارتیں بھی اندر بن گئیں اب یہ خاصی آباد جگہ ہوگئی ہے۔ اس مندر کی خصوصیت یہ ہے کہ اس کے اندر پلنگ یا چارپائی نہیں جا سکتی۔

کوئی ایک بجے لوگ پنکھا چڑھا کر واپس ہوئے۔ دوسرے دن درگاہ شریف کا پنکھا بھی اسی دھوم دھام سے اُٹھا۔ باب ظفر کے سامنے آکر ظہیر البعض مصاحبوں نے کوشش کی کہ بادشاہ سلامت کو بھی پنکھے کے ساتھ درگاہ شریف میں کسی نہ کسی طرح لے چلیں۔ مگر بادشاہ کسی طرح اس پر راضی نہیں ہوئے۔ کہا "اماں، یہ کیسے ہو سکتا ہے۔ جب میں جوگ مایا جی کے پنکھے کے ساتھ نہیں گیا تو اب اس پنکھے کے ساتھ کیسے جاؤں۔ تمھارے ہندو بھائی کیا خیال کریں گے مسلمان تھا، مسلمانوں کے پنکھے میں شریک ہو گیا۔ ہم کو غیر سمجھا۔ اس لئے جھرکوں سے نیچے بھی نہیں آیا۔ نا۔ اماں، نا۔ جیسا ایک کے ساتھ کرنا ویسا دوسرے کے ساتھ کرنا۔ شہزادے پہلے بھی گئے تھے۔ اب بھی جائیں گے۔ آتشبازی میں ہندو مسلمان سب شریک ہوتے ہیں وہاں ہم بھی چلیں گے۔"

خیر، درگاہ شریف[2] تو قریب ہی تھی۔ لوگ دس بجے پنکھا چڑھا کر فارغ ہو گئے

---

[1] میں نے بزرگوں کی زبانی سنا تھا کہ بادشاہ کو آتشبازی کا بڑا شوق تھا۔ آتشباز نوکر تھے۔ کوئی میلہ نہ تھا جس میں قلعہ سے آتشبازی نہ جاتی ہو۔ دہلی والوں سے مقابلے ہوتے تھے۔ ان مقابلوں کے دو بڑے میدان تھے ایک شمسی تالاب۔ دوسرے سید حسن رسول نما کا حوض۔ پھول والوں کی سیر میں تو اب آتشبازی نہیں چھوٹتی۔ ہاں سید حسن رسول نما میں اب بھی خوب مقابلے ہوتے ہیں۔ ان بزرگوں کے بیان کی تائید اب ایک کتاب سے بھی ہو گئی۔ ابھی حال میں مسٹر ایڈرورز نے شمس العلما منشی ذکاء اللہ خاں دہلوی کی سوانحعمری لکھی ہے۔ اور دہلی کے بڈھوں بڈھوں سے پوچھ کر غدر سے پہلے کے حالات جمع کئے ہیں۔ اس میں بادشاہ کے اس شوق کا بھی ذکر ہے اس کتاب کے دیکھنے سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ بادشاہ اور دہلی والوں میں کیا تعلقات تھے۔ اور کس طرح یہ ایک دوسرے پہ جان دیتے تھے۔ صاحب لکھتے ہیں کہ جس بڈھے سے بادشاہ کا حال پوچھا خواہ ہندو ہو یا مسلمان اس کے آنسو نکل آئے یہ نہیں معلوم ہوتا تھا کہ وہ کسی غیر کا قصہ بیان کر رہا ہے بلکہ یہ ظاہر ہوتا تھا کہ وہ اپنی بپتا سنا رہا ہے۔ یہ کتاب ابھی ۱۹۲۹ء میں ڈبلیو ہیفر اینڈ سنز لمیٹڈ کیمبرج نے چھاپی ہے اور ساڑھے سات روپے قیمت ہے۔

[2] یہ درگاہ حضرت قطب الدین بختیار کاکیؒ کی ہے آپ حضرت (باقی صفحہ ۴۴ پر ملاحظہ ہو)

اور یہاں سے نکل سیدھے شمسی تالاب پہونچے۔ تھوڑی دیر میں بادشاہ سلامت کی سواری بھی آگئی بیگمات کے لئے جہاز پر چلمنیں پڑگئیں۔ وہ اندر جا بیٹھیں۔ بادشاہ سلامت نے مہتابی پر جلوس کیا مصاحبوں اور دہلی کے اکثر امراء و شرفا کو اوپر بلالیا گیا سارے سیلانی تالاب کے کنارے جم گئے۔ تالاب میں سینکڑوں کشتیاں، بجرے اور نواڑے پہلے ہی سے پڑ گئے تھے۔ آدھوں میں شاہی آتشباز سوار ہو کر ایک طرف چلے گئے۔ باقی میں دہلی کے آتش باز اور شوقین بیٹھ کر دوسری طرف گئے۔ بادشاہ سلامت کا آنا تھا کہ دونوں پارٹیاں مقابلہ کو تیار ہوگئیں۔

تھوڑی دیر نہ گزری تھی کہ جہاز پر مہتابی چھٹی۔ مہتابی کا چھٹنا تھا کہ میدان کارزار گرم ہو گیا۔ سب سے پہلے غبارے چھوڑے گئے اور ذرا سی دیر میں آسمان پر ہزاروں چاند اور سورج نکل آئے۔ ان سے فراغت ہوئی تو جنگی آتش[1] بازی کا نمبر آیا۔ ہوائیاں[2]

(بقیہ صفحہ گزشتہ) سلطان الہند غریب نواز خواجہ معین الدین چشتیؒ کے خلیفہ تھے سلطان شمس الدین التمش کو آپ سے بڑی عقیدت تھی۔ آپ کا وصال قوالی میں اس شعر پر ہوا۔

کشتگانِ خنجر تسلیم را ہر زماں از غیب جانے دیگر است

دہلی کے بادشاہوں نے آپ کے مزار کے گرد سنگ مرمر کی جالیاں فرش اور دروازے بنوا دیئے دیواروں پر کاشانی اینٹوں کا کام کرایا اور آس پاس مسجدیں اور حجرے تعمیر کرائے۔ خود مزار شریف تو کچی مٹی کا ہے۔ ہاں آس پاس دوسروں کی قبروں کے بڑے بڑے عمدہ سنگ مرمر کے تعویذ ہیں۔ ایک طرف سنگ مرمر کی چھوٹی سی مسجد ہے۔ اور اُس کے پہلو میں آخری بادشاہان دہلی کے مزار۔ بیچ میں شاہ عالم ثانی کا مزار ہے اور اُس کے ایک طرف اکبر شاہ ثانی کی قبر۔ ایک پہلو خالی تھا اُس میں بہادر شاہ نے اپنا کٹہرہ بنوایا تھا۔ خیال تھا کہ مرنے کے بعد باپ دادا کے پہلو میں جا پڑیں گے یہ کیا معلوم تھا کہ وہاں قبر بنے گی جہاں بندگوں کا پہلو تو کجا کوئی فاتحہ پڑھنے والا بھی نہ ہوگا۔

(متعلق صفحہ ہذا) [1] دہلی والوں نے آتشبازی کو دو قسموں میں بانٹا ہے۔ ایک جنگی دوسرے گل کاری ان دونوں کا مطلب آگے خود آپ سمجھ جائیں گے۔

[2] بڑے اُڑن اناروں کو دہلی میں ہوائی کہتے ہیں۔

چھکے۔ لٹو[۵۱] اور خدنگے[۵۳] چلے۔ ہوائیوں کی شائیں، شائیں۔ چھکوں کی غائیں، غائیں۔ لٹوؤں کی دھائیں، دھائیں۔ خدنگوں کی زائیں، زائیں۔ اور قلموں کی سائیں سائیں سے بس یہ معلوم ہوتا تھا کہ کوئی بڑی جنگ ہو رہی ہے۔ ادھر آسمان پر مقابلہ ہو رہا تھا ادھر پانی پر آتش بازی کے بجرے چھوٹے۔ بجرے کیا تھے۔ چھوٹے چھوٹے جہاز تھے۔ توپوں کی جگہ مہتابیاں اور چھچھوندریں۔ گولوں کی جگہ چکر اور خدنگے۔ مستولوں کی جگہ انار۔ آدمیوں کی جگہ مٹی کے سپاہی۔ پیٹ میں بارود۔ ناف میں چھچھوندر[۵۴]۔ اس سرے سے اس سرے تک شتابہ کا سلسلہ ادھر سے دلی والوں کے بجرے چلے۔ ادھر سے قلعہ والوں کے بجرے آئے۔ بیچ تالاب میں پہنچ کر دھواں دھوں ہونے لگی۔ سمندر کی لڑائی کا مزا آگیا۔ آتشبازی کی چمک سے سارا تالاب اور کنارے روشن ہو جاتے تھے۔ اور پانی میں روشنی کے عکس، کشتیوں کے سائے، آتشبازوں کے ننگے جسم، کناروں پر خلقت کے ہجوم۔ اُن کے

---

۵۱ موٹے مضبوط بانسوں کی لمبی لمبی پوریوں پر آنتیں لپیٹ اوپر سے کھلی چڑھا اور اندر خوب ٹھوس ٹھوس کے بارود بھر کر چھکہ بنایا جاتا ہے۔ اس کا چلانا واقعی بڑا کمال ہے۔ بارود کو آگ دے، اُس کو ہلانا شروع کیا۔ جب زور پکڑ گیا تو جھلا کر اور کئی چکر دے کر اوپر چھوڑ دیا۔ اب بانس کی یہ آدھ گز لمبی پوری غائیں غائیں کرتی اس زور سے جاتی ہے کہ خدا کی پناہ۔ اگر چھوڑنے میں کہیں ہاتھ بہکا رہ گیا اور یہ پوری تماشائیوں میں گھس گئی تو سمجھ لو کہ قیامت آگئی۔ کسی کی ہڈی ٹوٹی کسی کا منہ جھلس گیا۔ کسی کے کپڑوں میں آگ لگ گئی۔ غرض یہ آتش بازی کیا ہے ایک بلا ہے۔

۵۲ مٹی کے چھوٹے چھوٹے اور ہلکے گولے بناتے ہیں۔ یہ اندر سے خالی ہوتے ہیں ایک طرف چھید کیا بارود بھر دی چھید میں چھوٹی سی چھچھوندر لگا دی۔ چلاتے وقت چھچھوندر کو آگ لگا۔ لٹو کو اوپر پھینکا۔ اندر کی بارود نے آگ لی اور لٹو پھٹا۔ اس زور کی آواز ہوتی ہے جیسے توپ چل گئی۔

۵۳ خدنگہ کو دہلی والے خدنگہ کہتے ہیں یہ چیز ایسی عام ہے کہ کسی نوٹ کی ضرورت نہیں۔

۵۴ بڑی چھچھوندر کو قلم کہتے ہیں۔ اس کی بارود اتنی تیز ہوتی ہے کہ زمین پر لوٹنا جانتی ہی نہیں۔ پانی کی چوٹ کھا کر بھی اُٹھتی ہے تو پچیس تیس گز اونچی اُڑ جاتی ہے۔

غل، آتشبازی کے عکس سے ان کے زرد زرد چہروں اور اوپر دھوؤں کے بادلوں نے ایک عجیب خوفناک منظر پیدا کر دیا تھا۔

یہ سلسلہ ختم ہوتے ہی مہتابیوں، آفتابیوں، اناروں، بہروں، جائی جوہیوں ہت پھولوں اور چرخیوں کا مقابلہ شروع ہوا۔ اور پھر آہستہ آہستہ دونوں طرف کی کشتیاں سمٹ کر جہاز کے بالکل سامنے آگئیں۔ یہاں اُستادوں نے اپنے ہنر کے کمال دکھائے۔ بسنری چھوڑی تو ایسی کہ لوٹ کر سو سو دفعہ اُٹھے اور رہ رہ کر سالنس لے۔ بتاشہ انار ایسے کہ کئی کئی گز اونچے جائیں اور پچ رنگی پھول دیں۔ اور پھر یہ مزا کہ ہتیلی پر چھوڑ لو۔ کیا مجال جو چرکہ لگے۔ بڑے انار جو اُٹھے تو جہاز سے اونچے نکل گئے۔ بس معلوم ہوتا تھا کہ سرو کے درختوں کو آگ لگا کر کشتیوں میں کھڑا کر دیا ہے۔ اور اُن میں سے رنگ برنگی پھول جھڑ رہے ہیں۔ دم اتنا کہ ختم ہونا ہی نہ جانیں۔ کمال یہ کہ کپڑے پر دھبہ نہ دیں۔ آتشبازی کی روشنائی سے تو یہ نظر آتا تھا کہ سارے کا سارا پانی سونے کا ہو گیا ہے اور اُس کے عکس سے یہ معلوم ہوتا تھا کہ کسی نے تالاب میں آتشین باغ لگا دیا ہے۔

غرض دو بجے کے قریب آتشبازی ختم ہوئی۔ بادشاہ سلامت کی طرف سے شال دوشالے بندیلیں اور سیلے تقسیم ہوئے۔ کہیں تین بجے جاکر لوگوں کو فرصت ہوئی۔ سب اپنے اپنے ٹھکانوں پر جا پڑے۔ بادشاہ سلامت کی سواری رات ہی کو قطب سے نکل گئی۔ اور روشن[۱] چراغ دہلی ہوتی ہوئی تیسرے پہر تک دہلی آگئی۔ دوسرے روز لوگوں نے صبح ہی صبح اُٹھ میوے مٹھائیاں

---

[۱] حضرت خواجہ نصیر الدین چراغ دہلی رحمتہ اللہ علیہ کا مزار پرانی دہلی میں ہے۔ قطب سے ۵ میل اور دہلی سے کوئی ۷ میل۔ آپ حضرت سلطان المشائخ خواجہ نظام الدین اولیاء کے خلیفہ ہیں اور وہیں سے آپ کو چراغ دہلی کا خطاب ملا تھا۔ جہاں آپ کا مزار ہے اس بستی کو اسی خطاب کی وجہ سے چراغ دہلی یا روشن چراغ دہلی کہنے لگے ہیں۔

پراٹھے چھلّے اور کھلونے خریدے۔ ٹھنڈے ٹھنڈے نکل اپنے گھروں کا راستہ لیا شام تک مہرولی سنسان اور دہلی آباد ہو گئی۔

دیکھ لیا آپ نے پھول والوں کی سیر کا مزا۔ اور اب کی کیا پوچھتے ہو۔ غدر ہوا۔ دہلی تباہ ہوئی۔ بادشاہ رنگون پہونچے۔ بندھن ٹوٹ گیا تیلیاں بکھر گئیں۔ بندھن اب بھی ہے۔ مگر وہ محبت کا بندھن تھا۔ یہ قانون کا بندھن ہے۔ ذرا کچھ بات ہوئی اور چل بھیا عدالت میں۔ بات یہ ہے کہ پھول والوں کی سیر رعایا کی عقیدت اور بادشاہ کی محبت کا مظاہرہ تھی۔ بادشاہ کے بعد بھی چلی۔ مگر مرکز اور یک جہتی نہ ہونے سے زور گھٹتا گیا۔ اب پانچ چھ برس سے بالکل بند ہے۔ اگر یہی لیل ونہار ہیں۔ اور دلوں کی کدورت کا یہی حال رہا تو ہمیشہ کے لئے اس کو بند ہی سمجھو۔

اب ہم نشیں میں روؤں کیا اگلی صحبتوں کو
بن بن کے کھیل ایسے لاکھوں بگڑ گئے ہیں

مضمون ختم ہو گیا۔ پڑھنے کے بعد ہر شخص کے دل میں خیال پیدا ہوگا کہ یہ واقعات ہیں یا کوئی من گھڑت قصہ۔ اس کے متعلق میں بعض باتوں کی وضاحت کر دینا مناسب سمجھتا ہوں۔ اس مضمون میں جس قدر تاریخی واقعات یا مکانات کے نقشے ہیں ان کی صحت میں تو کسی کو شک ہو ہی نہیں سکتا۔ البتہ بقیہ واقعات کے متعلق دل میں دگدا پیدا ہو سکتا ہے۔ اس کی یہ کیفیت ہے کہ جھرنے اور امریوں کے واقعات کا حال میں نے ان بڑھیوں سے سنا ہے جو ان جلوس میں شریک تھیں۔ اس زمانہ کی سیر دیکھنے والے اب بھی دہلی میں موجود ہیں۔ وہ میرے ایک ایک حرف کی تائید کریں گے۔ جلوس کی تصویر خود میں نے اپنے مصوری کے اُستاد کے ہاں دیکھی ہے۔

لہ ۲ھ پھول والوں کی سیر کی بس دو ہی سوغاتیں تھیں۔ ایک پراٹھے دوسرے چھلّے آتے اور گھر گھر بٹتے۔

میں نے صرف یہ کیا ہے کہ ان واقعات کو ملا کر رنگ بھر دیا ہے۔ اب رہی گفتگو۔ تو وہ البتہ میرے خیال کا نتیجہ ہے لیکن جو تعلقات اور محبت رعایا اور بادشاہ میں تھی، اس کا لحاظ کرتے ہوئے اس گفتگو کو بھی مبالغہ آمیز نہیں کہا جا سکتا مسٹر سی۔ ایف۔ اینڈ روز کی کتاب "ذکا اللہ دہلوی" اٹھا کر دیکھو تو معلوم ہو جائیگا کہ جو کچھ میں نے اس بارے میں لکھا ہے وہ صحیح ہے یا غلط۔ مسٹر اینڈروز میرے اُستاد تھے۔ مجھ کو معلوم ہے کہ کس طرح بڈھے بڈھوں، سے مل کر اُنھوں نے غدر سے پہلے کے حالات دریافت کئے ہیں اور خود اُن پر اس تحقیقات کا کیا اثر ہوا ہے۔ اب صرف ایک بات رہ جاتی ہے وہ یہ ہے کہ ۱۲۶۴ھ کا انتخاب کیوں کیا گیا۔ اس کی بھی ایک خاص وجہ ہے ۱۲۶۴ھ تک بہادر شاہ کی زندگی بہت چین چان اور امن و امان سے گزری۔ اس کے سال بھر بعد ہی سے اس بچارے پر پے در پے مصیبتیں آنی شروع ہوئیں۔ دارا بخت ولی عہد کا انتقال ہوا۔ مرزا شاہ رخ مرے۔ مرزا فخرو چل بسے۔ خود بادشاہ کو زہر دیا گیا۔ جواں بخت کی ولی عہدی کے جھگڑے پڑے۔ قصہ مختصر یہ کہ غدر تک ان مصیبتوں نے بچارے بڈھے بادشاہ کو بٹھا دیا۔ اسی خیال سے میں نے وہ آخری سال لیا ہے جب بادشاہ ان تمام فکروں اور مصیبتوں سے آزاد تھے۔

بہر حال یہ بڈھوں کی ودیعت تھی جو میں نے آپ تک پہنچا دی اب چاہیں آپ اس کو قبول کریں یا نہ کریں۔

بڑا مزہ اُس ملاپ میں ہے
جو صلح ہو جائے جنگ ہو کر

بات یہ ہے کہ دونوں غلطی پر تھے۔ بیوی سمجھتی تھیں کہ جوانی میں محبت کے جو اقرار مدار میاں نے کئے تھے وہ شادی کے دس برس بعد بھی بحال و قائم رہیں میاں سمجھتے تھے کہ باوجود چار بچے ہو جانے کے بیوی اسی طرح میری خوشی کو مقدم سمجھتی ہیں۔ جیسے بچے ہونے سے پہلے سمجھتی تھیں۔ بیوی جوانی کی اُمنگ کو محبت سمجھی ہوئی تھیں۔ میاں نکاح کو بیوی کی تحریری غلامی خیال کرتے تھے۔ میاں سمجھتے تھے جو کمائے وہ گھر کا مالک۔ بیوی سمجھتی تھیں جو اُٹھائے وہ گھر کا مالک۔ میاں تعلقات دنیوی کو محبت سے تعبیر کر کے چاہتے تھے کہ بیوی دین دنیا سب کچھ چھوڑ کر بس میری ہو رہیں۔ بیوی سمجھتی تھیں کہ یہ تعلقات صرف عارضی محبت ہیں اصلی محبت وہ ہے جو ماں کو بچوں سے ہوتی ہے۔

غرض بات یہ ہے کہ دونوں غلطی پر تھے

پہلے چھوٹی چھوٹی باتوں پر چلی اور تھم گئی۔ خود دیر سے اُٹھے۔ کچہری وقت پر نہ پہنچے۔ اِلزام بیوی کو دیا گیا کہ ناشتہ وقت پر نہیں ملا۔ یا گھوڑی کو دانہ دیر میں دیا گیا۔ دفتر گئے۔ واپس آتے آتے گذری بات ہو گئی۔ باہر دوست یا دفتر والے ملنے آئے۔ منگانے پر پان نہ آئے۔ شرمندگی ہوئی۔ خود اندر جا کر غل مچایا۔ بیوی نے کہا، میں کیا کروں۔ انا ایسی غائب ہوئی ہے کہ آنے کا نام نہیں لیتی۔ بچہ رو رہا تھا۔

اس لئے پان نہ بنا سکی۔ اب جاؤ بھیجے دیتی ہوں۔" یہ باہر آئے تھوڑی دیر میں پان آ گئے۔ یاروں کی باتوں میں دل بہل گیا۔ دوبارا پھر خاصدان بھرا ہوا آ گیا۔ خوش ہو گئے معاملہ رفع دفع ہوا۔ یہ اندر بیٹھے لکھ رہے ہیں، کسی کام کو اُٹھے۔ بڑے لڑکے نے سیاہی کا غذوں پر اوندھا دی۔ دیکھا تو ساری کی کرائی محنت خاک میں مل گئی۔ چیختے چلاتے اُٹھے۔ لونڈا سمجھ گیا کہ رُخ میری طرف ہے بھاگا۔ وہ آگے اور یہ پیچھے۔ کیاری کے دو چار چکر کاٹ کر آخر جا لیا۔ اور کان پکڑ کر دو ہاتھ مار ہی دیئے۔ لونڈا وہ فیل لایا کہ خدا کی پناہ چیخیں مار مار کر سارا گھر سر پر اُٹھا لیا۔ بیوی باورچی خانہ سے ٹبڑاتی ہوئی نکلیں۔ بچے کو اُٹھایا۔ پیار کیا۔ کچھ نیچی آوازیں میاں کو بھی کہہ گئیں۔ سارے دن غصہ رہا۔ شام کو تنخواہ آ گئی۔ میاں بیوی حساب کرنے بیٹھے۔ صبح کی مار کا بھی کچھ ذکر آیا۔ مگر روپیوں کی آوازیں دب کر رہ گیا۔ چلو صفائی ہو گئی۔

کچھ دنوں یونہی چلی۔ اس کے بعد پہلے جن چیزوں پر نظر بھی نہیں پڑتی تھی، وہ بنا ر فساد ہو گئیں۔ بیوی بچے میں لگی تھیں۔ میاں نے باورچی خانہ میں جا کر تقاضہ کیا۔ باہر نکلے تو بیوی سر ہو گئیں "تم باورچیخانہ میں کیوں گئے۔ مجھ سے کہا ہوتا۔ آخر میں مر گئی تھی۔ اسی واسطے، تو جوان ماماؤں کو گھر میں رکھنے سے ڈر لگتا ہے۔ خبر نہیں کہ یہ مردار کہاں سے آ گئی۔ کوئی بات تو ہے۔ جو فضیتے سنتی ہے اور نکلنے کا نام نہیں لیتی۔" میاں بھی خفا ہو گئے۔ بغیر کھائے دفتر چل دیئے۔ غصہ اور بھوک کی جھانجھ میں کئی اہلکاروں سے لڑ پڑے۔ صاحب سے بھی کچھ کچھ اُکھڑی اُکھڑی باتیں کیں۔ ایک آدھ دفعہ تو وہ ٹال گئے۔ دو ایک دفعہ ذرا ڈانٹ دیا۔ اسی طرح مُنہ پھلائے گھر آئے۔ آتے ہی بڑی غضبناک آوازمیں کھانا مانگا۔ بیوی نے چپکے سے کہا "اگر کھانا ہی تھا تو صبح ہی بھوک کے

کیوں گئے"۔ اس طعنہ نے غصہ اور بڑھا دیا۔ غلطی اپنی تھی۔ جواب کا کوئی پہلو نہ تھا۔ چپ ہو گئے۔ نوالہ جو منہ میں ڈالا تو نمک تیز۔ اب کیا تھا غصہ نکالنے کا موقعہ مل گیا۔ آپے سے باہر ہو گئے۔ رکابی جو اُٹھا کر پھینکی تو صحن میں گر کر چکنا چور ہو گئی۔ شوربے نے اس سرے سے اُس سرے تک خاصہ چھڑکاؤ کر دیا۔ میاں نے بیوی کو اور بیوی نے میاں کو بُرے بُرے دیدوں سے دیکھا۔ اتنے میں چھوٹے بچے کے رونے کی آواز آئی۔ بیوی تو اُدھر گئیں۔ میاں کپڑے پہن باہر چلے گئے۔ نہ معلوم کہاں کھانا کھایا۔ رات کو دس بجے گھر میں آکر پڑ رہے۔ صبح اُٹھ پھر نکل گئے۔ غرض اسی طرح کئی دن گذر گئے۔ بیوی نے ماما بچاری کو بلا وجہ نکال باہر کیا۔ خود کئی دن روٹی ٹھونکی۔ آخر بڑی مشکل سے ایک بڑھیا ملی۔ جس کے منہ میں دانت نہ پیٹ میں آنت۔ کچھ وہ پکاتی کچھ یہ ہاتھ بٹاتیں۔ غرض کسی نہ کسی طرح کام چلنے لگا۔ خدا جانے پھر کیوں کر میاں بیوی میں ملاپ ہو گیا۔ مگر ہو گیا۔

تھوڑے دنوں خاصی طرح گذری۔ مگر میاں کو یاروں کی صحبت کا چسکا پڑ گیا تھا۔ گھر میں ہر وقت پڑا رہنا موقوف ہوا۔ بچوں کی چیاؤں پیاؤں سے دل گھبرانے لگا۔ کبھی یار، ان کے گھر۔ کبھی یہ یاروں کے گھر۔ آخر ایک دن شروع ہو ہی گئی۔ رات کو بھی کیوں آگئے ہو۔ جہاں دن کو رہتے ہو رات کو بھی وہیں رہا کرو۔ یہ گھر اب گھر تھوڑا ہی رہا ہے۔ سرائے ہو گیا ہے۔ بیوی بچاری سے تو واسطہ ہی کیا ہے۔ بچوں کو بھی چھوڑ بیٹھو"۔ بھلا ایک کمانے والے پر یہ اعتراض ہوں اور وہ چپ رہے۔ انھوں نے بھی دل کا بخار نکالا۔ آخر تمھارے پاس بیٹھ کر بچے کھلایا کروں۔ یا آپ کی صاحبزادی کو جھولا جھلایا کروں۔ تم کو بچوں سے فرصت کب ہے جو میرا خیال کرو۔ اور خیال بھی کرو تو تم جیسوں کے ساتھ

کیا خاک دل بہلے۔ تمھارے ساتھ بات کرے تو کیا کرے الف کے نام بے نہیں جانتیں۔ ایک تو جاہل دوسرے پھوہڑ۔ ادھر گھر کا گھروا ہا کر رکھا ہے ادھر میں کچھ پڑھنے بیٹھا۔ اور تم نے ناک بھوں چڑھائی۔ آخر تمام دن تھکنے کے بعد کچھ تو دماغ کو آرام ملے۔ بچے ہیں کہ غل مچا مچا کر کان کھائے جاتے ہیں۔ تم ہو کہ لایعنی باتوں سے دماغ چاٹے جاتی ہو۔ اب یار، دوستوں میں تھوڑی دیر دل نہ بہلاؤں تو کیا کروں۔ یہاں بیٹھا رہوں تو دیوانہ ہو جاؤں۔ اچھا ہوتا جہاں تمھاری پہلے ٹھیری تھی وہیں ہو جاتی۔ چالیس روپے میں مہینہ بھر کاٹنا پڑتا جب حقیقت کھلتی۔ خدا کا شکر کرو۔ تین سو روپے مل رہے ہیں۔ بیگم صاحب بنی بیٹھی ہو۔" بیوی نے بھی طعنہ کا جواب طعنہ سے دیا۔" تو آخر کس نے ظلم کیا تھا۔ جو مجھ پھوہڑ پر یہ مہربانی فرمائی۔ کسی پڑھی لکھی کو بے کر آئے ہوتے۔ گھر بھی دولہن بنا رہتا۔ یار دوست بھی آتے جاتے۔ بیوی صاحبہ کچھ سعی سفارش بھی کرتی پھرتیں۔ تنخواہ بھی بڑھتی۔ ماشاء اللہ دنیا میں کچھ نام بھی روشن ہوتا۔ کس نے منع کیا ہے۔ اب اپنی مرضی کی کوئی لے آؤ۔ تمھاری بھی تو پہلے کسی سے ٹھیری ہوئی تھی۔ اُسی کو لے آؤ۔ دو سو روپیہ کی نوکر ہے۔ تین سو تمھارے۔ دو سو اُس کے۔ پانسو ہو گئے۔ نواب بنے پھرو گے۔ لوگ کچھ بکتے ہیں۔ بکنے دو سلیقہ مند ہے۔ پڑھی لکھی ہے۔ شام کو ہوا خوری کو نکلتی ہے چلمن اُٹھا دیتی ہے۔ اُٹھا دینے دو۔ تم کو تو آرام دے گی۔ اخبار پڑھ کر سنائے گی۔ کتابیں پڑھا کرے گی۔ ہر بات میں قائل معقول کرے گی۔ ہاں ذرا آپ نے کان ہلائے اور اُس نے گھر سے نکال باہر کیا۔ تم کو تو ایسی چاہیئے۔ ہم بیچاری بے زبانوں کو تم کیوں خاطر میں لانے لگے۔" چلو ہو گئی۔ میاں اپنا پلنگ لے باہر دیوان خانہ میں گئے کھاتے بھی باہر سوتے بھی باہر۔

اب دونوں کے دماغوں میں کھدر بدر شروع ہوئی۔ میاں سوچے چھوڑ دوں؟ نہیں بچے تباہ ہو جائیں گے۔ بیوقوف ہے کسی طرح نہیں سمجھتی ایک دن دو دن روز روز کا جھگڑا مجھ سے تو نہیں سہا جاتا۔ کچھ دیوانی ہوگئی ہے۔ لاحول ولا قوۃ۔ کس مصیبت میں پھنس گیا۔ خدا مغفرت کرے۔ یہ اماں جان کی عنایت ہے۔ مصر تھیں۔ میری بہن کی بیٹی لاؤ۔ لیجئے یہ بہن کی بیٹی آئی ہیں۔ اجی لعنت بھیجو۔ گذر ہی جائے گی۔ وہ بیچاری بھی کیا کرے۔ بچوں پر بچے ہوئے چلے جاتے ہیں۔ ایک کو سنبھالے۔ دو کو سنبھالے۔ آخر کس کس کو سنبھالے مگر بھئی زبان بڑی لمبی ہے۔ اس سے جی جلتا ہے۔"

بیوی علیحدہ پڑی سوچ رہی ہیں: "میکے چلی جاؤں۔ نہیں۔ وہ اور فراغت سے گلچھرے اڑائیں گے۔ وہ تو خدا سے چاہتے ہیں کہ کسی طرح یہ بلا دفع ہو۔ میکے میں کیا کہیں گے۔ لڑکر آئی ہے۔ ضرور اسی کا قصور ہے۔ کچھ زبان چلائی ہوگی۔ سب سے زیادہ بھائی جان سے ڈر لگتا ہے۔ کہیں فوجداری نہ کر بیٹھیں۔ میرا تو کچھ نہیں جاتا۔ بچے تباہ ہو جائیں گے۔ جاؤں خوشامد کر کے بلا لاؤں۔ نہیں اور شیر ہو جائیں گے۔ سمجھیں گے، ڈر گئی۔ تھوڑے دن یوں ہی چلنے دو۔ آپ ہی من جائیں گے۔ میکے تو نہیں جاتی۔ مجھ کو تو یہیں مرنا بھرنا ہے۔ سچ پوچھو تو قصور میرا ہی ہے۔ کیا کروں زبان نہیں رکتی۔ بیچارے سارے دن محنت کر کے آتے ہیں۔ گھر میں گھسے اور بچوں کی گڑبڑ۔ آخر آدمی کہاں تک سہے جائیں گے۔ یہ بچے بھی ایسے دلدر ہیں کہ خدا کی پناہ۔ خاصہ بھلا چنگا آدمی دیوانہ ہو جائے اچھا کل دیکھا جائے گا۔"

کل سے پرسوں اور پرسوں سے ہفتوں ہو گئے۔ ادھر میاں کو ضد آگئی۔ اُدھر بیوی کو ضد آگئی۔ غرض جو تصفیہ پہلے منٹوں میں، پھر دنوں میں اور

بعد میں ہفتوں میں ہوتا تھا وہ مہینوں میں بھی نہیں ہوا۔ یہاں یہ کھینچا تانی ہو رہی تھی کہ شہر میں انفلوئنزہ کا زور ہوا۔ پہلے بیوی کا نمبر آیا۔ بیمار پڑیں۔ علاج ہوئے اچھی ہوگئیں۔ مگر میاں کو نہ اندر آنا تھا نہ آئے۔ حکیم جی سے خیریت پوچھ لیتے۔ دوا درمن میں کمی نہ کرتے لیکن گھر میں قدم نہ رکھتے۔ بیوی اچھی ہوئی تھیں کہ میاں پڑے بخار ایک سو چار ایک سو پانچ رہتا۔ تکلیف ایسی کہ کسی کروٹ چین نہ آتا۔ پھر بھی اس اللہ کے بندے نے زنانہ کمرے کے دروازہ کا قفل نہ کھولنا تھا نہ کھولا بچاری بیوی سارے سارے دن اور ساری ساری رات کواڑوں سے لگی بیٹھی۔ دراڑوں میں سے جھانکا کرتی۔ چپکے چپکے روتی۔ گود پھیلا پھیلا کر دعائیں مانگتی۔ لیکن مردانہ کمرہ میں کسی طرح گھسنا نہ ملا۔ کچھ دن اس مصیبت میں گزرے آخر خدا خدا کر کے میاں کی طبیعت ذرا سنبھلی یہ ابھی پورے طرح اچھے نہ ہوئے تھے کہ چھوٹے لڑکے کو بخار چڑھا۔ اس بلا کا بخار تھا کہ الاماں۔ تین روز تک آنکھ نہیں کھولی۔ حکیم صاحب کا علاج چھوڑ۔ ڈاکٹر کا علاج شروع کیا چوتھے دن جو میاں نے ڈاکٹر صاحب سے حال پوچھا تو انھوں نے حالت نازک بتائی۔ کہا کہ "دونوں پھیپھڑے خراب ہو گئے ہیں۔ بیمار پر رات بہت بھاری ہوتی ہے۔ اگر رات گزر گئی تو صبح کچھ عرض کر سکوں گا۔" وہ تو یہ کہہ فیس لے۔ رخصت ہوئے۔ اور اُنھوں نے کمرہ میں ٹہلنا شروع کیا۔ ٹہلتے ٹہلتے رات ہوگئی کھانا بھی نہیں کھایا۔ گھڑی گھڑی زنانہ کمرہ کے دروازہ تک جاتے۔ دراڑوں میں سے جھانکتے۔ قفل کو ہاتھ میں لیتے۔ جیب میں سے کنجی نکالتے۔ پھر قفل چھوڑ کنجی جیب میں ڈال۔ ٹہلنے لگتے۔ جب تنفس کی آواز زیادہ بڑھنے لگی تو رہا نہ گیا قفل کھول آہستہ آہستہ نیچی نظریں کئے اندر گئے۔ دروازہ آہستہ سے بند کیا۔ دیکھا بیوی بچے کی پٹی سے لگی بیٹھی ہیں۔ اُنھوں نے آہٹ پاکر آنکھیں اونچی کیں۔ میاں کو دیکھ کر

کھڑی ہو گئیں۔ اُنھوں نے پوچھا "کتنا بخار ہے" کہا "ایک سو چھ" پوچھا "دوائی دی" کہا "ہاں ابھی دی ہے" پوچھا "نرس کہاں گئی" کہا "وہ خود بیمار ہو کر شام کو چلی گئی" اتنی باتیں کر یہ بھی دوسری پٹی سے لگ کر بیٹھ گئے۔ گھڑی گھڑی نبض پر ہاتھ رکھتے۔ بدن ایسا جل رہا تھا جیسے گرم توا۔ سانس ایسا چل رہا تھا جیسے دھونکنی۔ پوچھا "یہ حال کب سے ہے" کہا "کل سے۔ اس وقت طبیعت زیادہ خراب ہے۔ دیکھئے کیا ہوتا ہے" اتنے میں بچہ کے ہاتھ پاؤں کھنچنے شروع ہوئے دونوں گھبرا کر کھڑے ہو گئے۔ آنکھوں سے آنکھیں ملیں۔ آنسو آہستہ آہستہ خود بخود بہنے شروع ہوئے۔ بچہ کو ہچکی آئی اور ہچکی کے ساتھ ہی خاتمہ ہو گیا۔ بیوی کے ہاتھ پاؤں کانپنے لگے۔ سر چکرایا۔ اور ایک دل دوز آواز نکلی "ہائے میرا بچہ" میاں بھی لڑکھڑاتے ہوئے بیوی کے پاس آئے۔ گرتی ہوئی کو سنبھالا اور بھرائی ہوئی آواز میں کہا "بیگم صبر کرو۔ ہم لوگوں کی ضد وں نے یہ دن دکھایا" بیوی کے آنسوؤں سے میاں کا سینہ اور میاں کے آنسوؤں سے بیوی کا سر تر بتر ہو گئے۔ غم نے دونوں کے دلوں کو توڑ دیا مگر ساتھ ہی ساتھ ہمیشہ کے لئے جوڑ دیا۔

بات یہ تھی کہ دونوں غلطی پر تھے

پُرانی اور نئی تہذیب کی ٹکر

انگریزی کی ایک مثل ہے کہ "مشرق مشرق ہے اور مغرب مغرب، یہ دونوں نہ ملیں ہیں نہ ملیں گے" جس طرح یہ صحیح ہے اسی طرح یہ مثل بھی صحیح ہونی چاہیے کہ "ماضی ماضی ہے اور حال حال، یہ دونوں نہ ملے ہیں اور نہ ملیں گے" لیکن خدانخواستہ اگر ان کی ٹکر ہو گئی، تو سمجھ لیجیے کہ وہی مصیبتیں پیش آئیں گی، جو مجھ غریب کو پیش آئیں۔ وہ کیا کیا مصیبتیں تھیں اُن کو بھی سُن لیجیے۔ واقعات از سرتاپا غلط سہی مگر پڑھنے کی حد تک ان کو سچ جانئے اور یقین کیجیے۔ ورنہ پڑھنے میں خاک مزا نہ آئے گا۔ اگر آپ اس پر تیار ہیں، تو بسم اللہ آگے چلئے۔

آؤ حضرت تمھیں بھی دکھلاویں

سیر ماضی کی اس زمانہ میں

سنہ اُنیس سو کچھ میں، ہم نے تعلیم سے فراغت پائی اب نوکری کی تلاش ہوئی ایک ریاست میں (نام کی جگہ صفر) ہمارے خاندانی تعلقات تھے۔ اس لئے کالج سے نکل سیدھا ادھر کا رخ کیا۔ یہاں پہنچے، تو کسی نے کہا کہ نوکری کرو کسی نے کہا کہ تعلیم جاری رکھو، چونکہ کالج کا خیال دل سے ابھی تک محو نہیں ہوا تھا اور وہاں کی صحبتیں پیش نظر تھیں اس لئے طبیعت نے اسی تجویز کو پسند کیا اور ہم بھی اس دوسری پارٹی کے ساتھ ہو گئے۔ خدا کی قدرت دیکھو کہ صورت بھی خود بخود پیدا ہو گئی۔

اس ریاست میں میرے ایک عزیز ایک بہت ہی بڑے عہدہ پر تھے

لوٹ :۔ یہ مضمون بالکل فرضی ہے۔ کوئی صاحب اس کو اپنے سے متعلق نہ فرمائیں :۔

انھوں نے مجھ سے کہا "ارے میاں میں ایک ترکیب بتاتا ہوں، یہاں کے ایک امیر اپنے چھوٹے صاحبزادے کو تعلیم کے لئے علیگڈھ بھیج رہے ہیں، میرا اُن کے ہاں بہت اثر ہے۔ اگر کہو، تو تم کو اس لڑکے کا اتالیق بنا کر بھیجنے کے لئے کہہ دوں۔ تمھاری تعلیم مفت میں ہو جائے گی اور سب سے بڑی بات یہ ہے کہ یہ نواب صاحب بڑے رسوخ کے آدمی ہیں، واپسی کے بعد تمھیں کوئی جگہ بھی مل جائے گی" میں نے کہا آپ کو اختیار" دوسرے تیسرے ہی روز انھوں نے مجھے بلا کر کہا "لو سب معاملہ ٹھیک ٹھاک ہو گیا میں نے نواب صاحب سے تمھارے متعلق سب تصفیہ کر لیا ہے مگر وہ چاہتے ہیں کہ چند روز تم کو اپنے پاس رکھ کر تمھاری طبیعت کا اندازہ کر لیں، تم کو کبھی پرانی وضع کے نوابوں میں رہنے کا اتفاق نہیں ہوا تم بھی اس عرصہ میں ان کی نشست و برخاست کے اور ادب آداب کے سلیقے سیکھ جاؤ گے۔ چھوٹے صاحبزادے صاحب کی طبیعت کا رنگ بھی معلوم ہو جائے گا۔ اور انشاء اللہ اس طرح تم کچھ فائدہ ہی میں رہو گے" میں راضی ہو گیا۔ قرار پایا کہ سہ پہر کو اُن کے مددگار صاحب لے جا کر مجھے نواب صاحب کی خدمت میں پہنچا دیں، اور تعارف بھی کرا دیں۔

اب آپ نواب صاحب کے نام کی جگہ نقطے سمجھ لیجے۔ اور مددگار صاحب کے اسم شریف پر لکیر کھینچ دیجئے۔ کیونکہ آپ جانتے ہیں کہ سچی بات ہمیشہ بری معلوم ہوتی ہے کہیں نام بتا کر میں خود مصیبت میں نہ پھنس جاؤں۔ اس لئے بہتر یہی ہے کہ۔

خوشتر آں باشد کہ سر دلبراں
گفتہ آید در حدیث دیگراں

بہر حال ڈیڑھ بجے ہی سے ہم نہا دھو، کپڑے بدل، سیاہ ٹرکش کوٹ

ڈانٹ۔ دستار پہن۔ اور بگلوس باندھ تیار ہو گئے۔ یہاں ننگے سر رہنے کی عادت تھی۔ دستار سر پر بار ہو گئی۔ اگرچہ "شملہ بمقدار علم" کے لحاظ سے اس دستار کا بوجھ کچھ زیادہ نہ تھا۔ پھر بھی رہ رہ کر یہی جی چاہتا تھا کہ اس کو الگ ہی رہنے دو۔ اُتار کر رکھ دو اور ننگے سر ہی چلے چلو۔ مگر کیا کیا جاتا۔ وہ نواب صاحب پرانی وضع کے ایسے دل دادہ تھے کہ ننگے سر جانا یقیناً خالی ہاتھ آنے کی صورت اختیار کر لیتا اس لئے "قہر درویش برجان درویش" سمجھ کر اس بار کو اُٹھانا ہی پڑا۔ ابھی دستار کا تصفیہ پوری طرح نہ ہوا تھا کہ بگلوس نے ستانا شروع کیا بیٹی باندھتے عمر گذری تھی۔ مگر کوٹ کے نیچے پیٹی باندھتے تھے نہ کوٹ کے اوپر۔ کوٹ کے اوپر باندھنے کا نتیجہ یہ ہوا کہ ادھر ہاتھ ہلا اور اُدھر کوٹ بگلوس کے اوپر گولا بن گیا دامن پکڑ کر نیچے گھسیٹا۔ برابر کیا۔ پھر تھوڑی دیر کے بعد وہی مشکل پیش آئی۔ اور پھر اسی ترکیب سے رفع کی۔ ہم اسی کش مکش میں تھے کہ مددگار صاحب اپنی وکٹوریہ میں آہی گئے۔ اور ہم کوٹ کا دامن نیچے کھینچتے اور دستار کو درست کرتے، گاڑی میں جا بیٹھے۔ چلتے چلتے آندھ آ گئی۔ آخر خدا خدا کر کے نواب صاحب کا مکان آیا۔ گاڑی سے اُترے، آگے مددگار صاحب اور پیچھے ہم، نواب صاحب کی عالی شان اور پُر تکلف کوٹھی میں داخل ہو گئے۔ تین بج چکے تھے مگر معلوم ہوا کہ ابھی نواب صاحب آرام میں ہیں۔ اس لئے دونوں کے دونوں بلیرڈ روم میں بیٹھ گئے۔ تھوڑی دیر کے بعد رپورٹر ایجنسی کی طرح اطلاعات کا سلسلہ شروع ہوا۔ پہلے خبر آئی کہ نواب صاحب بیدار ہوئے۔ پھر اطلاع آئی کہ آنکھیں ملتے مسہری سے اُٹھے۔ پھر کہا گیا کہ ہاتھ دھو رہے ہیں۔ پھر معلوم ہوا کہ منہ دھو رہے ہیں۔ چوبدار پر چوبدار آتے اور بیان کرتے کہ اب یہ ہو رہا ہے۔ اب یہ ہو رہا ہے۔ یہاں تک کہ یہ پرچہ لگا کہ اب شیروانی کی آستین میں ہاتھ

ڈالا ہے۔ یہ خبر آئی تھی کہ کمرہ کا رنگ ہی بدل گیا۔ یا تو ہم ٹڑوں ٹوں دو ہی آدمی بیٹھے تھے یا سارا کمرہ آدمیوں سے بھر گیا۔ کوئی اِدھر سے آیا کوئی اُدھر سے۔ کوئی اس کمرہ سے نکلا کوئی اُس کمرہ سے۔ غرض اتنے بڑے کمرہ میں تل رکھنے کی جگہ نہ رہی۔ مددگار صاحب سے سب کی صاحب سلامت تھی۔ نواب صاحب ان کو بہت چاہتے تھے۔ پھر بھلا مصاحبوں کا کیا حوصلہ تھا جو ان سے جھک کر نہ ملتے۔ البتہ مجھ کو دیکھ کر ذرا کھنچتے تھے۔ اکثروں نے اپنی ناکیں ذرا ذرا اوپر چڑھا کر چھوڑ دیں۔ بعضوں کی پیشانی پر بل بھی آیا۔ مگر جب مددگار صاحب نے میرا تعارف کرایا اور یہ بتایا کہ میں کس خاندان سے ہوں۔ تو ذرا ٹھنڈک پڑی ایک صاحب کہنے لگے "سبحان اللہ اس خاندان کا کیا کہنا۔ آفتاب ہے آفتاب ارے بھئی میر صاحب تم نہیں جانتے۔ ان کے دادا صاحب قبلہ مرحوم و مغفور کی لکھنؤ میں کیا قدر تھی۔ واللہ عجیب آدمی تھے۔ اور بھئی دیکھنا ذرا ان کی شکل مرزا صاحب مرحوم سے کتنی ملتی ہے۔ میں نے تو اُن کو بڑھاپے میں دیکھا ہے واللہ عین جوانی میں ایسے ہی ہوں گے"۔ مجھ کو یہ دیکھ کر بڑا تعجب ہوا کہ تقریباً سب کے سب مصاحب لکھنؤ کے رہنے والے تھے بہر حال یہ باتیں ہو رہی تھیں کہ ایک چوبدار نے آکر اطلاع دی کہ سرکار برآمد ہونے والے ہیں۔ یہ سننا تھا کہ سب کے سب اپنی دستاریں سنبھالتے کپڑوں کو ٹھیک کرتے اور بگلوس باندھتے باہر نکل آئے۔ اب تھوڑا سا اس مکان کا نقشہ بھی سُن لیجئے۔ کوٹھی کیا ہے کسی بڑے بادشاہ کا محل ہے۔ قیامت کی کرسی ہے۔ سامنے بہت بڑا میدان ہے۔ اس میں سے ایک چوڑی سڑک چکر کھاتی ہوئی سیڑھیوں تک آتی ہے۔ سیڑھیوں کے بعد صحن چبوترہ۔ اور صحن چبوترہ کے بعد پھر سیڑھیاں ہیں۔ اور یہیں سے کئی منزلہ ......

مردانہ مکان شروع ہوتا ہے۔ پہلی منزل میں پرانا دقیانوسی سامان بھرا ہوا ہے ان کمروں کے سامنے جو برآمدہ ہے اُس میں چند ٹوٹی پھوٹی کرسیاں لاوارث حاجتمندوں کے لئے پڑی رہتی ہیں۔ ان کرسیوں سے مجھ کو بھی واسطہ پڑا ہے اس کا ذکر آیندہ کروں گا۔ جو بڑی سڑک چکر کھا کے محل سرا کے دروازے کو گئی ہے۔ وہ بلیرڈ روم کے سامنے سے گذرتی ہے اور یہاں اتنی چوڑی ہوگئی ہے کہ اچھا خاصہ صحن نکل آیا ہے۔ بلیرڈ روم کے بالکل سامنے دوسری منزل سے نیچے آنے کا زینہ اور اُس کے بائیں طرف اوپر کے بڑے کمرہ کے سامنے چھوٹا سا چھجّہ ہے۔ چھجّہ کے اوپر نہایت خوبصورت نیچی سی منڈیر ہے۔ بس میرے مضمون کے لئے مکان کا اسی قدر ہی نقشہ بالکل کافی ہے۔

خیر، تو ہم سب یہ سُن کر کہ نواب صاحب برآمد ہونے والے ہیں۔ کمرہ سے باہر نکل آئے اور اس طرح لائن باندھ کر کھڑے ہوئے کہ یہ چھجّہ ہمارے بالکل سامنے تھا۔ بلیرڈ روم ہمارے بائیں طرف اور زینہ ہمارے دائیں جانب ہر شخص کی نظر اس چھجہ پر لگی ہوئی تھی کہ ایک ہی دفعہ چوبدار نے آواز دی "آداب بجا لاؤ" اس آواز کے سنتے ہی سب تو ایک دفعہ ہی رکوع میں گئے۔ مگر میں نے جھکنے سے پہلے ایک چلتی سی نظر نواب صاحب پر ڈال لی۔ کیا دیکھتا ہوں کہ نواب صاحب چھجہ پر کھڑے ہیں۔ بالکل اسی طرح کہ گویا فوٹو اتروا رہے ہیں۔ میں نے ولایت کی ایک مشہور تصویر دیکھی ہے جس میں ایک بارہ سنگھے کو پہاڑ کی چوٹی پر نہایت اکڑ کر کھڑے ہوئے دکھایا گیا ہے۔ اس کے نیچے لکھا ہے۔

Ian the monurch of oll I suruey

بس سمجھ لو کہ وہی رنگ تھا۔ نیچے صرف یہ لکھنا باقی تھا۔

"جدھر دیکھتا ہوں اُدھر میں ہی میں ہوں"

یہ غلط انداز نظر ڈالنے کے بعد میں بھی تسلیم کو جھکا۔ ہماری اصطلاح میں "سلام کرنا" محض ماتھے کے سامنے ہاتھ لے جانے کو کہتے ہیں میں نے سوچا کہ یہ بڑے آدمی ہیں۔ ذرا جھک کر اس فرض کو ادا کر دو۔ جھکا۔ سلام کیا۔ اور سیدھا کھڑا ہو گیا۔ لیکن اِدھر اُدھر جو دیکھتا ہوں تو سب لوگ جھکے ہوئے زناژن ہاتھ چلا رہے ہیں "نقل را چہ عقل" میں نے بھی غپ رکوع میں جا، پٹا کے ہاتھ چلانے شروع کر دیے۔ مگر کن انکھیوں سے دوسروں کو دیکھتا رہا۔ جب دیکھا کہ اب سب سیدھے ہو گئے تو میں نے بھی سیدھے کھڑے ہو کر نیت کی طرح ہاتھ باندھ لئے۔

مگر حضرات آپ ہنستے کیوں ہیں، کیا۔ عید کی نماز میں اپنی حالت بھول گئے؟ آپ ہر سال نماز پڑھتے ہوں گے۔ مگر ہر مرتبہ تکبیر کے وقت خدا کے فضل سے اِدھر اُدھر دیکھنا ہی پڑتا ہو گا کہ دوسروں کے ہاتھ کھلے ہوئے ہیں یا بندھے ہوئے۔ دوسرے رکوع میں جا رہے ہیں یا ابھی اور کوئی تکبیر باقی ہے میں نے پہلے ہی عرض کر دیا تھا کہ پرانی اور نئی تہذیب کی ٹکر ہمیشہ ایسی ہی الجھنیں پیدا کرتی کرتی ہیں، پھر آپ کا میرے حال پر مسکرانا یقیناً بے جا ہے۔

جب اس تسلیمات کے جھگڑے سے نجات پا کر میں نے اوپر نظر کی تو کیا دیکھتا ہوں کہ نواب صاحب کھڑے مسکرا رہے ہیں۔ سمجھ گیا کہ ہو نہ ہو یہ میری حرکت کا اثر ہے۔ جی میں تو آیا کہ لاحول ولا قوۃ تو کس مصیبت میں پڑا، چل گھر چل پھر سوچا کہ ذرا یہاں کا رنگ بھی دیکھ لو۔ نئی چیز ہمیشہ اچھی معلوم ہوتی ہے، اس لطف کا بھی مزہ اٹھا لو۔ میں اسی ادھیڑ بن میں تھا کہ نواب صاحب نے فرمایا۔ "اوہو۔ یہ ہمارے چھوٹے میاں کے ماسٹر صاحب ہیں؟ چلو چھٹی ہوئی۔ خدا نے خود تعارف کرا دیا۔ مددگار صاحب نے کہا، جی ہاں۔" نواب صاحب مسکراتے ہوئے نیچے اتر آئے۔ میری تعلیم کا حال پوچھا۔ میں نے بیان کیا۔ میرے خاندان سے

بہت اچھی طرح واقف تھے۔ نام بنام ایک ایک کا ذکر کرتے اور تعریف کرتے غرض ان ہی باتوں میں شام ہوگئی۔ جب سب رخصت ہونے لگے تو فرمایا۔ "ماسٹر صاحب آپ دونوں وقت آیا کیجئے۔ میں عموماً یہیں ہوتا ہوں اگر یہاں نہ بھی ہوا۔ تو جہاں ہوں گا چوب دار آپ کو پہنچا دیں گے"۔ دربار برخاست ہوا اور سب لوگ بگلوس کھولتے ہوئے بلیرڈ روم میں داخل ہوئے۔ ایک صاحب مجھ سے کہنے لگے "ماسٹر صاحب آپ نواب صاحب کو مخاطب کرنے میں ہمیشہ "آپ آپ" کہتے ہیں، یہ صحیح نہیں ہے" میں نے کہا "آپ نہ کہوں تو کیا "تم" کہوں؟ اُردو میں تو "آپ" ہی تعظیم کا لفظ ہے"۔ کہنے لگے "نہیں "سرکار" کہئے، "خداوند نعمت" کہئے۔ "خاوند" کہئے" میں نے کہا میر صاحب یہ موٹے موٹے لفظ تو مجھ سے ادا ہونے مشکل ہیں۔ ہاں کل سے "سرکار" کہنے کی کوشش کروں گا۔ مگر خدا معلوم زبان کو لفظ "سرکار" سے کیا چڑھ تھی کہ کبھی یہ لفظ منہ سے نہ نکلنا تھا نہ نکلا۔ اور ہمیشہ "جنابِ عالی" اور "جنابِ والا" ہی سے کام چلا گیا۔

ایک دوسرے صاحب فرمانے لگے "ماسٹر صاحب آپ کا دولت خانہ بہت دور ہے صبح آجایا کیجئے۔ دوپہر کا خاصہ یہیں تناول فرمائیے۔ شام کو تشریف لیجایا کیجئے۔ ایک کمرہ میں آپ کے بیٹھنے اُٹھنے کا انتظام کئے دیتے ہیں" میں نے کہا "حضرت یہ دوسروں کے مکان میں آپ انتظام کرنے والے کون؟ اگر نواب صاحب کو میرے ٹھہرانے کا خیال ہوتا۔ تو وہ خود ہی فرما دیتے۔ خدا میری بائیسکل کو سلامت رکھے۔ میرے لئے دُور اور نزدیک سب برابر ہیں"۔ وہ بیچارے شرما کر خاموش ہو گئے۔ چلتے چلتے ہم نے دربار کے اوقات بھی پوچھ لئے۔ معلوم ہوا کہ صبح کے نو بجے سے گیارہ بجے تک اور شام کے تین ساڑھے تین بجے سے سات آٹھ بجے تک نواب صاحب برآمد رہتے ہیں۔

دوسرے روز ہم صبح ساڑھے آٹھ ہی بجے سے پہنچ گئے۔ ایک چوب دار سے پوچھا کہ "نواب صاحب کس طرف برآمد ہونگے"؟ اس نے کہا "میرے ساتھ آئیے" ہم ساتھ ہو گئے۔ اُس نے لیجا برآمدہ کی اُن ہی ٹوٹی ہوئی کرسیوں پر بٹھا دیا جس کا میں نے کہیں اوپر ذکر کیا ہے۔ بیٹھے بیٹھے اُکتا گیا۔ نواب صاحب نہ آج نکلتے ہیں نہ کل۔ جو چوبدار اِدھر سے نکلتا اس سے پوچھتا کہ "بھئی نواب صاحب آج برآمد ہونگے بھی یا نہیں"؟ وہ یہی کہہ کر چلا جاتا کہ "آپ تشریف رکھئے۔ ابھی یاد ہوتی ہے"۔ جب ایک کرسی پر بیٹھتے بیٹھتے تھک جاتا تو اُٹھ کر دوسری پر جا بیٹھتا ایک تو ٹوٹی ہوئی کرسیاں۔ دوسرے اس طرح جم کے بیٹھنے کی عادت نہیں تیسرے تنہائی کی کوفت غرض کیا کہوں کہ کیا حال ہوا۔ جیب سے گھڑی نکالتا دیکھ لیتا۔ ادھر پاؤں بیٹھے بیٹھے سُن ہو گئے۔ اُدھر دستار کے بوجھ اور بنگلوس کے دباؤ نے پریشان کر دیا۔ اور ایک ایک منٹ کاٹنا مشکل ہو گیا۔ آخر خدا خدا کر کے دن کے بارہ بجے کی توپ چلی۔ اس وقت ایک چوبدار نے آ کر کہا "اب آپ جائیے سرکار محل میں تشریف لے گئے۔ شام کو آئیے گا تو ملاقات ہو گی"۔ کیا بتاؤں کس قدر غصہ آیا لیکن چجز بز ہو کر رہ گیا۔ آخر اپنی جگہ سے اُٹھا اور سائیکل سنبھال گھر آیا۔ شام کو جانے کا ارادہ نہ تھا مگر لوگوں کے کہنے سننے سے پھر پہنچا۔ ایک چوبدار نے لیجا کر پھر اُن ہی کرسیوں پر بٹھا دیا۔ خیال تھا کہ شاید اس مرتبہ مشکل آسان ہو گی۔ مگر وہاں کون کس کو پوچھتا تھا۔ بیٹھے بیٹھے شام کے چھ بج گئے۔ اس وقت میں نے دل میں کہا۔ "حضرت اگر یوں ہی ہاتھ پاؤں توڑے بیٹھے رہے تو تمام عمر بھی نواب صاحب کو اطلاع نہ ہو گی۔ چلو بغیر اطلاع ہی پہونچ جائیں راستہ تو معلوم ہے۔ ہو نہ ہو۔ نواب صاحب اسی طرف ہوں گے۔ جدھر کل تھے۔ زیادہ سے زیادہ یہ ہو گا کہ بلا اطلاع چلے آنے پر خفا ہو جائیں گے۔ خفا ہوتے ہیں تو ہو جائیں تم روٹھے

ہم چھوٹے؟" یہ سوچ کرسی سے اُٹھا۔ کمرہ میں سے ہو۔ بلیرڈ روم میں آیا۔ یہاں نواب صاحب کی آواز صاف آرہی تھی۔ اسی آواز کی سیدھ پر چلا۔ دیکھا تو کمرہ کے باہر ہی نواب صاحب اور اُن کے سب مصاحب کھڑے ہیں۔ میں بھی جا تسلیمات بجالایا۔ اس مرتبہ اُس پڑھے ہوئے سبق کو ذرا اچھی طرح دُہرایا۔ پُرانے مشاقوں کی طرح ہاتھ میں لوچ تو نہ تھا۔ بلا سے نہ ہو مگر ہاتھ کے جھٹکے سات کے بجائے ان گنت دے ڈالے۔ جب اس کارروائی سے فارغ ہوا تو نواب صاحب مسکرا کر کہنے لگے "اجی ماسٹر صاحب! آپ صبح کو کہاں غائب رہے؟ مجھ کو تو آپ کا بڑا انتظار رہا۔" میں نے کہا "جناب عالی! میں تو صبح کو بھی آیا تھا۔ مگر کسی نے اطلاع ہی نہیں کی۔ آخر بارہ بجے چلا گیا۔ اب بھی وہی صورت پیش آتی اگر میں خود بغیر اطلاع نہ چلا آتا۔" یہ سن کر نواب صاحب کو بہت غصہ آیا۔ کہنے لگے "آپ آئے تھے۔ اور مجھے اطلاع نہیں دی گئی۔ اس کے کیا معنی۔ میں نے کل ہی کہہ دیا تھا کہ میں جہاں کہیں ہوں آپ کی اطلاع کردی جائے۔" میں نے کہا "دیکھئے وہ چوبدار صاحب جو پیچھے کھڑے ہیں انھوں نے ہی مجھے وہاں ٹوٹی ہوئی کرسیوں پر لے جاکر بٹھایا تھا۔ اور کہا تھا کہ "ابھی سرکار برآمد نہیں ہوئے۔" کئی دفعہ یہ بعد میں اُدھر سے گذرے بھی مگر ہمیشہ میرے پوچھنے پر یہی جواب دیا کہ "ابھی عرض کردیتا ہوں۔" اور وہ جو اُن کے برابر کھڑے ہیں خدا جھوٹ نہ بلوائے تو آٹھ دس مرتبہ اُن سے کہا مگر انھوں نے صرف گردن کے جھٹکے ہی پر ٹالا۔" غرض میں نے ایک ایک کو رے ڈالا۔ جتنے چوب دار تھے سب نیلی پیلی آنکھوں سے میری طرف دیکھ رہے تھے۔ مگر میں نے جب تک سب کی خبر نہ لے لی۔ چپکا نہ ہوا۔ ایک چوبدار نواب صاحب کے بہت مُنہ چڑھے ہوئے تھے۔ وہ کچھ ہمت کرکے آگے بڑھے اور ہاتھ باندھ کر

کہا "سرکار" مگر میں نے اُن کو آگے چلنے نہ دیا اور کہا "کیا سرکار سرکار لگائی ہے کوئی بات میں نے غلط کہی ہے جس کی اب آپ صحت فرمار ہے ہیں بس خاموش رہو اس طرح باتوں میں دخل دینا تمھارا کام نہیں ہے" وہ پھر کچھ کہنا چاہتے تھے کہ میں نے "خاموش" اس زور سے کہا کہ وہ گھبرا کر پیچھے ہٹ گئے بیچارے سمجھے ہوں گے کہ کہیں یہ حضرت زبان سے ہاتھ پر نہ اتر آئیں؟ پہلے تو نواب صاحب کی پیشانی پر کچھ بل آئے مگر پھر ہنسنے لگے۔ سمجھے ہوں گے پرانی اور نئی تہذیب کی ٹکر ہے۔ مگر اس روز سے چوب داروں کا یہ حال ہو گیا کہ میری شکل سے گھبراتے تھے۔ میں گیا۔ اور وہ کہتے ہوئے دوڑے کہ "آئیے آئیے" نواب صاحب کہیں ہوں مجھے فوراً ہی پہنچا دیتے۔ نواب صاحب کے چاہیتے چوبدار صاحب تو ایسے پریشان ہو گئے تھے کہ اگر میں جاتا اور نواب صاحب واقعی محل میں ہوتے، تو مجھ سے کہتے کہ "ماسٹر صاحب! سرکار محل سے ابھی برآمد نہیں ہوئے۔ آپ جا کر خود کمرہ دیکھ لیجئے۔ ایسا نہ ہو کہ آپ سمجھیں میں غلط عرض کر رہا ہوں"

علم مجلس کا رنگ جیسا میں نے یہاں دیکھا، نہ پہلے کبھی دیکھا نہ دیکھنے کی آرزو ہے۔ اس نوابی دربار میں میری صاف گوئی بعض وقت عجیب رنگ لاتی تھی۔ ایک روز شام کے وقت دربار گرم تھا کہ دو سائیس صاف ستھری وردیاں پہنے۔ ریشمی باگ ڈوریں ہاتھ میں لئے۔ ایک خوبصورت گھوڑے کو ملاحظہ کے لئے لائے۔ یہ گھوڑا اُسی دن آسٹریلیا سے آیا تھا۔ اور نواب صاحب نے کوئی تین ہزار روپیہ کو خریدا تھا۔ گھوڑے کو نواب صاحب نے اپنے ہاتھ سے شکر کھلائی۔ کچھ پڑھ کر اس کی پیشانی پر دم کیا اور کہا "بھئی عجیب چنچل ہے" بس اتنا سننا تھا کہ مصاحبوں نے تعریفوں کے پُل باندھ دیئے۔ گھوڑے کا

مقابلہ براق اور رف رف تک سے کر ڈالا۔ غرض دو گھنٹے تک یہی بے سرو پا گفتگو ہوتی رہی۔ شامت اعمال دیکھو کہ نواب صاحب کا ایک اور گھوڑا تھا۔ اُس کو یہ بہت ہی چاہتے تھے۔ جب تعریفوں کی کوئی انتہا نہ رہی اور نواب صاحب کو ڈر ہوا کہ کہیں میرا پیارا گھوڑا اس نئے گھوڑے سے نہ دب جائے۔ تو انھوں نے کہا "یہ سب کچھ مگر ہمارے گھوڑے (نام بتانا گویا سارے راز کا انکشاف کرنا ہے) سے اچھا تھوڑی ہو سکتا ہے؟" یہاں تو سب سرکار کے نوکر تھے بیگن کے نوکر تو تھے ہی نہیں۔ فوراً بدل گئے۔ ایک صاحب کہنے لگے "خداوند نعمت! بھلا گھوڑوں کے تذکرہ میں اس کو کیسے لایا جا سکتا ہے۔ وہ گھوڑا تھوڑی ہے، وہ تو انسان ہے انسان!!" ان کا اتنا کہنا تھا کہ بس لوگوں کو گفتگو کا سلسلہ مل گیا۔ اب کیا تھا۔ اس دوسرے گھوڑے کی تعریف میں زمین و آسمان کے قلابے ملا دیئے۔ جب کہیں جا کر نواب صاحب کو تسکین ہوئی۔ اس طرف سے ذرا فراغت پائی، تو نواب صاحب نے میری طرف دیکھ کر ارشاد فرمایا "مرزا صاحب! آپ نے اس گھوڑے کے متعلق کچھ نہیں کہا" میں نے عرض کی "جناب عالی! مجھے نہ اس بارے میں کوئی واقفیت ہے اور نہ تعریف کرنے کے لئے الفاظ۔ میں سرے سے گھوڑے پر چڑھنا ہی نہیں جانتا۔ سائیکل پر سوار ہوتا ہوں۔ اس کا ایک ایک پرزہ پہچانتا ہوں۔ ماشاء اللہ جب اتنے واقف کار لوگ تعریف کر رہے ہیں تو گھوڑا اچھا ہی ہوگا اگر سچ پوچھئے تو میں اس گفتگو میں یہ بھی نہیں سمجھا کہ گھوڑے کے کس کس جوڑ بند کی تعریف ہو رہی ہے۔" نواب صاحب یہ سُن کر مسکرانے لگے۔ خیر، ان ہی باتوں میں کوئی آٹھ بج گئے۔ اور دربار برخاست ہوا۔ اب دوسرے دن شام کا ذکر سنئے کہ نواب صاحب نے حکم دیا "ہمارا نیا گھوڑا لاؤ۔" سائیں اسی طرح بنا سنوار کر گھوڑے کو لائے۔ مگر بجائے چلنے

کے وہ پھدکتا ہوا آیا۔ چار ٹانگ کے گھوڑے کی جگہ تین ٹانگ کا گھوڑا رہ گیا۔ یہ دیکھنا تھا کہ نواب آگ بگولا ہو گئے۔ اور اس سرے سے اُس سرے تک سارے سائیسوں کو اور کوچوانوں کو ڈالا۔ مصاحبوں نے بھی ہاں میں ہاں ملائی۔ ایک صاحب نے اس ٹانگ ٹوٹنے کو جادو کا اثر بتایا۔ دوسرے نے سائیس کی لاپروائی کو سبب ٹھہرایا۔ غرض جتنے منہ اتنی باتیں۔ مگر آخر کار بغلبۂ آرا یہ تصفیہ ہوا کہ دوسرے گھوڑے کے سائیسوں نے جل کر اس کی ٹانگ توڑ ڈالی ہے۔ قرار پایا کہ تمام سائیس یک قلم موقوف۔ میں نے جو ان غریبوں پر بلا وجہ آفت آتے دیکھی تو مجھ سے نہ رہا گیا آگے بڑھ کر کہا "جناب والا! کل تعریفوں کے جوش میں خیال نہیں فرمایا گیا کہ یہ گھوڑا لنگڑا ہے۔ اگر ذرا غور سے گھوڑے کو ملاحظہ فرمایا گیا ہوتا تو کل ہی معلوم ہو جاتا کہ یہ گھوڑا تین ٹانگ کا ہے۔ کل بھی چلنے میں یہ ایک پاؤں پر زور نہیں دیتا تھا"۔ میرا یہ کہنا تھا کہ جتنے لوگ وہاں کھڑے تھے سب نے بُرے بُرے دیدوں سے میری طرف دیکھا لیکن کچھ کہنے کی کسی کو ہمت نہ ہوئی۔ جانتے تھے کہ جھاڑ کا کانٹا ہو کر کہیں لپٹ نہ جائے۔ نواب صاحب کو بھی ذرا برا معلوم ہوا کہنے لگے "ماسٹر صاحب! اگر آپ کو معلوم ہوا تھا کہ گھوڑا لنگ کرتا ہے تو کل ہی کیوں نہ کہا؟" میں نے کہا "جناب عالی! جب اتنے حضرات تعریف کر رہے ہوں تو بھلا میری کیا مجال ہے جو ان سب کے خلاف ایک حرف بھی زبان سے نکال سکوں۔ اگر یہ حضرات گھوڑے کی تعریف کے بجائے میری مذمت پر اُتر آتے تو میں ان سے کہاں چھپا چھپا پھرتا۔ پھرتا۔ میں سمجھا کہ گھوڑے کا لنگڑا پن بھی کوئی تعریف ہے جو اس کی طرف توجہ نہیں کی جاتی"۔ نواب صاحب نے فرمایا "ان سے نہیں تو چپکے سے مجھ ہی سے کہہ دیا ہوتا"۔ میں نے کہا "عالی جناب کو تعریفیں سننے ہی سے کب فرصت تھی جو مجھے کچھ عرض کرنے کا

موقع ملتا؛ قصہ مختصر سارا الزام میرے سر منڈھ دیا گیا لیکن خدا کا شکر ہے کہ بیچارے سائیسوں پر سے آئی ہوئی بلا ٹل گئی جب مصاحبوں کو یہ یقین ہوگیا کہ ماسٹر صاحب کے پاؤں یہاں جم گئے۔ تو انھوں نے بھی مجھ سے راہ و رسم بڑھانی شروع کی۔ بلاتے پاس بٹھلاتے۔ پان کھلاتے۔ اِدھر اُدھر کی غپیں اُڑتیں شعر وسخن کے چرچے رہتے۔ غرض کچھ دنوں اچھی گذری۔ میں اُس زمانہ میں تحت اللفظ خوب پڑھتا تھا۔ سب نے صلاح دی کہ نواب صاحب کی مجلسوں میں تم بھی دو ایک مرثیے پڑھو۔ نواب صاحب سُن کر بہت خوش ہوں گے۔ میں راضی ہوگیا۔ چند ہی روز بعد محرم آگیا نواب صاحب کو شاید کسی نے اطلاع کر دی۔ انھوں نے فرمایا "ماسٹر صاحب! آپ بھی مجلسوں میں شریک ہوا کیجئے"۔ میں نے کہا "بہت خوب"۔ دوسرے روز شام کے ۶ بجے مجلس میں شریک ہوا۔ مجلس زنانہ مکان میں ہوئی۔ اندر پردہ ہوگیا۔ محل سرا کے وسط میں جو عمارت ہے اُس کے دالانوں میں پردے ڈال کر دو حصے کر دیے۔ ایک حصہ میں مردانہ، دوسرے میں زنانہ۔ اندر کا حال تو معلوم نہیں۔ مگر مردانہ حصے کا کل فرش سیاہ تھا۔ چاندنیاں سیاہ۔ گاؤ تکیے سیاہ۔ قالین سیاہ۔ ممبر سیاہ۔ یہاں تک کہ تمام گھر والوں کا سارے کا سارا لباس دستار سے لگا کر جرابوں تک سیاہ۔ نواب صاحب ممبر کے سامنے قالین پر گاؤ تکیہ لگا کر اور تمام صاحب زادے اُن کے کچھ اِدھر کچھ اُدھر بیٹھ گئے۔ چھوٹی صاحبزادی صاحبہ تھیں وہ نواب صاحب کے پہلو میں آبیٹھیں اور اشارے کے ساتھ ہی مجلس شروع ہوئی۔ پہلے سوز خوانی ہوئی۔ یہ نہ پوچھو کہ کس طرح ہوئی۔ کئی سوز خوان تھے۔ شاید ہی کسی کو چند منٹ پڑھنے کو دیے ہوں تو دیے ہوں۔ نہیں تو جس کو اور جہاں کہیں نواب صاحب نے چاہا روک دیا۔ روکنے کے لئے صرف ہاتھ کا اشارہ کیا جاتا تھا کہ "بس"۔ ایک صاحب چار مصرع پڑھنے

کے بعد ٹیپ اُٹھانا چاہتے تھے کہ "بس" کا اشارہ ہوا اور اُن کی آواز کو ہدھم سے پنچم پر جانا نصیب نہ ہوا جب یہ جماعت ختم ہوئی تو تحت اللفظ پڑھنے والوں کی باری آئی۔ کسی نے خوش قسمتی سے چار پانچ بند پڑھ لئے تو کمال کیا ورنہ دو ہی بندوں پر بند کر دیئے گئے۔ اس سلسلہ کے ختم ہونے کے بعد حلقہ کا ماتم شروع ہوا۔ ماتم کے بعد ہی مجلس ختم ہوئی باہر نکل کر سب نے اصرار کیا کہ کل آپ بھی پڑھیں۔" میں نے کہا حضرت میں مجلس کا رنگ دیکھ چکا۔ بھلا ایسے پڑھنے میں کیا لطف اور سننے میں کیا مزا۔ مجھے تو معاف ہی فرمائیے" مصاحبین میں ایک میر صاحب تھے۔ بڑے مزے دار آدمی تھے، کہنے لگے: "مرزا صاحب! آج جن لوگوں نے پڑھا وہ پڑھنا نہیں جانتے۔ کل میں دکھاؤں گا کہ کیونکر پڑھتے ہیں۔ دیکھوں تو نواب صاحب بیچ میں کیونکر روک دیتے ہیں۔" دوسرے دن جب میر صاحب کی باری آئی تو انھوں نے مرثیہ کو بجائے ابتداسے پڑھنے کے وسط سے شروع کیا، اور پہلے ہی بند پر میدان میں اُتر آئے۔ مرثیہ واقعی اچھا تھا۔ سب لوگ نہایت غور سے سُن رہے تھے۔ میر صاحب نے تلوار تول کر اُٹھائی۔ چاہتے تھے کہ ہاتھ ماریں۔ کہ "بس" کا اشارہ ہوا۔ ادھر میر صاحب تلوار علم کئے ہوئے ممبر سے نیچے تشریف لے آئے۔ اس کے بعد سب نے مجھ پر زور دیا کہ پڑھو۔ میں نے صاف انکار کر دیا۔ نواب صاحب نے بھی ایک آدھ دفعہ اشارتاً فرمایا۔ مگر میں ٹال گیا۔ اور اس طرح سنتے ہی سُنتے یہ مجلسیں ختم ہوگئیں۔

محرم کی تیرھویں یا چودھویں تاریخ تھی۔ صبح ۹ بجے کا وقت تھا۔ دربار جما ہوا تھا۔ معلوم نہیں۔ کیوں۔ ایک دفعہ ہی نواب کو کچھ خیال آگیا۔ حکم دیا کہ "ہمارے جواہر خانہ سے چھوٹا صندوقچہ لاؤ" چوب دار صندوقچہ لے آیا۔

اوپر کارچوبی کام سے لپا ہوا سبز مخمل کا غلاف اندر ہاتھی دانت کا صندوقچہ صندوقچہ پر گنگا جمنی جالی کا کام۔ ایسی خوبصورت چیز تھی کہ کیا کہوں؟ نواب صاحب نے صندوقچہ کھولا۔ پہلے ایک انگوٹھی نکالی۔ اس کو دیکھا بھالا اور رکھ دیا اس کے بعد سونے کی ایک جڑاؤ گھڑی نکالی۔ اس کو بھی اُلٹ پلٹ کر دیکھا اور رکھ دیا پھر ایک چھوٹے چھوٹے دانوں کی تسبیح نکالی۔ اچھی طرح دیکھی بھالی اور ہاتھ میری طرف بڑھایا میں سمجھا کہ مجھے دکھانے کو دیتے ہیں میں نے تسبیح لیکر خوب غور سے دیکھا مگر میری سمجھ میں نہ آیا کہ شیشہ ہے یا زمرّد۔ دیکھنے کے بعد جس طرح لی تھی اسی طرح واپس کردی اور کہا "جناب والا! مجھے جواہر کی پرکھ نہیں، ممکن ہے زمرد ہو کسی جوہری کو دکھائیے۔ وہ مجھ سے بہتر بتا سکے گا۔" نواب صاحب نے مسکرا کر تسبیح صندوقچہ میں بند کی اور صندوقچہ واپس بھیج دیا۔

جب دربار برخاست ہوا تو یار لوگوں نے میرا مذاق اُڑانا شروع کیا کہ واہ ماسٹر صاحب! خوب سمجھے۔ اجی حضرت! تسبیح آپ کو سرفراز ہوئی تھی۔ آپ نے غضب کیا کہ واپس کردی، سلام کرکے لے لیتے۔ نذر گذرانتے۔ بھلا ایسے موقعے کہیں روز روز ملتے ہیں؟ ہم کو دیکھنے کے لئے بھی کوئی چیز دی جاتی ہے تو ہم سلام کرکے اپنی کر لیتے ہیں۔" میں نے کہا "حضرت! یہ لوٹ مار آپ ہی کو مبارک ہو۔ اگر نواب صاحب کا ارادہ تسبیح دینے ہی کا تھا تو زبان کس نے بند کی تھی؟ بھلا میری عمر دیکھو اور تسبیح کی سرفرازی دیکھو۔ اس بے جوڑ عطا کا مطلب بغیر سمجھائے سمجھنا میرے لئے دشوار ہی نہیں ناممکن تھا۔"

اس واقعہ کے چند ہی روز بعد سے ہمارے علی گڑھ جانے کی تیاریاں شروع ہو گئیں۔ گھر میں کیا کیا انتظامات ہوئے اس کا علم تو اللہ کو ہے، ہاں باہر جو کچھ لاؤ لشکر جمع کیا گیا ہے اس کا حال سُن لیجئے۔

ایک روز شام کے چار بجے کے قریب چھوٹے صاحبزادے محل سرا سے باہر تشریف لائے۔ نواب صاحب نے فرمایا۔ "بادشاہ۔ لو۔ اب تم جو چیزیں ساتھ لے جانا چاہتے ہو، چھانٹ لو۔ ماسٹر صاحب بھی موجود ہیں۔ یہ بھی اس انتخاب میں مدد دیں گے۔" سب سے پہلے گاڑی گھوڑوں کا انتخاب شروع ہوا، پڑھنے جارہے تھے، پھر بھی نواب کے بیٹے تھے۔ اللہ کے فضل سے چار گاڑیاں اور چھ گھوڑے پسند کئے۔ اس کے بعد ملازمین کے چھانٹنے کی باری آئی۔ چار خدمتگار، دو پاؤں دبانے والے۔ ایک کہانی کہنے والا۔ دو باورچی۔ آٹھ سائیس اس طرح خدا جھوٹ نہ بلوائے تو کوئی بیس پچیس آدمی منتخب ہوئے جب نوبت یہاں تک پہونچی تو مجھ سے نہ رہا گیا۔ میں نے کہا جناب والا! یہ صاحبزادے صاحب پڑھنے جارہے ہیں یا کہانیاں سننے اور پاؤں دبوانے؟ یہ گاڑیاں گھوڑے استعمال کے لئے جارہے ہیں یا پروسیشن نکالنے؟ بھلا اس لاؤ لشکر کے ساتھ تعلیم کیا خاک ہوگی۔" جن صاحب کا انتخاب اس بہیر وبنگاہ کی نگرانی کے لئے ہوا تھا وہ بگڑ کر بولے۔ "ماسٹر صاحب! نواب صاحب کے صاحبزادے تعلیم کے لئے جارہے ہیں۔ میری یا آپ کے بچے نہیں جارہے ہیں کہ ایک صندوق اُٹھایا اور نکل کھڑے ہوئے۔" میں نے کہا "اور ہاں جناب عالی! یہ بھی تو بتادیا جائے کہ خیر، میں تو صاحبزادے صاحب کا اتالیق بن کر جارہا ہوں، کیا یہ حضرت میرے اتالیق ہوکر تشریف لیجارہے ہیں"؟ ان کے لئے تو میرا ایک ہی فقرہ کافی تھا۔ بیچارے خاموش ہوگئے جب میں نے دیکھا کہ طوطی کی آواز نقارخانہ میں کوئی نہیں سنتا تو میں بھی لاحول پڑھ کر خاموش ہوگیا۔

اس واقعہ کو تین روز گذر گئے۔ ایک دن رات کو جب آٹھ بجے کے قریب دربار برخاست ہونے لگا تو نواب صاحب نے میری طرف دیکھ کر فرمایا۔

"ماسٹر صاحب! آج رات کو ہم سب چھوٹے میاں کو پہنچانے کے لئے علی گڑھ جا رہے ہیں۔ آپ بھی دو بجے اسٹیشن پر آجائیے۔" میں نے عرض کی عالی جناب! میں نے ابھی تک چلنے کی نہ کوئی تیاری کی ہے اور نہ میں ایسے فوری حکم کے لئے خود تیار تھا۔ آپ تشریف لے جائیے۔ میں انشاء اللہ دو تین روز بعد پہنچ جاؤں گا۔" الغرض یہ تصفیہ ہوا کہ تیسرے روز میں یہاں سے روانہ ہوں اور اس وقت تک نواب صاحب وہیں تشریف فرما رہیں۔

دوسرے روز صبح ہی میں نے روانگی کی تیاریاں شروع کیں۔ شام کو مددگار صاحب سے ملنے گیا۔ اُن سے معلوم ہوا کہ نواب صاحب دو تین ہی اسٹیشن گئے تھے کہ نزلہ شروع ہو گیا۔ اور وہ مع مصاحبین واپس تشریف لے آئے۔ مگر صاحبزادے صاحب اور ان کا لشکر آگے چلا گیا۔ مددگار سے مل کر میں نواب صاحب کے ہاں گیا۔ دیکھا خاصے بھلے چنگے ہیں۔ ایک آدھ چھینک آگئی تھی۔ ڈر ہوا کہ کہیں نمونیا نہ ہو جائے۔ اس لئے واپس تشریف لے آئے۔ دوسرے دن پھر گیا تو نواب صاحب نے ایک تار میرے ہاتھ میں دیا۔ صاحبزادے صاحب کا تار تھا لکھا تھا کہ کالج والوں نے تمام ملازمین اور گاڑی گھوڑوں کو بورڈنگ میں رکھنے سے انکار کر دیا ہے۔ اور ہدایت کی ہے کہ اگر اس کالج میں رہنا ہے تو صرف ایک اتالیق اور ایک نوکر کے ساتھ آکر رہو۔ ورنہ کوئی دوسرا کالج تلاش کرو۔" اس تار نے تمام مصاحبین میں ایک جوش پھیلا دیا۔ کوئی کہتا تھا کہ "خداوند نعمت! یہ تجارت پیشہ لوگ ہیں بھلا یہ کیا جانیں کہ نوابوں کے لڑکے کس طرح رہتے ہیں اور کس طرح تعلیم پاتے ہیں؟ یہ تو گدھے گھوڑے دونوں کو ایک لاٹھی ہانکتے ہیں۔ خدا کے واسطے صاحبزادے صاحب کو بلوا لیجئے۔ ایسا نہ ہو کہ کہیں اُن کے دشمن

بیمار پڑ جائیں۔" میں نے کہا، "میر صاحب! جب نوابی ہی کرنی ہے تو پڑھانے سے فائدہ؟ نواب بن کر نہیں پڑھا جاتا۔ طالب علم بن کر پڑھا جاتا ہے۔ صاحبزادے صاحب کو اگر نواب صاحب بالکل میرے سپرد کریں تو میں دو ہی برس میں دکھاؤں کہ کیا سے کیا ہوگیا۔" یہ باتیں ہو ہی رہی تھیں کہ دوسرا تار آیا: "میں اکیلا نہیں رہ سکتا۔ واپسی کی اجازت دی جائے۔" میں نے بہتیرا اسرار کیا مگر میری ایک نہ چلی اور تار دے دیا گیا کہ "فوراً چلے آؤ۔" جب طالب علم ہی نہ رہا تو اتالیق کیسا۔ میں نواب صاحب کو اُس روز جو آخری سلام کر کے آیا تو وہ دن اور آج کا دن پھر کبھی نہیں گیا۔ مدتیں گذر گئیں۔ بھول گئے ہوں گے۔ مجھے پُرانی اور نئی تہذیب کی یہ ٹکر ہمیشہ یاد رہے گی۔

تم ہمیں بھول گئے ہو صاحب
ہم تمھیں یاد کیا کرتے ہیں

مُردہ بدستِ زندہ

زمانہ نے خلوص دلوں سے مٹا دیا ہے۔ سچی محبت کی جگہ ظاہرداری نے لے لی ہے۔ نہ اب جینے میں کوئی سچے دل سے کسی کا ساتھ دیتا ہے اور نہ مرنے کے بعد قبر تک دلی درد کے ساتھ جاتا ہے۔ غرض دنیاداری ہی دنیاداری رہ گئی ہے۔ پہلے کوئی ہمسایہ بھی مرتا تھا تو ایسا رنج ہوتا تھا گویا اپنا عزیز مر گیا ہے۔ اب کوئی اپنا بھی مر جائے تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ غیر مر گیا۔ جنازہ کے ساتھ جانا اب رسمًا رہ گیا ہے۔ صرف اس لئے چلے جاتے ہیں کہ لوگ یہ نہ کہیں کہ "واہ جیتے جی تو دوستی و محبت کا دم بھرا جاتا تھا۔ مرنے کے بعد پھر کر بھی نہ دیکھا کہ کون مر گیا۔" اب رہی دل کی حالت تو اس کا بس خدا ہی مالک ہے۔ آیئے، میرے ساتھ آیئے۔ آج کل کی میتوں کا رنگ بھی دکھا دوں۔

یہ لیجئے۔ سامنے ہی مکان میں کسی صاحب کا انتقال ہو گیا ہے۔ کوئی بڑے شخص ہیں سینکڑوں آدمی جمع ہیں۔ موٹریں بھی ہیں۔ گاڑیاں بھی ہیں۔ غریب بھی ہیں۔ امیر بھی ہیں۔ بیچارے غریب تو اندر جا بیٹھے ہیں۔ کچھ پڑھ بھی رہے ہیں جتنے امیر ہیں وہ یا تو اپنی اپنی سواریوں میں بیٹھے ہیں۔ یا دروازہ پر کھڑے سگریٹ پی رہے ہیں۔ جو غریب آتا ہے وہ سلام کرتا ہوا اندر چلا جاتا ہے۔ جو امیر آتا ہے وہ ان باہر والوں ہی میں مل کر کھڑا ہو جاتا ہے پہلا سوال یہی ہوتا ہے "کیا مر گئے؟ بھئی ہمارے تو بڑے دوست تھے۔" اتنا کہا اور اپنی جیب سے سگریٹ کا بکس یا پانوں کی ڈبیا نکالی لیجئے تعزیت ختم ہوئی اور رنج دلی کا اظہار ہو چکا۔ اب دنیا بھر کے قصے چھڑے۔ ایک دوسرے

سے نہ ملنے کی شکایت ہوئی۔ دفتر کی کارروائیاں دریافت کی گئیں۔ ملک کی خبروں پر رائے زنی ہوئی۔ غرض اس بات چیت کا یہاں تک سلسلہ کھنچا کہ مکان سے جنازہ نکل آیا۔ یہ دیکھتے ہی دروازہ کی بھیڑ چھٹ گئی۔ کچھ اِدھر ہو گئے کچھ اُدھر آگے آگے جنازہ ہے۔ اُس کے پیچھے پیچھے یہ سب لوگ ہیں۔ ابھی چند قدم ہی چلے ہوں گے کہ ان ساتھ والوں میں تقسیم ہونی شروع ہوئی۔ اور چپ چاپ اس طرح ہوئی کہ کسی کو معلوم بھی نہ ہوا کہ کب ہوئی اور کیونکر ہوئی جن کو پیچھے رہنا تھا انھوں نے چال آہستہ کر دی جنھیں ساتھ جانا تھا وہ ذرا تیز چلے۔ غرض ہوتے ہوتے یہ ساتھ والے تین حصوں میں بٹ گئے۔ آگے تو وہ رہے جو مرنے والے کے عزیز تھے یا جن کو جنازہ اُٹھانے کے لئے اُجرت پر بلایا گیا تھا۔ اس کے پیچھے وہ لوگ رہے جن کے پاس یا تو سواریاں نہ تھیں یا شرما شرمی پیدل ہی جانا مناسب سمجھتے تھے۔ آخر میں وہ طبقہ ہوا جو آہستہ آہستہ پیچھے ہٹتا ہٹتا اپنی سواریوں تک پہنچ گیا اور اُن میں سوار ہو گیا۔ اگر پیدل چلنے والوں میں کوئی عہدہ دار ہیں تو غرض مندوں سے ان کو یہاں بھی چھٹکارا نہیں۔ ایک آیا جھک کر سلام کیا۔ گھر بھر کی مزاج پرسی کی۔ مرنے والے کے کچھ واقعات بیان کئے۔ اگر ڈاکٹر کا علاج تھا تو ڈاکٹری کی برائیاں کیں۔ اگر حکیم کے علاج سے مرا ہے تو طبابت کی خرابیاں ظاہر کیں۔ اور اسی سلسلہ میں اپنے واقعات بھی بیان کر گئے۔ ان سے پیچھا نہ چھٹا تھا کہ دوسرے صاحب آ گئے اور انھوں نے بھی وہی دنیا بھر کے قصے شروع کئے۔ غرض اسی طرح جوڑی بدلتے بدلتے مسجد تک پہنچ ہی گئے۔

یہاں ہمراہیوں کی پھر تقسیم ہوتی ہے۔ ایک تو وہ ہیں جو ہمیشہ نماز پڑھتے ہیں۔ اور اب بھی پڑھیں گے اور دوسرے وہ ہیں جو نہا دھو کپڑے بدل خاص اسی جنازہ کے لئے آئے ہیں۔ تیسرے وہ ہیں جو اپنی وضعداری پر قائم ہیں یعنی نماز نہ کبھی

پڑھی ہے اور نہ اب پڑھیں گے۔ دور سے مسجد کو دیکھا اور انھوں نے پیچھے ہٹنا شروع کیا۔ جنازہ مسجد تک پہنچا بھی نہ تھا کہ ان کو کسی دیوار کسی موٹر یا کسی گاڑی کی آڑ مل گئی، یہ وہیں کھڑے ہو گئے۔ اور سگریٹ پی کر یا پان کھا کر انھوں نے وقت گذار دیا۔ ہاں اس بات کا انتظام رکھا کہ نماز ختم ہونے کی اطلاع فوراً مل جائے۔ اُدھر نماز ختم ہوئی اُدھر یہ لوگ مسجد کے دروازہ کی طرف بڑھے اُدھر جنازہ نکلا ادھر یہ پہنچے۔ بس یہی معلوم ہوتا ہے کہ یہ بھی نماز پڑھ کر مسجد ہی سے نکل رہے ہیں۔

یہ تو ساتھ والوں کا حال ہوا۔ اب راستہ والوں کی سنئے۔ اگر میّت کے ساتھ صرف دو چار آدمی ہیں تو کوئی پوچھتا بھی نہیں کہ کون جیا کون مرا۔ اگر جنازہ کے ساتھ بڑے بڑے لوگ ہوئے تو دوکان والے ہیں کہ ننگے پاؤں بھاگے چلے آرہے ہیں۔ آئے۔ مرنے والے کا نام پوچھا۔ مرض دریافت کیا اور واپس ہو گئے۔ گویا میونسپل کمیٹی نے رجسٹر حیات و ممات ان ہی کو تفویض کر دیا ہے۔ اور یہ صرف اس لئے نام پوچھنے آئے تھے کہ رجسٹر میں سے مرنے والے کا نام خارج کر دیں۔ موٹر نشینوں کی کچھ نہ پوچھو۔ یہ تو سمجھتے ہیں کہ سڑکیں انہی کے لئے بنی ہیں کسی جنازہ کا سڑک پر سے گذرنا ان کو زہر معلوم ہوتا ہے۔ اور کیوں نہ ہو موٹر کی رفتار دھیمی کرنی پڑتی ہے۔ اور ظاہر ہے کہ رفتار کم ہونے سے پٹرول کا نقصان ہے۔ کسی کو کیا حق ہے کہ مر کر ان کے پٹرول کا نقصان کرے۔ شوفر ہے کہ ہارن پر ہارن بجا رہا ہے۔ لوگ ہیں کہ اِدھر سے اُدھر بھاگ رہے ہیں۔ جنازہ ہے کہ ٹیڑھا ترچھا ہو رہا ہے مگر موٹر والے صاحب کی موٹر جس رفتار سے آرہی ہے اسی رفتار سے نکلے گی اور ضرور نکلے گی۔ یہ لوگ تو وہ ہیں کہ قیامت آئے گی تو اس کو بھی ہارن بجا بجا کر سامنے سے ہٹانے کی

فکر کریں گے۔ خیر کسی نہ کسی طرح یہ تمام مصیبتیں اُٹھا کر جنازہ قبرستان میں پہنچ ہی گیا۔

قبرستانوں کی حالت پر جتنا افسوس کیا جائے کم ہے۔ جائے عبرت کو جائے وحشت بنا دیا ہے۔ قبرستان کیا ہے خاصہ ایک جنگل ہے۔ ایک طرف ٹوٹی پھوٹی ایک جھونپڑی پڑی ہے۔ اس میں ایک سقے صاحب۔ اُن کی بیوی۔ دس بارہ بچے۔ پانچ چھ بکریاں۔ ایک لنگڑا ٹٹو۔ سو دو سو مرغیاں، پانچ چھ بلیاں۔ اور خدا معلوم کیا کیا بلیات بھرے پڑے ہیں۔ جس حصے میں قبریں ہیں وہاں کی گھانس بڑھ کر کمر کمر ہوگئی ہے۔ دیواروں کو توڑ کر لوگوں نے راستے بنا لئے ہیں نیم پیپل اور خدا معلوم کس کس قسم کے درخت قبروں کے تعویذ اور چبوترے توڑ کر نکل آئے ہیں۔ کوئی قبر دھنس کر کنواں بن گئی ہے۔ کسی کا تعویذ ہی غائب ہے کسی چبوترے کی اینٹیں نکل کر جھونپڑی میں خرچ ہوگئی ہیں۔ غرض کس مپرسی نے اس حصہ کی عجیب حالت کر دی ہے۔ دوسرا حصہ جس میں قبریں نہیں ہیں وہ کسی قدر صاف ہے اور کیوں نہ ہو۔ پہلے حصہ کا مردوں سے تعلق ہے اور دوسرے کا زندوں سے مُردے تو اپنی قبر کی مرمت کرنے یا کرانے سے رہے۔ ان کے جو عزیز ہیں وہ سمجھتے ہیں کہ اس فضول چیز پر کون کچھ خرچ کرے جن کی زمین ہے وہ تو روپے کھرے کر چکے۔ اب ان کو اس سے کیا تعلق۔ دوسرے حصہ کا صاف رکھا جانا اصول تجارت پر مبنی ہے۔ جب گاہکوں کو گھیرنے کے لئے دوکاندار ایک ایک چیز جھاڑ پونچھ کر رکھتا ہے تو یہ قبرستان والے اپنی پچاس روپے گز والی زمین کو کیوں صاف نہ رکھیں۔ خریدتے وقت اچھا مال دیکھ لو، پھر تم جانو اور تمھارے مردے جانیں

میاں سقہ رہتے تو قبرستان میں ہیں مگر ہمیشہ پھولوں کی سیج پر سوتے ہیں۔ ادھر لوگ قبر پر پھول چڑھا کر گئے اور اُدھر ان کے بچے سب کے سب سمیٹ لائے رات بھر یہ پھول بستر پر رہے۔ صبح باسی پھول لے جا کر پھر قبر پر چڑھا دیئے۔ خیر کیا حرج ہے؟

زندوں کا کام بھی نکل گیا۔ مردے بھی خوش ہو گئے۔ اس گھر میں پل بٹّا خریدنے کی کبھی نوبت نہیں آئی۔ قبر کے اچھے سے اچھے پتھر پر مصالحہ پیس لیا۔ اگر کچھ دنوں کوئی دیکھنے بھالنے نہ آیا تو پتھر اُکھاڑ جھونپڑی کے پاس لا رکھا۔ بکریاں قبروں پر قلانچیں مارتی پھرتی ہیں۔ مرغیاں کچی قبروں کو کرید رہی ہیں۔ بچّے یا تو چبوتروں پر لوٹ مار رہے ہیں یا تعویذوں کو گھوڑا بنائے بیٹھے ہیں۔ بچیاں قبروں پر بیٹھی اینٹیں اور ٹھیکرے پیس رہی ہیں۔ کسی بیچارے کی قبر پر چادر پڑی ہے اُس پر بی سقنی نے گیہوں سکھانے ڈال دیئے ہیں۔ ٹٹوانی کو ایک اگلی اور ایک پچھلی ٹانگ باندھ کر چھوڑ دیا ہے۔ وہ قبروں پر گھاس چرتی پھرتی ہے۔ اس کے اِدھر اُدھر بھُدکنے سے کسی قبر کی اینٹ گری کسی کا چونا گرا کسی کا پتھر گرا۔ اگر ایسے ہی چار پانچ گھوڑے چھوڑ دیئے جائیں تو تھوڑے ہی دنوں میں وہی منظر بن جائے جو زلزلہ کے بعد کانگڑے کا ہو گیا تھا۔

جنازہ قبرستان میں کیا گیا فوج میں ترم بج گیا۔ سقّے کا سارا خاندان اپنا اپنا کام چھوڑ، جھونپڑی میں گھُسا۔ اور اناج لینے کو برتن لے۔ لائن باندھ کر آ بیٹھا۔ کسی کے ہاتھ میں بے پیندے کا تام چینی کا کٹورہ ہے تو کسی کے پاس ٹوٹی رکابی۔ کسی کے پاس مٹی کا پیالہ ہے تو کسی کے ہاتھ میں ٹوٹا ہوا چھاج۔ سچ ہے خدا رزاق ہے۔ قبرستان والوں کو بھی گھر بیٹھے رزق پہنچاتا ہے۔

یہ تو قبرستان والوں کی حالت ہوئی۔ اب ساتھ والوں کی کیفیت سنئے جنازہ لاکر لب گور رکھ دیا گیا۔ ایک آتا ہے قبر کو جھانک جاتا ہے۔ دوسرا آتا ہے۔ جھانک جاتا ہے۔ ہر شخص کو زمین سخت ہونے کی شکایت ہے۔ کوئی مزدوروں کو سست کہتا ہے۔ کوئی پٹاؤ کا نقص بتاتا ہے۔ کوئی قبرستان والے کو برا کہتا ہے۔ جب اس ریویو سے بھی فراغت پائی تو دو دو تین تین آدمی ایک

ایک قبر پر جا بیٹھے۔ چبوترہ کو تخت بنایا۔ اور تعویذ کو گاؤ تکیہ۔ اور لگے سگریٹ اور بیڑی کا دم لگانے۔ کسی نے سقے سے چلم بھرنے کی فرمایش کی۔ اُس نے حقہ تازہ کر سُلفہ بھر حاضر کیا۔ حقے مزے لے لے کر پئے جا رہے ہیں۔ ایک دوسرے کی تواضع کی جا رہی ہے، سُلفہ پر سُلفہ بھروایا جاتا ہے۔ اور یہ وقت کسی نہ کسی طرح کاٹا جاتا ہے۔ یہ توفیق نہیں ہوتی کہ کچھ خدا کی یاد کریں۔ یا ان خفتگانِ خاک کی حالت کو دیکھ کر عبرت ہی حاصل کریں۔

بعض لوگ ہیں کہ گھانس سے بچتے بچاتے۔ قبروں پر کودتے پھاندتے چلے جا رہے ہیں۔ یہ کون ہیں؟ یہ وہ صاحب ہیں جن کے مرے ہوئے عزیزوں کے آج دن پھرے ہیں۔ یوں تو خدانخواستہ فاتحہ کو کیوں آنے لگے۔ آج شرما شرمی قبرستان میں آ گئے ہیں۔ بمفت کرم داشتن کی صورت ہے۔ چلو فاتحہ بھی پڑھ لیتے ہیں۔ اس کے بعد جب کوئی دوسرا عزیز یا دوست مرے گا تو پھر دیکھا جائے گا۔

ایک صاحب ہیں کہ قبروں کے کتبے ہی پڑھتے پھر رہے ہیں، کچھ نوٹ بھی کرتے جاتے ہیں۔ کوئی اچھا کتبہ مل گیا تو اپنے دوستوں کو بھی آواز دے کر بلا لیا۔ اور بجائے فاتحہ کے دادِ سخن گوئی دی گئی۔ کچھ اپنا کلام سنایا گیا، کچھ اُن کا سُنا۔ غرض کوئی نہ کوئی مشغلہ وقت گذارنے کو نکال ہی لیا۔

جو لوگ چبوتروں پر متمکن ہیں، اُن کی کچھ نہ پوچھو۔ ہر چبوترہ ایک پارلیمنٹ ہے اور ہر قبر ایک کانگریس کا اجلاس۔ دُنیا بھر کی خبروں پر تنقیح و تنقید ہو رہی ہے دفتر کی کارروائیوں پر بحث ہو رہی ہے۔ افواہوں کے ذرائع اور اُن کی تصدیق و تردید کی جا رہی ہے۔ سفارشیں ہو رہی ہیں۔ وعدے لئے جا رہے ہیں۔ غرض سب کچھ ہو رہا ہے۔ نہیں ہو رہا ہے تو وہ؟ جو ہونا چاہیئے۔ اور جس غرض سے ساتھ آئے ہیں۔

خیر خدا خدا کر کے خبر آئی کہ قبر تیار ہے۔ کچھ تو اُٹھ کر قبر کے گرد جا کھڑے ہوئے۔ کچھ وہیں بیٹھے رہ گئے۔ ایک صاحب نے قبر میں اُتر کر گلاب اور عود چھڑکا۔ ایک نے میت کے اوپر کی چادر سمیٹی۔ چادریں بل دیئے۔ دو صاحبوں نے مٹھے کے سرے پکڑ کر میت کو اُٹھایا۔ آٹھ دس نے غل مچایا "سنبھال کے۔ میت بھاری ہے۔ کمر کے نیچے چادر دو۔ ارے میاں اپنی طرف گھسیٹو۔ ہاں آہستہ سے آہستہ سے" اب میت قبر کے منہ تک آگئی۔ فقیروں یا یوں کہو کہ مفت خوروں کو اناج تقسیم ہونے لگا۔ اور قبر کے گرد جو لوگ کھڑے تھے انھوں نے بے تحاشا غل مچانا شروع کیا۔ کوئی کہتا ہے "ذرا کمر کی چادر کھینچو۔ ارے بھئی اتنا بھی دم نہیں ہے۔ دیکھنا کہیں قبر کا پاکھا نہ گرے۔ ہاں۔ ہاں۔ ذرا اور جھکا کر۔ لاالہ الا اللہ میت بھاری ہے۔ ذرا سنبھال کے۔ آہستہ۔ آہستہ۔ بس بھئی بس" کوئی چیخ رہا ہے "مٹھے کے بندھن کھول دو۔ ارے میاں۔ لو۔ یہ ڈھیلا لو۔ سر کے نیچے رکھ کر منہ قبلہ کی طرف تو کر دو۔ واہ بھئی واہ۔ اتنا بھی نہیں آتا۔ ابھی منہ پورا نہیں پھرا۔ بس بھئی بس"

یہ مختلف فقرے ایک کی زبان سے نہیں نکلتے کہ کچھ سمجھ میں بھی آئے۔ ہر شخص ہے کہ غل مچا رہا ہے۔ جو بیچارے قبر میں اُترے ہیں وہ پریشان ہیں کہ کیا کریں، کیا نہ کریں بہر حال اس غل غپاڑے کے ساتھ دوست واحباب اس مرنے والے کو پہلی منزل تک پہنچا ہی دیتے ہیں۔ اب پٹاؤ کی نوبت آتی ہے۔ اس بھی وہی گڑبڑ شروع ہوتی ہے۔ کوئی کہتا ہے "یہ کڑی نہیں وہ کڑی لو" کوئی کہتا ہے لاحول ولاقوۃ۔ مفت میں سو روپے مارلئے۔ اور کڑیاں دیں تو ایسی" غرض کوئی کچھ کہتا ہے۔ کوئی کچھ۔ اور اسی گڑبڑ میں پٹاؤ بھی ہو جاتا ہے اور مٹی دینے کی نوبت آتی ہے۔ مٹی تو ہر ایک دیتا ہے۔ منہ سے بھی ہر ایک بڑبڑاتا ہے لیکن

یہ خدا ہی کو معلوم ہے کہ جو پڑھنا چاہیئے وہ پڑھتا بھی ہے یا نہیں۔ البتہ لفظ "منہا" بہت اونچی آواز میں کہا جاتا ہے اور باقی سب الفاظ منہ ہی منہ میں ختم کردیے جاتے ہیں۔ جب اس کام سے فراغت پائی اور قبر تیار ہوگئی تو فاتحہ کی نوبت آئی۔ ساتھ آنے والوں میں کوئی بھی ایسا نہ ہوگا جو اس میں شریک نہ ہو ہونٹ تو سب کے ہلتے ہیں مگر شاید سو میں بیس بھی نہ ہوں گے جو یہ جانتے ہوں کہ فاتحہ میں کیا کیا سورتیں پڑھتے ہیں۔ فاتحہ پڑھتے ہی سب کو اپنے اپنے گھر جانے کی سوجھی۔ یہ بھی پھر کر نہ دیکھا کہ مرنے والے کے اعزہ کون ہیں اور ان کی کیا حالت ہے۔ ہاں ان بیچاروں کو گھیرتے ہیں تو جنازہ لانے والے مزدور، گھر سے چکا کر لائے تھے مگر یہاں آکر وہ بھی پاؤں پھیلاتے ہیں۔ کبھی تو کہتے ہیں کہ "فاصلہ بہت تھا" کبھی کہتے ہیں کہ "آپ کی وجہ سے دوسری میت کو چھوڑ کر آئے ہیں، وہاں آپ کے ہاں سے دگنا مل رہا تھا" بہرحال ان مصیبت زدوں کو دق کر کے یہ مزدور کچھ زیادہ ہی لے مرتے ہیں۔

دیکھ لیا آپ نے اس زمانہ کی میت کا رنگ۔ جو میں نے عرض کیا تھا وہ صحیح نکلا یا نہیں؟ اب سوائے اس کے کیا کہوں کہ خدا سے دعا کی جائے کہ اللہ اپنے ان بندوں کو نیک ہدایت دے۔ ان کے دل میں درد پیدا کرے۔ یہ سمجھیں کہ احکام کیا ہیں؟ اور ہم کیا کر رہے ہیں۔

غلام

خدا بہتر جانتا ہے کہ مجھ کو کس غرض کی تکمیل اور کس خیال کو پیش نظر رکھ کر پیدا کیا گیا ہے؟ مجھے تو بظاہر اپنے یہاں آنے کی کوئی خاص وجہ نہیں معلوم ہوتی ہاں اگر سرکار کے چانٹوں کے لئے کسی گدی کی، بیگم صاحبہ کے طمانچوں کے لئے کسی کلہ کی، صاحبزادے صاحب کی ٹھوکروں کے لئے کسی پنڈلی کی، اور صاحبزادی صاحبہ کی چٹکیوں کے لئے کسی ہاتھ کی ضرورت تھی تو میرے پیدا کرنے کے بہت کافی وجوہ موجود تھے۔ اور شاید اسی خیال سے میری ہڈیاں مضبوط، میرا گوشت سخت، اور میری گدی چوڑی بنائی گئی ہے یا رفتہ رفتہ بن گئی ہے۔

میں کہاں پیدا ہوا؟ اور کب پیدا ہوا؟ اس کا داخلہ قضا و قدر کے دفتر میں شاید مل سکے تو مل سکے۔ دنیا میں ان واقعات کا پتہ چلنا ناممکن ہے۔ میرے ماں باپ کون تھے؟ اس کا حال بھی کسی کو معلوم نہیں۔ اور کیونکر معلوم ہو سکتا ہے۔ جب باوجود اُن کا بیٹا ہونے کے مجھے خود معلوم نہیں تو بھلا دوسروں کو کیا معلوم ہوگا؟ ہاں اتنا جانتا ہوں کہ جب میں بہت چھوٹا سا تھا۔ اُس وقت ایک عورت مجھے گود میں لئے پھرتی تھی۔ اس کے بعد وہ غائب ہو گئی اور کسی نے مجھے سڑک کے کنارے ایک مکان میں لا بٹھایا۔ ہمارے سرکار آئے، کچھ لکھا پڑھی ہوئی مجھے گاڑی میں بٹھا کر گھر لائے۔ اس کے بعد اب تک نہ یہ گھر ہم سے چھوٹا اور نہ ہم اس گھر سے چھوٹے۔

گھر میں آتے ہی مار دن مار میرے لئے نئے کپڑے سلے اور نہلا دھلا کپڑے پہنا مجھے خاصہ بھلا آدمی بنا دیا۔ تھوڑی دیر میں دسترخوان بچھا بیگم صاحبہ نے

مجھے بھی دستر خوان پر بٹھالیا۔ یہ پہلا اور آخری دن تھا جو اس گھر میں مجھے دستر خوان پر کھانا کھانا نصیب ہوا۔ کھانے بڑے مزے کے تھے۔ میں بھوکا بھی تھا۔ ایسا بیتاب ہو کر گرا کہ جب پیٹ تن کر نقارہ ہوگیا اس وقت کہیں جاکر کھانے سے ہاتھ اُٹھایا۔ جس پیٹ میں کبھی آدھی روٹی نہیں پہنچی تھی اس میں اتنا ملغوبہ بھر گیا بدہضمی ہوئی۔ علاج ہوئے۔ خدا خدا کرکے اچھا ہوا۔ اس کے بعد میں کھانے میں احتیاط کرتا یا نہ کرتا۔ ہاں کھانا دینے میں بیگم صاحبہ بہت احتیاط کرتیں۔ گھٹتے گھٹتے آدھی روٹی پر نوبت آگئی۔ حکم تھا کہ "میرے سامنے کھا" بھلا بڑھتے معدہ کو آدھی روٹی کیا معلوم ہو لیکن وہاں آدھی روٹی سے پون روٹی نہ ہوئی۔ اس پر یہی مامائیں طعنوں کی بوچھاڑ سے کلیجہ چھلنی کر ڈالتیں کہ "اے بوا دیکھنا! اس کی عمر دیکھو اور اس کا کھانا دیکھو! ذرا بڑا ہوا تو یاں سیر آٹا چٹ کر جائے گا" ہوتے ہوتے بیگم صاحبہ نے بھی یہی سبق پڑھنا شروع کر دیا۔ خود ایک وقت میں آدھی روٹی دیتی تھیں۔ پھر بھی میرے بڑے پیٹے ہونے کی شکایت تھی۔ ان کی ایک لڑکی بس میرے ہی برابر تھی۔ یقین مانئے گا کہ ہر وقت اُس کا منہ چلتا تھا۔ یہ سودے والا آیا۔ مچل گئی۔ دو پیسے لے کھا گئی۔ کوئی خوانچہ والا آیا۔ بِھر گئی۔ ایک آنہ سے چٹ کر گئی۔ کاچھن آئی لوٹ گئی۔ دو چار پیسے کے کچالو ہضم کئے۔ کھانے پر بیٹھی تو سب کے بعد اُٹھی۔ جب دیکھو پیٹ تنا ہوا ہے۔ دست آرہے ہیں۔ مگر بیگم صاحبہ ہیں کہ یہی کہے جاتی ہیں کہ "اے ہے۔ نہ یہ بچی کچھ کھاتی ہے نہ پیتی ہے۔ آخر کیسے جئے گی؟ ذرا کھانے بیٹھی اور اس موئے (یہ میری طرف اشارہ تھا) نے گھورنا شروع کردیا۔ جیسے کا ویسا نکل گیا۔ جب سے آیا ہے میری بچی کی بھوک تو مر گئی ہے۔ بھر بھر رکابیاں دیتی ہوں جب بھی تو موئے کا پیٹ نہیں بھرتا۔ مرغی کا معدہ ہے ادھر کھایا اور اُدھر ہضم"۔

زمین پر آرہے۔ تکیہ ایک طرف گیا۔ دری ایک طرف گئی۔ اب رہی رضائی تو اس کا بچھونے سے کبھی کوئی تعلق ہی نہیں رہا۔ ہم نے خدا کی دی ہوئی زمین پر لوٹ ماری اور گھر کے کتے نے ہمارا بچھونا سنبھالا۔ سردی لگی تو سوتے ہی سوتے میں کتے کی اور ہماری دری پر جنگ ہوگئی۔ کبھی ہم نے کتے کو دری سے ہٹا دیا اور کبھی کتے نے ہم کو ڈھکیل کر بچھونے پر قبضہ کر لیا۔ ادھر صبح ہوئی اور اُدھر بیگم صاحبہ یا کسی ماما نے اٹھ کر ہم کو ٹھوکر، کے ذریعہ سے ہوشیار کر دیا ہم پہلے تو ذرا کسمسائے مگر دوسری یا تیسری ٹھوکر نے آنکھیں ہی کھول دیں اُٹھ کر بچھونے کو لپیٹا۔ ایک کونہ میں رکھا۔ نل پر جا کر دو ایک چلو سے آنکھیں دھوئیں۔ اور "چل بھیا چڑھ جا سولی پر رام بھلی کریں گے" پھر وہی ہم ہیں اور وہی ایک بولی اور تین کام۔

خیر کام سے تو ہم نہیں گھبراتے۔ مگر ہر وقت کی مارپیٹ ذرا بُری معلوم ہوتی ہے، آخر کوئی کہاں تک پٹے جائے۔ یہ آیا مار گیا۔ وہ مار گیا۔ بیگم صاحبہ کہہ رہی ہیں "لوٹا لا" صاحبزادے صاحب کہہ رہے ہیں "پانی لا" صاحبزادی صاحبہ فرما رہی ہیں "چل میرے ساتھ کھیل" یہ کہہ رہا ہے "ادھر آ" وہ کہہ رہا ہے "اُدھر جا" آخر آدمی نہ ہوا گھن چکر ہو گیا۔ جس کا حکم نہ مانو۔ وہی مارے۔ اور حکم مانو تو کیونکر مانو۔ بھلا تین کام ایک آدمی کیونکر کرے؟ آخر میں نے بھی بے حیائی کا جامہ پہن لیا۔ پٹنا قسمت میں لکھا ہے تو یوں ہی سہی۔ یوں بھی پٹنا۔ ووں بھی پٹنا۔ پھر کام کر کے اپنے آپ کو مفت میں کیوں تھکائیں۔ نکمے کا خطاب ملا ہے تو ملنے دو۔ بُرا بھلا کہتے ہیں تو کہنے دو۔ اس کان سنو اُس کان اُڑا دو۔ آپ ہی بک بک کر تھک جائیں گے۔ یہ چال بھی گھورنے کی طرح کارگر ہوئی۔ سب چیختے چلاتے مگر میں ٹس سے مس نہ ہوتا۔ جہاں کسی نے

نظر وظر لگانا تو مجھے آتا نہیں۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ گھورنا اکثر میرے لئے مفید ثابت ہوا ہے۔ شروع شروع میں تو میری یہ حالت تھی کہ کسی کو کچھ کھاتے دیکھا۔ اور الگ ہٹ گیا۔ لیکن کوئی اللہ کا بندہ یہ بھی خیال نہیں کرتا تھا کہ اس معصوم اور لاوارث بچے کو کچھ دے دو آخر کہاں تک دل مارا جاتا۔ میں نے بھی رنگ بدلا۔ جہاں کسی نے ذرا منہ چلایا اور میں نے گھورا۔ ادھر میں نے گھورا اور اُدھر مجھ پر صلواتیں پڑنی شروع ہوئیں۔ مگر تھوڑا بہت یاروں کے حصہ میں آ ہی گیا۔ ہوتے ہوتے میری نظر کا شہرہ ہو گیا۔ ایک دفعہ میں نے بہت گھورا تھا۔ مگر کسی نے مجھ کو کچھ نہیں دیا تھا۔ خدا کا کرنا کیا ہوتا ہے کہ اس کا سارا کھایا پیا جوں کا توں نکل گیا۔ اور میری نظر لگنے کا اثر سمجھا گیا۔ اب کیا تھا ذرا کھانے والے کی طرف گھور کر دیکھا اور میں اس کا حصہ دار ہو گیا۔ غرض نتیجہ یہ ہوا کہ دنیا کی کوئی نعمت نہ تھی جو گھر میں آتی ہو اور اس میں تھوڑا بہت مجھے نہ مل جاتا۔

ہمارے سونے کی شان بھی عجیب شان تھی۔ دوسروں کے پاس بچھونے تھے۔ ہمارے پاس بھی تھے۔ مگر رضائی تو ایسی تھی کہ اس میں سے آسمان دکھائی دے۔ اور تکیہ ایسا کالا تھا کہ اس پر میل بڑھنے یا گھٹنے کا کوئی اثر ہی نہیں ہوتا تھا۔ میری رنگت اور بالوں کی سیاہی میں کچھ انیس بیس ہی کا فرق ہوگا۔ مگر میرے بالوں اور تکیہ کی سیاہی میں انیس بیس نہیں، پندرہ اور بیس کا فرق تھا۔ ساتھ ہی چپ چپاہٹ ایسی تھی کہ سر کے ساتھ تکیہ زمین سے اُٹھ آتا تھا۔ اب رہی دری تو وہ کسی زمانہ میں دری کی تعریف میں آتی ہو تو آتی ہو۔ میرے زمانۂ استعمال میں بچھنے کے بعد زمین میں اور اس میں تمیز کرنا ذرا مشکل کام تھا۔ یہ سب کچھ تھا مگر بچھونے سے ہم کو واسطہ بہت کم پڑتا تھا۔ ادھر آنکھ لگی اور ہم کروٹ لے،

ذرا ہاتھ لگایا اور میں نے اس زور سے چیخ ماری گویا کسی نے گلا گھونٹ دیا ہے۔ کبھی کسی نے میری اس ترکیب کو دیکھ لیا تو راز کھُل گیا۔ نہیں تو مارنے والا خود گھبرا گیا۔ دوسروں نے غل مچایا کہ "اسے ہے۔ لونڈے کو مار ڈالا" کبھی تو مارنے والے صاحب مجھ سے زیادہ پٹ گئے۔ اور کبھی ڈانٹ ڈپٹ ہوگئی مگر ہم کام سے بچ گئے۔ تھوڑی دیر چیختے چلاتے رہے۔ اس کے بعد یا تو پڑ کر سو گئے یا آنکھ بچائی باہر نکل گئے۔ مگر بابا "ہر فرعونے راموسیٰ" چھوٹی صاحبزادی صاحبہ کچھ مجھ سے بھی زیادہ تیز تھیں۔ خود ہی مجھے مارتیں اور خود ہی رونے بیٹھ جاتیں۔ بھلا ان کے مقابلہ میں مجھ بیچارے کی کیا ہستی تھی۔ اُلٹی مجھ ہی پر لے دے ہوتی۔ غرض اس لڑکی کے ہاتھوں ناک میں دم آگیا تھا۔ مگر میں بھی بدلہ لئے بغیر تھوڑی مانتا تھا۔ مارنے کی تو ہمت نہ ہوتی تھی۔ ہاں کبھی بیگم صاحبہ ان پر خفا ہوتیں تو میں بھی اُلٹی سیدھی بہت کچھ لگاتا۔ مہینہ مہینہ بھر پہلے کی باتیں یاد دلاتا۔ اگر قسمت نے یاوری کی تو کام بن گیا اور صاحبزادی صاحبہ کی خوب گُندی ہوگئی۔ نہیں تو لُترا پے کا الزام لگا۔ بیگم صاحبہ نے بیٹی کا غصہ مجھ غریب پر اُتار لیا۔

ہمارے کپڑوں کی کچھ نہ پوچھو۔ ادھر اور اُدھر میلے ہوئے۔ بدن میں کانٹے تھے کہ نیا جوڑا ابھی پنڈے سے ثابت نہیں اُترتا تھا۔ خیر گریبان تو ہمیشہ چاک رہتا ہی تھا۔ ہاں اکثر یہ بھی ہوتا تھا کہ سینہ کے نمونہ کا گریبان پیٹھ پر بھی بن جاتا تھا۔ اب رہے ہمارے چاک۔ تو ان کا بڑھتے بڑھتے بغل تک آجانا معمولی بات تھی۔ موٹے سے موٹے لٹھے اور گاڑھے کے کپڑے بنائے گئے۔ مگر کوئی کپڑا بدن سے ثابت نہ اُترتا تھا۔ نہ اُترا۔ پاجامہ پہلے ٹخنوں سے گزر کر شرعی ہوا۔ اس کے بعد گھٹنوں تک آیا اور آخر گھٹتے گھٹتے

جانگمیہ بن گیا۔ اب رہی ٹوپی اور اچکن، تو وہ ہمیشہ "فس کلاس" رہتی تھی۔ اور کیوں نہ رہتی۔ پہنتا ہی کون مسخرا تھا۔ کبھی عید، برات کو پہن لی تو پہن لی نہیں تو ٹوپی میں اچکن ٹھنسی ہوئی کمرہ کے کسی کونہ میں پڑی رہتی تھی۔

ٹوپی کے ساتھ ہی سر کا بھی خیال آگیا۔ اس کا حال بھی سُن لیجئے۔ جمعہ کے جمعہ ہمارے ٹانٹ گھونٹ کر باجرے کا پیڑا بنا دی جاتی تھی۔ ذرا بالوں کی کھونٹیاں نکلیں اور استرہ پھرا۔ استرے کا پھرنا قیامت ہوتا تھا۔ جس کے پاس سے نکلے اُسی نے چانٹا رسید کیا۔ کچھ گھٹی ہوئی ٹانٹ پر چانٹا ایسا پڑتا ہے کہ سُبحان اللہ چھینٹیں اُڑ جاتی ہیں۔ مارنے والوں کو مزہ آتا ہو تو آتا ہو۔ میرا تو بعض وقت سر چھنا جاتا تھا۔ اور تو اور بڑے سرکار بھی مذاق میں چلتے چلتے دو ایک چانٹے ضرور رسید کر دیا کرتے تھے۔

کہتے ہیں "باپ پر پوت، پتا پر گھوڑا، بہت نہیں تو تھوڑا ہی تھوڑا" میرا باپ بھی شاید کوئی چور تھا۔ کیونکہ جہاں میں نے کسی اچھی چیز کو دیکھا اور چرانے کو جی چاہا۔ پہلے تو دل مارتا رہا، آخر فطرت طبیعت پر غالب آگئی۔ اور چھوٹی چھوٹی چیزوں کی چوری میں نے شروع کر دی۔ کھلونا اُٹھایا چھپا دیا، رومال دیکھا غائب کر دیا۔ لیکن آخر ان چیزوں کو لے کر کہاں جاتا؟ میری دنیا تو اسی مکان کی چار دیواری تھی۔

سچ ہے خدا بڑا کارساز ہے یہ مشکل بھی آسان ہوئی۔ ایک نئی ماما آئیں۔ ہاتھ کی بڑی تیز تھیں۔ موقع ملتا تو گھر بھر میں جھاڑو دے دیتیں۔ مگر مشکل یہ آپڑی کہ بیگم صاحبہ کچھ ان کی شکل سے تاڑ گئیں تھیں۔ اس لئے ان کے حدود باورچی خانہ اور صحن سے آگے نہ بڑھے۔ اس پر بھی وہ اپنا پوتھ پورا کر لیتی تھیں رات کو گھر جاتیں۔ صبح ہی صبح آتیں۔ دوپہر کا کھانا لے کر جاتیں تو کوئی دو بجے

واپس آتیں، کوئی روز پوٹلی کھلوانے سے تو رہا۔ خدا معلوم کتنا دال آٹا باندھ کر لے جاتی تھیں۔ ہاں یہ ضرور تھا کہ جب سے وہ آئی تھیں دسترخوان پر ہر چیز تھڑنے لگی تھی۔ ہماری بیگم صاحبہ کی سمجھ دیکھو کہ بجائے یہ معلوم کرنے کے کہ کھانا کیوں کم پڑتا ہے، اُلٹا غلہ بڑھا دیا۔ مگر ماما جی نے اس پر بھی بس نہ کی۔ ادھر غلہ بڑھا اور اُدھر اُن کی چوری بڑھی۔ غرض جب تک وہ رہیں کھانے میں ہمیشہ برکت ہی برکت رہی۔ ماما جی بچّہ سمجھ کر میرے سامنے پوٹلی باندھنے میں ذرا احتیاط کم کرتی تھیں، اس لئے مجھے ان کے کرتوتوں کا حال خوب معلوم ہے۔ رکابی اور پیالہ سے لگا چھوٹی پتیلی اور سرپوش تک اُن کی پوٹلی میں ہمارے گھر سے رخصت ہوئے ہیں۔ ان چیزوں کے جانے کے متعلق جس زمانہ میں کچھ گڑبڑ ہوتی تو بی ماما جی ذرا ہاتھ روک لیتیں۔ خود پوٹلی سارے گھر کو دکھا کر جاتیں۔ جہاں ذرا معاملہ ٹھنڈا پڑا اور چیزیں کھسکنی شروع ہوئیں۔ ان کو معلوم تھا کہ میں ان کی ساری کارروائیوں سے واقف ہوں۔ اس لئے میری بڑی خاطر داری کرتیں۔ چپکے چپکے باورچی خانہ میں خوب کھلاتیں۔ کبھی کبھی مٹھائی بھی لا کر دیتیں۔ رفتہ رفتہ مجھے بھی ان سے کچھ انس ہو گیا۔ اور کیوں نہ ہوتا۔ گھر والے میرے ساتھ کون سی بھلائی کرتے تھے جو میں اُن کے مال کا غم کھاتا۔ آخر یہ ہوا کہ تھوڑے ہی دنوں میں خود میں نے ماما جی کو چرا چرا کر چیزیں دینی شروع کیں۔ ذرا بیگم صاحبہ نے کوئی چیز رکھی اور غائب تکیہ کے نیچے سے پیسے غائب۔ جیب میں سے روپئے غائب۔ کھونٹی پر سے تولیہ غائب۔ آخر یہاں تک ہوا کہ پٹاری میں سے سونے کا چھلہ اڑ گیا۔ اس پر بڑا غل مچا۔ چھری پڑھوا کر رکھوائی گئی۔ کچے چاول چبوائے گئے۔ مگر پتہ نہ چلا۔ مجھ پر تو شبہ ہو ہی نہیں سکتا تھا۔ جانتے تھے کہ چرائے گا تو کہاں لے جائے گا۔ ماما پر شبہ کی گنجائش ہی نہیں تھی۔ کیونکہ

ان سے باورچی خانہ کب چھوٹتا تھا۔ اب رہیں بی مغلانی اور آیا۔ تو وہ جانیں اور بیگم صاحبہ جانیں۔ غرض تھوڑے دن گئی گذری بات ہوئی۔ چھلّے کے عوض بی ماما نے مجھے دو لڈو لا کر دئیے۔ اب کیا تھا مجھے لڈو کی چاٹ پڑ گئی۔ میں نے بھی اپنا گھر صاف کر ماما جی کا گھر بھرا اور خوب بھرا۔ ان کی بیٹی کی شادی ہونے والی تھی، سارا جہیز ہمارے گھر سے رفتہ رفتہ وہاں پہنچ گیا۔ یہاں تک کہ دری، چاندنی اور مچھر دانی تک اُٹھ گیا۔ بیگم صاحبہ پریشان تھیں کہ یا اللہ، سامان کے پَر لگ گئے ہیں کہ ادھر رکھا اور اُدھر غائب۔ آخر حاضرات کی ٹھہری۔ چھوٹی بی بی آئینہ کے سامنے بٹھائی گئیں۔ جنوں کے بادشاہ آئے۔ ان سے چور کا حال پوچھا گیا۔ چھوٹی بی بی تو میری جان کی دشمن تھیں ہی۔ انھوں نے میرا نام لے دیا۔ کسی کو یقین نہ آیا۔ مگر بڑے سرکار کچھ کھٹک گئے۔ شاید میرے اور ماما جی کے زیادہ میل جول سے ان کو کوئی خیال پیدا ہو گیا۔ ماما جی سمجھیں کہ چلو یہ مال بھی ہضم ہوا۔ ایک دن مجھ سے کہا۔ "دیکھیو بیٹا! ابھی بیگم صاحبہ پٹاری میں چپاکلی رکھ کر کوٹھے پر گئی ہیں۔ اس وقت دالان میں کوئی ہے بھی نہیں ذرا چپکے سے نکال تو لا۔ اتنے لڈو کھلاؤں گی کہ پیٹ بھر جائے گا۔" ہم باورچی خانہ سے نکل ٹہلتے ٹہلتے دالان میں آئے۔ اِدھر اُدھر دیکھا میدان صاف تھا، پٹاری کھول، چپاکلی نکال، نیفہ میں اُڑس، باورچی خانہ میں آ، ماما جی کے حوالہ کی۔ انھوں نے اپنے خشکہ کی رکابی میں ٹھونس، رکابی پوٹلی میں باندھ دی۔ بیگم صاحبہ نیچے آئیں۔ پٹاری کھول پان کھایا۔ مگر کچھ نہ بولیں۔ تھوڑی دیر میں بڑے سرکار، بی مغلانی اور آیا بھی دالان میں آ گئے۔ کھانا منگوایا گیا۔ سب نے کھا پی فراغت کی۔ بی ماما اپنی پوٹلی دکھا دروازہ کے باہر نکل رہی تھیں کہ ایک غل مچ گیا۔

میں دوڑتا ہوا باہر آیا، کیا دیکھتا ہوں کہ ماما جی کو ایک سپاہی پکڑے کھڑا ہے۔ اور ماما جی وہ شور مچارہی ہیں کہ خدا کی پناہ، گھر والوں کو بھی کوسنے دے رہی ہیں۔ سپاہی کو بھی صلواتیں سنارہی ہیں۔ مجھے جو ماما جی نے دیکھا تو کہا "بیٹا! ذرا یہ کھانا تو لیجا کر میرے گھر میں دے آ۔ بچی بھوکی بیٹھی ہوگی۔ بارہ بج چکے ہیں دیکھئے ان کالی وردی والوں سے کب پیچھا چھٹتا ہے۔ خدا نہ کرے کوئی ایسے گھر میں نوکر ہو۔ یہ نہ شریف کو دیکھیں نہ رذیل کو۔ گھوڑے گدھے کو ایک لاٹھی ہانکتے ہیں" یہ کہہ انھوں نے پوٹلی میری طرف بڑھائی۔ میں نے ہاتھ بڑھایا ہی تھا کہ سپاہی نے اس زور سے ڈانٹا کہ میرا دم ہی نکل گیا۔

اور ماما جی بھی کچھ سہم سی گئیں، اتنے میں داروغہ جی (سب انسپکٹر پولیس) بھی آ گئے۔ کچھ لوگ اور جمع ہوئے۔ پوٹلی کھلوائی گئی، خشکہ میں سے چمپا کلی نکلی۔ یہ دیکھ کر ماما جی بپھر گئیں۔ کہنے لگیں "ہیں ہا! یہ چمپا کلی میرے خشکہ میں کہاں سے آئی۔ بیگم صاحبہ نے خود نکال کر مجھے خشکہ دیا تھا۔ اُن ہی نے رکھدی ہو گی۔ ہاں بابا بڑے لوگ ہیں۔ آج خشکہ میں مدعا (چوری کا مال رکھ کر) پولیس کے حوالہ کر دیا۔ کل خدا جانے کیا کریں، نا، بابا۔ نا میں اس گھر میں اب نہیں رہنے کی۔" یہ کہہ کر ماما جی جانا چاہتی تھی کہ سپاہی نے چٹیا پکڑ کر گھسیٹ لیا۔ اس پر تو بڑھیا نے وہ اُدھم مچایا کہ معاذ اللہ۔ سارا محلہ چیخ چیخ کر اور رو رو کر سر پر اُٹھالیا۔ اس وقت تو میں نہیں سمجھا تھا مگر ہاں اب سمجھا ہوں کہ غل مچانے سے اس کا کیا مطلب تھا۔ اس کا مکان قریب ہی تھا۔ یہ اپنی بیٹی کو نوٹس تھا کہ "مال گھر سے نکال دے۔" وہ بھی اپنی ماں کی بیٹی تھی سمجھ گئی ہو گی کہ اماں پر آفت آئی ہے۔ مال لے کر نکل رہی تھی کہ دوسرے سپاہی نے اس کو پکڑ کر مال کے ساتھ ماں کے برابر لا کھڑا کیا۔ اس کے بعد

ہم سے پرسش شروع ہوئی۔ مار سے ڈرایا۔ مٹھائی کا لالچ دیا۔ بھلا ہم کو ان ماں بیٹیوں سے کیا دلچسپی تھی۔ مار کے ڈر اور مٹھائی کے لالچ سے سارا قصہ کہہ سنایا۔ اس کے بعد معلوم نہیں کہ وہ دونوں کہاں جہنم رسید ہوئیں۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ ہم سے جو وعدے ہوئے تھے ان میں کا پہلا حصہ بہت دل بھر کر ہم کو پہنچا دیا گیا۔ گھر میں اب بھی رہتے ہیں لیکن ماماؤں اور نوکروں سے ہم کو ذرا کم ملنے دیا جاتا ہے۔ اور پھر اب ہم خود بھی سمجھ دار ہو گئے ہیں۔ اگر کچھ چراتے بھی ہیں تو خود ہی کھا پی کر برابر کر دیتے ہیں کسی کو دیتے دلاتے نہیں۔ بھلا سرکار کے مال کے جب ہم حق دار موجود ہیں تو پھر یہ مال دوسروں کو کیوں پہنچے۔ بچپنا تھا غلطی ہو گئی اللہ معاف کرے گا۔

صاحب بہادر

آنکھیں بڑی نعمت ہیں۔ مگر خدا بھلا کرے ہم ہندوستانیوں کا کہ خدا کی اس نعمت کی کبھی قدر نہیں کرتے۔ سمجھتے ہیں کہ مفت کا مال جس طرح جی چاہے کام میں لاؤ۔ رات کو پڑھو۔ دن کو پڑھو۔ صبح کو پڑھو۔ شام کو پڑھو۔ یا تو ان سے اتنا کام لو کہ بیکار ہو جائیں۔ یا اس طرح چھوڑ دو کہ یہ خود نکمی ہو جائیں۔ دوسروں کو کیا کہوں۔ خود میں نے ان کو تباہ کر لیا۔ جب دیکھو کتاب ہاتھ میں ہے۔ روشنی ہے تو کچھ پرواہ نہیں۔ اندھیرا ہے تو کچھ پرواہ نہیں۔ کتاب ہے اور میں ہوں۔ آنکھیں آخر کہاں تک کام دیتیں۔ کمزور ہونی شروع ہوئیں۔ آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر پڑھا۔ پھر آنکھیں دبا دبا کر پڑھا۔ آنسو آئے پونچھ لئے۔ ذرا دھندلا دکھائی دیا۔ دھو ڈالا۔ غرض جب ساری ترکیبیں ختم ہو گئیں اور کتاب کے حرف نگاہ کے سامنے سے بھاگنے لگے۔ سامنے بھنگے سے اڑنے لگے اس وقت خیال آیا کہ آنکھیں گئیں۔ اور گئی نہیں تو کمزور ضرور ہو گئیں۔ اب علاج کی سوجھی سب نے کہا کسی بڑے ڈاکٹر کو دکھاؤ۔ دوستوں سے مشورہ کیا۔ انھوں نے مدراس جانے کی رائے دی۔ بستر باندھ مدراس پہنچے۔ آنکھوں کے مریضوں کا جو دواخانہ ہے اس میں جا کر معائنہ کرایا فیسیں بھریں۔ تین چار روز تک دیکھنے کے بعد ڈاکٹروں نے کہہ دیا کہ "ہندوستان میں علاج نہیں ہو سکتا جرمنی جاؤ"۔ واپس آیا۔ پھر مشورے ہوئے۔ سب نے کہا کہ "میاں جاؤ۔ آنکھوں سے زیادہ کہیں روپیہ ہے"۔ مرتا کیا نہ کرتا۔ بنک کا حساب دیکھا۔ ٹکٹ کا انتظام کیا۔ چلنے کی تیاری کی۔ یار دوستوں سے رخصت

ہونے گیا۔ ایک صاحب نے کہا "اجی حضرت! کیوں روپیہ تباہ کرتے ہو اگر ولایت جانے کا شوق ہے تو خیر اسی بہانہ سے جاؤ۔ ہاں اگر بال بچوں کے لئے کچھ چھوڑ مرنا ہے تو یہیں علاج کرائو۔ ولایت والوں میں کون سا سرخاب کا پر لگا ہے۔ ہم لوگ خود اپنے ہندوستانی بھائیوں کو ذلیل سمجھنے لگے ہیں۔ ورنہ جو وہ کر سکتے ہیں وہ ہم کر سکتے ہیں۔ ہاں وہ غیر سمجھ کر لوٹتے ہیں۔ ہم اپنا سمجھ کر ہمدردی کرتے ہیں لو، مجھے ہی دیکھ لو۔ میری آنکھوں میں کیا رہا تھا۔ میں نہ تو فرانس گیا نہ جرمنی۔ یہیں علاج کیا اور اچھا ہو گیا۔ اگر روپے سے دشمنی نہیں تو بھائی صاحب بمبئی جائیے۔ ڈاکٹر ڈگن سے ملئے۔ ہاں وہ جواب دیدیں تو آپ کو اختیار ہے۔ کچھ بات تو ہے جو انگلستان کے ماہران فن چشم نے اس کو اپنی کانفرنس کا صدر نشین بنایا تھا۔ ہمارا کام سمجھانا تھا۔ سمجھا دیا۔ اب تم جانو تمھارا کام جانے مانو یا نہ مانو۔" میں نے بھی سوچا کہ ہاں بچارا سچ تو کہتا ہے لاؤ۔ ڈاکٹر ڈگن کو بھی دیکھ لیں کہ کتنے پانی میں ہیں۔ گھر آیا صبح ہی بستر باندھ ریل پر سوار ہو گیا۔ میں بچارا ہندوستانی آدمی سامان بھی کچھ واجبی ہی ساتھ تھا۔ لباس کے ساتھ پاندان اور لوٹا صاف ظاہر کرتا تھا کہ نمبر اول کا قدامت پسند آدمی ہے۔ انگریزی جانتا ہوں۔ انگریزوں کے ساتھ مدتوں رہا ہوں۔ انگریزی کپڑے بھی پہنتا تھا۔ مگر وہ زمانہ گیا۔ اب تو کچھ اپنے ہی ملک کے لباس میں آرام آتا ہے۔ سکنڈ کلاس میں بیٹھ ٹوپی اُتاری۔ شیروانی اُتاری۔ جوتا اُتارا۔ جرابیں اُتاریں۔ بچھونا بچھایا۔ پاندان کھول کر پان کھایا۔ بچھونے پر لیٹ تکیہ گھٹنوں میں دبا آرام سے لوٹ ماری۔

اس زمانہ میں بعض ایڈیٹروں کے تقاضہ نے ناک میں دم کر رکھا تھا۔ مگر سمجھ ہی نہیں آتا تھا کہ کیا مضمون لکھوں۔ پنسل اور کاغذ سرہانے رکھ لیا

تھا کہ کچھ سوجھ جائے گا تو لکھ لوں گا۔ مگر گاڑی کے چکروں میں کچھ ایسا مزہ آیا کہ آنکھ لگ گئی نیند تو ایسی مزہ کی آئی تھی کہ شاید بمبئی ہی میں جاکر آنکھ کھلتی۔ مگر کیا کروں ایک "صاحب بہادر" کی کرخت آواز نے نیند میں خلل ڈال دیا آنکھیں تو میں نے نہیں کھولیں۔ ہاں ذرا بھچی بھچی آنکھوں سے گاڑی کا رنگ دیکھا۔ کیا دیکھتا ہوں کہ ایک سیاہ فام سے آدمی نہایت عمدہ سوٹ پہنے منہ میں سگار دبائے قلیوں سے انگریزی لہجے کی اُردو میں لڑ رہے ہیں۔ لڑائی ایک ٹین کے لوٹے پر تھی۔ قلی کہتے تھے کہ "حضور کا ہے"۔ صاحب کہتے تھے "ہمارا نہیں ہو نا سکتا"۔ قلیوں کو یہ شاید ڈر تھا کہ چوری کا الزام نہ لگ جائے۔ ورنہ ان کو جھگڑنے کی کیا ضرورت تھی۔ لوٹا اٹھا کر چلتے بنتے۔ گھر میں کام آتا۔ میں سمجھ گیا کہ ان ہمارے ہندوستانی بھائی کو انگریزیت کا نیا شوق چرایا ہے۔ گھر سے بیوی نے لوٹا ساتھ کر دیا ہو گا۔ یہاں سوٹ پہن کر لوٹا ساتھ رکھنے شرم آتی ہے اس لئے اس کی ملکیت سے انکار کیا جا رہا ہے۔ گھڑی گھڑی ان کا ہاتھ مونچھوں پر جاتا اور خالی آتا۔ اس سے صاف ظاہر تھا کہ مونچھیں پہلی دفعہ منڈائی گئی ہیں۔ رہ رہ کر ٹائی درست کرتے۔ کوٹ اور واسکوٹ کی سلوٹیں نکالتے۔ یہ اس بات کی دلیل تھی کہ سوٹ پہننے کی عادت نہیں ہے۔ ہاتھ میں موٹی سی انگریزی آداب مجلس کی کتاب تھی۔ اس سے سمجھ لیجئے کہ عالم ہو کر یہ کہیں عمل کرنے جا رہے ہیں۔ بکسوں کی زیادتی بتا رہی تھی کہ سفر کے عادی نہیں اس لئے بے ضرورت سامان سمیٹ لائے ہیں۔ ان خیالات کا دل میں آنا تھا کہ جھٹ اُٹھ بیٹھا۔ سوچا کہ چلو اللہ نے مفت کا ایک مضمون دیا۔ خدا کرے کچھ عرصہ ساتھ رہے۔ مزا آجائے گا۔ سب سے پہلے تو میں نے قلیوں کو سمجھایا کہ "بیوقوفو! کہیں صاحب لوگوں کے پاس لوٹا

ہوتا ہے جو اُن کے پاس ہوگا۔ چلو ہٹو۔ لوٹا پولیس ہیں دے دو۔ کوئی دوسرا مسافر چھوڑ گیا ہوگا۔" صاحب یہ سُن کر مُسکرائے اور "تھینک یو" سے میری عقل رسا کی داد دی۔ اس کے بعد نہایت فراخ دلی سے قلیوں کو انعام دیا۔ بے ترتیب سامان کو بلا وجہ ٹٹول ٹٹول کر اور بے ترتیب کر دیا۔ بندھا ہوا بستر ایک سیٹ پر رکھا۔ اور اس سے تکیہ لگا کر بیٹھے۔ اور اپنی کتاب "آداب مجلس" پڑھنے میں مشغول ہو گئے۔ میں نے پھر لمبی تانی۔ لیکن کن آنکھیوں سے ان کو دیکھتا رہا۔ وہ بھی کبھی کبھی میری طرف دیکھ لیا کرتے تھے کہ سو گیا یا جاگتا ہے۔ میں پہلے سے ان کو دھوکا دینے کے لئے تیار تھا کہ ان کا اصلی رنگ دیکھوں۔ آہستہ آہستہ خراٹے لینے شروع کئے۔ وہ سمجھے کہ چلو یہ تو سو گیا۔ اب اپنا کام کرو چپکے سے ٹفن باسکٹ کھولا۔ چھری کانٹے اور چمچے نکالے۔ کتاب کو دیکھ کر اسی کے موافق سامنے جمایا۔ اب تھوڑی دیر کتاب پڑھتے اور تھوڑی دیر خالی چھری۔ کانٹے چلاتے۔ کبھی کبھی ایکٹروں کی طرح شکریہ کے طور پر اِدھر اُدھر گردن بھی جھکاتے۔ غرض اسی طرح کوئی دو گھنٹے گزار دیئے۔ میں نے کروٹ لی اور انھوں نے آہستہ سے سب سامان ٹفن باسکٹ میں رکھ دیا۔ اسٹیشن آیا۔ گارڈ نے کھانے کے متعلق پوچھا۔ میں نے کھانے کے ٹکٹ کے روپے دے دیئے۔ انھوں نے صاحب بہادر سے بھی دریافت کیا۔ پہلے تو انھوں نے دماغ پر زور ڈالا کہ سبق پر عمل کروں یا نہ کروں۔ پھر شاید خیال آیا کہ کہیں اوروں کے سامنے ہتک نہ ہو جائے۔ نہایت ڈانٹ کر "نو" (نہیں) کہہ دیا۔ گارڈ نے مجھے لاکر ٹکٹ دیدیا۔ اور ہمارے دوست اپنی کتاب کے سر رہے۔ میں اُٹھا۔ ہاتھ مُنہ دھویا۔ کپڑے پہنے۔ ذرا بھلا آدمی بنا۔ پان کھایا۔ صاحب سے انگریزی میں پوچھا

"آپ تو پان کھاتے نہ ہوں گے۔" کہا "نہیں۔ اس سے دانت خراب ہوتے ہیں۔" میں نے پوچھا "شاید ولایت کا قصد ہے؟" کہنے لگے "نہیں اس وقت تو صرف بمبئی تک جا رہا ہوں۔" میں نے کہا "بمبئی میں کچھ عرصہ تک قیام رہے گا؟" فرمایا "نہیں، صرف چار دن۔" اس کے بعد ذرا کھلے۔ اور خود سوال شروع کیے۔ پہلا ہی سوال مطلب کا تھا۔ کہنے لگے "بمبئی بہت بُری جگہ ہے۔ کھانا اچھا نہیں ملتا۔ کوئی ہوٹل اچھا نہیں ہے۔" میں نے کہا "یہ تو نہ فرمائیے۔ تاج محل ہوٹل کے متعلق کون کہہ سکتا ہے کہ وہاں آرام نہیں ملتا۔ ہاں خرچ ضرور زیادہ ہوتا ہے۔" کہنے لگے "اوہ خرچ کی پرواہ نہیں۔ ہم اینگلو انڈینز کو پسند نہیں کرتے۔ ہم ایسی جگہ ٹھہرنا چاہتے ہیں جہاں سب ہندوستانی ہوں، یا سب یوروپین۔" بھلا ایسا موقعہ ملے اور میں ہاتھ سے جانے دوں۔ میں نے کہا "بمبئی ہوٹل میں ٹھہریئے۔ وہاں آپ کو آرام بھی ملے گا اور اینگلو انڈینز بھی نظر آئیں گے۔" میرا مطلب دوسرا ہی تھا۔ میں خود اسی ہوٹل میں ٹھہر رہا تھا۔ سمجھا کہ یہ شیر ساتھ رہا تو میرا مضمون پورا ہو جائے گا۔ وہ بھلا اس پیترے کو کیا سمجھتے جھٹ راضی ہو گئے۔ پھر میری ذات کے متعلق انھوں نے سوالات کی بھرمار شروع کی۔ "کیا نام ہے؟ کہاں پڑھا ہے؟ کہاں تک پڑھا ہے۔ کہاں نوکر ہو؟ کیا تنخواہ ملتی ہے؟ کتنے بچے ہیں؟ کیوں بمبئی جا رہے ہو؟ کب تک رہو گے؟ کب واپس آؤ گے؟ انگریزوں میں رہنے سہنے کا اتفاق ہوا ہے؟ انگریزی آدابِ مجلس سے واقف ہو؟ تم خود کس ہوٹل میں ٹھہرو گے؟" غرض ہزاروں سوال کر ڈالے۔ جب اُن کو معلوم ہوا کہ باوجود ہندوستانی لباس کے میں انگریزی طرزِ معاشرت سے بے بہرہ نہیں ہوں۔ اور بمبئی ہوٹل میں ٹھہر رہا ہوں۔

تو اُن کے چہرہ پر ذرا بشاشت سی آگئی۔ سمجھے ہوں گے کہ چلو کتاب کے مضمون پر عمل کرنے میں کچھ تو اس سے مدد ملے گی۔

دوسرے اسٹیشن پر میں تو، اتر کھانا کھانے چلا گیا۔ اور ہمارے صاحب بہادر نے اسٹیشن پر سے پوریاں اور مٹھائی خریدی۔ اور خوب تن تازہ ہو شب خوابی کے کپڑے پہن، بستر بچھا، روشنی گل کر سو گئے۔ ان کا بھانڈا نہ پھوٹتا اگر حمام میں ترکاری اور مٹھائی کے پتے پڑے ہوئے مجھے نہ ملتے پتے دیکھ کر میں نے نتیجے نکالے۔ اوّل یہ کہ اُنھوں نے جو کچھ بھی کھایا۔ حمام میں کھایا تاکہ کوئی دیکھ کر تعجب نہ کرے کہ ایک صاحب بہادر بیٹھے پوریاں کھا رہے ہیں۔ دوسرے یہ کہ گھبراہٹ میں یا تو یہ پتے باہر پھینکنے بھول گئے یا انھوں نے پھینکے تھے۔ اور وہ ہوا کے زور سے پھر اُلٹے اندر گھس آئے خیر معلوم ہو گیا کہ بمبئی میں اچھی کٹے گی۔

دوسرے دن صبح ساڑھے چھ بجے بمبئی پہونچ گئے۔ یہ تو اسباب سمٹوانے میں رہے اور میں کرایہ کی موٹر لے بمبئی ہوٹل پہنچا۔ بیسیوں دفعہ وہاں ٹھہرا ہوں۔ سب سے ملاقات ہے۔ منیجر صاحب سے ملاقات کیا دوستی ہے۔ پہلے انھی سے ملا اور کہا۔ ایک صاحب، آرہے ہیں میرے کمرے کے برابر ہی ان کو کمرہ دینا۔ اور ذرا اِدھر اُدھر جائیں تو مجھ کو اطلاع کر دیا کرنا۔ اس وقت تو بس اتنا ہی سُن لو۔ باقی پھر کہوں گا۔ خیر میں تو ان سے یہ کہہ تیسری منزل کے کمرہ نمبر (۳۶) میں جاٹکا۔ اوپر سے دیکھا تو صاحب بہادر کی لدی پھندی دو موٹریں نیچے دروازہ کے سامنے آکر ٹھہریں۔ اسباب اُترنا شروع ہوا۔ تھوڑی دیر میں آگے آگے منیجر صاحب اور پیچھے پیچھے ہمارے دوست آئے۔ کمرہ نمبر (۳۵) کھولا گیا۔ اور اس میں انھوں نے قیام فرمایا

منیجر صاحب ان سے فارغ ہو میرے پاس آئے اور کہنے لگے: "یہ کیا بات ہے۔ جو آپ نے کہا تھا بجنسہ وہی انھوں نے کہا۔ آتے ہی پوچھا کہ "ابھی جو صاحب آئے ہیں وہ کون سے کمرہ میں ٹھہرے ہیں؟" میں نے کہا "نمبر ۳۶ میں"، انھوں نے فرمایا "ہمیں ان کے برابر والا کمرہ دو۔ اور جب وہ میز پر آئیں تو ہم کو اطلاع کر دیا کرو۔" میں نے منیجر صاحب سے کہا "ذرا تم نیچے جاؤ۔ میں ابھی آ کر سارا قصّہ بیان کرتا ہوں۔ اور ہاں میرے کمرہ کے سامنے جو ہندوستانی پیخانہ ہے اُس کا لوٹا اٹھوا دو۔ صاحب کو لوٹوں سے بڑی نفرت ہے، اسٹیشن پر قلیوں سے لڑائی ہوتے ہوتے رہ گئی۔"

بچارے منیجر پریشان تھے کہ یہ خاصہ بھلا چنگا آدمی دیوانہ تو نہیں ہو گیا۔ کچھ بڑبڑاتے ہوئے رخصت ہوئے۔ تھوڑی دیر میں میں نے جا کر ان کو سب کچھ سمجھا دیا۔ کہنے لگے "بھئی ذرا دیکھنا ایسی کوئی بات نہ ہو کہ ہوٹل بدنام ہو جائے۔ لطف تو ضرور آئے گا۔ مگر یہ بیوپار کا معاملہ ہے۔" میں نے کہا "آپ خاطر جمع رکھیے۔ بٹلروں سے کہہ دیجیے کہ میں جو مانگوں وہ مجھ کو بلا عذر لا دیا کریں۔ اس میں آپ کا کیا نقصان ہے؟ اور آپ کے ہوٹل کی کیا بدنامی ہے؟ میں شکر کے بجائے اگر کافی میں کالی مرچیں ڈال کر پیتا ہوں تو آپ کو واسطہ؟ آپ کو اپنی رقم سے کام۔" معلوم ہوتا ہے کہ وہ میرے اتنا کہنے پر کچھ سمجھ گئے اور خود بھی صاحب بہادر کے آداب مجلس کی عملی تعلیم کا لطف اُٹھانے پر تیار ہو گئے۔

ہاتھ منہ دھو کپڑے بدل، میں نیچے اُترا۔ اور دوسری منزل میں جو کھانے کا کمرہ ہے اُس میں داخل ہوا۔ جتنے بٹلر تھے مجھے پہچانتے تھے۔ وہ مجھے دیکھ کر ذرا مسکرائے۔ میں سمجھ گیا کہ منیجر صاحب نے ضروری ہدایتیں

دے دی ہیں۔ سڑک کے رُخ پر جو میز بچھی ہوئی تھی اس پر میں جا بیٹھا۔ میرے سامنے بڑا آئینہ تھا۔ پیچھے دو میزیں اور تھیں۔ سیدھے ہاتھ پر سڑک تھی۔ اور بائیں طرف اور بہت سی میزیں کرسیاں اور سامان کا کمرہ تھا۔ معلوم ہوتا ہے کہ ہمارے صاحب بہادر کو بھی میرے میز پر پہنچ جانے کی اطلاع ہوئی۔ وہ نیا سوٹ پہنے۔ ٹوپی اتارے۔ سگار پیتے۔ بڑے ٹھاٹھ سے کمرہ میں داخل ہوئے۔ اِدھر اُدھر دیکھا اور کچھ دل میں سوچ کر میری پشت کی جانب جو میزیں بچھی ہوئی تھیں ان میں سے ایک پر بیٹھ گئے۔ میں سمجھ گیا کہ یہ اس طرح بیٹھنا چاہتے ہیں کہ یہ مجھ کو دیکھ سکیں کہ میں کس طرح کھانا کھاتا ہوں۔ اور میں ان کو نہ دیکھ سکوں لیکن شاید ان کو اس کا خیال نہ رہا کہ میرے سامنے یہ بڑا آئینہ لگا ہوا ہے۔ اور ان کے سب حرکتیں مجھ کو اس میں دکھائی دیتی ہیں۔ جب وہ میرے پاس سے گزرے تو مجھے یہ دیکھ کر بڑا تعجب ہوا کہ ان کے کوٹ کے کالر میں پیچھے کی طرف ایک پرچہ پن سے لگا ہوا ہے۔ بہت غور کیا کچھ سمجھ میں نہ آیا کہ آخر یہ کیا معمّہ ہے۔ اتنے میں بڑے بٹلر نے پورج[1] کی رکابی شکر اور دودھ سامنے لا رکھا۔ میں نے اس سے کہا کہ "منیجر صاحب کو بلاؤ" وہ دروازہ ہی تک گیا ہوگا کہ منیجر صاحب خود مسکراتے ہوئے آئے۔ اور میرے پاس ایک کرسی پر بیٹھ گئے۔ میں نے آہستہ سے اُن سے کہا "مسٹر ذرا چپکے سے یہ تو دیکھ آؤ کہ ہمارے صاحب کے کالر پر یہ کاغذ کیا لگا ہوا ہے؟"

---

[1] پورج کو بس دلیہ سمجھئے۔ فرق یہ ہے کہ دلیہ میں دودھ، شکر اور چاول ملا کر پکاتے ہیں۔ پورج میں دلیہ الگ پکایا جاتا ہے شکر اور دودھ کھانے والا اپنے حسب خواہش ملا لیتا ہے۔

وہ میرے پاس سے اُٹھ صاحب بہادر کے پاس پہنچے اور پہلو میں کھڑے ہو کر پوچھا "آپ کو کوئی تکلیف تو نہیں ہے؟ اگر کسی انتظام کی ضرورت ہو تو کر دیا جائے"۔ صاحب نے فرمایا "نہیں سب ٹھیک ہے"۔ یہ باتیں کرتے کرتے منیجر صاحب نے اس کاغذ پر نظر ڈال لی۔ مگر کچھ چہ می کنم میں ہو گئے وہاں سے ٹہلتے ٹہلتے میرے پاس آئے۔ اور وہی سوال مجھ سے کیا۔ میں نے بھی جواب دیا۔ اور آہستہ سے پوچھا "آپ نے کاغذ دیکھا؟" کہا کہ "ہاں دیکھا"۔ "اس میں لکھا ہے" "ساڑھے سات سے ساڑھے دس تک"۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ اس کے کیا معنی ہیں؟" میں نے کہا "آپ نہ سمجھے ہوں میں سمجھ گیا۔ صاحب نے نئے سوٹ بنوائے ہیں اور اپنی کتاب دیکھ کر ہر سوٹ پر اس کے پہننے کا وقت لکھ دیا ہے۔ یہ ساڑھے سات سے ساڑھے دس تک پہننے کا سوٹ ہے۔ گھبراہٹ میں کاغذ نکالے بغیر کوٹ پہن آئے۔ چلو ان کی صاحبیت کا کچھ تو رنگ معلوم ہو گیا۔ اب دیکھو دوسرا تماشہ دکھاتا ہوں"۔ صاحب بہادر اس وقت اخبار پڑھنے میں مشغول تھے۔ میں نے اپنی رکابی اس طرح رکھی کہ وہ دیکھ سکیں کہ میں پورج کس طرح کھاتا ہوں۔ میں نے نمک کا چمچہ بھرا۔ رکابی تک لایا۔ اور اس طرح اُلٹا کہ نمک بجائے رکابی کے میرے نیپکن[1] میں گرا۔ اس طرح دو تین چمچے بھر بھر کر ڈالے۔ بعد میں سرکہ کی بوتل لی۔ اس کے منہ پر انگلی رکھ کر رکابی میں اس طرح اُلٹی گویا سرکہ ملا لیا۔ صاحب اخبار کی آڑ سے میرے

---

[1] نیپکن رومال جیسا چوکور کپڑا ہوتا ہے جو کھاتے وقت گود میں پھیلا لیتے ہیں تاکہ کھانا گرنے سے کپڑے محفوظ رہیں۔

ان حرکات کو دیکھتے رہے۔ اس کے بعد رکابی میں نے ذرا سرکا کر اپنے سامنے کرلی۔ اور جلدی جلدی شکر کے دو تین چمچے ڈال۔ دودھ انڈیل چمچے سے ملا پھر رکابی ذرا اُن کی طرف کرکے کھانا شروع کیا۔ وہ پورج کھانے کی ترکیب سمجھ گئے نہایت اطمینان سے دل کھول کر نمک اور سرکہ ملایا اور چمچہ سے کھانا شروع کیا۔ منیجر صاحب اور بٹلروں کو ہنسی آئی۔ بچاروں نے بڑی مشکل سے ضبط کیا اور ایک ایک کرکے سب سرک گئے۔ اس کے بعد میں نے جو چیز کھائی ذرا سلیقہ سے کھائی۔ اور صاحب نے ہوبہو نقل اُتاری۔ یہ میں نے اس لئے کیا کہ کہیں کھٹک نہ جائیں اور مزا کرکرا ہو جائے۔

اس کے بعد میں بجے اسپتال میں ڈاکٹر ڈگن سے ملنے کا وقت دریافت کرنے چلا گیا۔ پھر، پھرا کر کوئی ایک بجے واپس آیا۔ دیکھا کہ صاحب بہادر اپنے کمرہ میں براج رہے ہیں، شاید ان کو میرے آنے کا انتظار تھا کیونکہ ادھر میں کھانے کے کمرہ میں آیا اور اُدھر وہ بھی آپہنچے۔ لنچ شروع ہوا، پہلے تو صحیح صحیح کارروائی ہوتی رہی، اس کے بعد میں نے توس اُٹھایا۔ چھری سے اُس پر مکھن ملا۔ رائی کی بوتل میں چھری ڈال تھوڑی سی رائی نکالی اور ذرا پہلو بدل اس طرح ہاتھ چلایا گویا توس پر رائی مل رہا ہوں۔ بھلا نقل را چہ عقل، انھوں نے بھی کچھ انتظار کرکے پوری نقل اُتاری ادھر میں نے توس منہ میں رکھا اور اُدھر اُنھوں نے اپنے توس پر منہ مارا۔ خبر نہیں بچارے کے حلق پر کیا گزری۔ ہاں آئینہ میں یہ ضرور دیکھا کہ ایک دفعہ ہی اُن کے چہرے کی حالت کچھ بدل سی گئی۔ وہ کوشش کر رہے تھے کہ منہ سے نوالہ نکال کر پھینک دیں مگر میں ایک دفعہ ہی اُن کی طرف مڑ گیا اب بچارے کو نہ نوالہ اُگلتے بنتی ہے نہ نگلتے آخر کسی نہ کسی طرح حلق سے

اتار ہی لیا۔ اس کے بعد میں نے ان سے باتیں شروع کیں، باتیں کرتا جاتا اور توس کھاتا جاتا۔ انھوں نے بھی ڈرتے ڈرتے توس کا دوسرا ٹکڑا منہ میں رکھا اور چار کے سہارے نیچے اتارا۔ خدا خدا کر کے توس ختم ہوا۔ میں نے بھی اس سے زیادہ کارروائی مناسب نہ سمجھی۔ نیپکن لپیٹ میز پر ڈالا اور اُٹھ کھڑا ہوا۔ تھوڑی دیر کے بعد وہ بھی اپنے کمرہ میں آ گئے۔ اور حمام میں جا کُلّیاں کرنی شروع کیں۔ خدا جھوٹ نہ بلوائے، ہزاروں ہی کلیاں کر ڈالیں۔ جب کہیں جا کر کچھ ٹھنڈک پڑی۔ مجھے افسوس بھی ہوا اور ہنسی بھی آئی۔ افسوس تو اس لئے ہوا کہ بیٹھے بٹھائے ایک غریب کا منہ چھلنی کر دیا۔ اور ہنسی اس بات پر آئی کہ اس بے وقوف کو صاحب بننے کی کیا ضرورت تھی۔ خیر لنچ بھی خاصہ مزے سے گذر گیا۔

سہ پہر کو میں ڈاکٹر ڈگن سے ملا۔ تمام کیفیت بیان کی۔ اپنے مدراس جانے کا ذکر کیا۔ وہاں والوں کی رائے ظاہر کی کہ کس طرح کئی گھنٹے آنکھوں کا امتحان کرنے کے بعد مجھے صاف جواب دے دیا گیا۔ ڈاکٹر صاحب نے دو باتیں ایسی کہیں کہ میرے دل کو لگ گئیں۔ کہنے لگے "میں کسی کی بُرائی نہیں کرتا۔ ہاں یہ ضرور کہتا ہوں کہ آنکھوں کا زیادہ دیر تک امتحان کرنا کچھ مفید نہیں ہوتا۔ مریض کی آنکھیں گھورتے گھورتے پتھرا جاتی ہیں۔ اور اس کے بعد صحیح نتیجہ نکالنا دشوار ہوتا ہے۔ اب رہی تمھاری حالت تو اس کے متعلق میری یہ رائے ہے کہ آنکھوں کا تم کو کوئی مرض نہیں ہے۔ صرف صحیح نمبر کی عینک کی ضرورت ہے۔ ولایت جانا چاہتے ہو، چلے جاؤ مگر یہ سمجھ لو کہ جو کچھ میں کر سکتا ہوں اس سے زیادہ وہاں بھی تم کو توقع نہ کرنی چاہیئے۔ یورپ والوں کی یہ کیفیت ہے کہ بچپن ہی سے آنکھوں کا خیال

رکھتے ہیں۔ ذرا کچھ فرق آیا اور آنکھ کے ماہر فن کے پاس پہنچے۔ علاج کیا۔ عینک لی۔ چلو چھٹی ہوئی ہمارے ہاں لوگوں کی یہ حالت ہے کہ جب آنکھیں بالکل تباہ ہو جاتی ہیں اس وقت علاج کا خیال آتا ہے خیال آنے اور اُس پہ عمل کرنے میں بھی برسوں گزر جاتے ہیں۔ آخر خدا خدا کر کے ڈاکٹر کے پاس آتے ہیں۔ اور چاہتے ہیں کہ آج ہی اچھے ہو جائیں۔ یہی وجہ ہے کہ روزانہ جس رنگ برنگ کے مریض ہمارے دیکھنے میں آتے ہیں ویسے ولایت کے ڈاکٹروں کو برسوں میں بھی نہیں ملتے۔ اور جتنے آپریشن ہم ایک ہفتہ میں کر لیتے ہیں۔ وہاں کے ماہرین فن کو سال بھر میں بھی نہیں کرنے پڑتے۔ اس لئے یہ خیال تو بیکار ہے کہ ولایت جا کر تم یہاں سے کچھ زیادہ فائدہ حاصل کر سکو گے۔ ہاں اپنے اطمینان کے لئے جانا چاہتے ہو تو چلے جاؤ۔" میں نے کہا "ڈاکٹر صاحب! اندھا کیا چاہے، دو آنکھیں۔ جب یہیں مجھ کو آرام ہو جاتا ہے تو پھر میں کوئی دیوانہ ہوا ہوں کہ خواہ مخواہ روپیہ خرچ کر کے جرمنی یا فرانس جاؤں۔ اچھا اب آپ عینک کے نمبر نکالئے۔" اس میرے شیر نے دس منٹ میں نمبر نکال میرے حوالہ کئے اس کے بعد کچھ سوچ کر کہا "خیر ٹھیرو۔ میں دوا ڈال کر بھی نمبر دیکھ لیتا ہوں۔ اگر تھوڑی بہت کچھ غلطی ہوئی ہے تو وہ بھی نکل جائے گی۔" یہ کہہ انھوں نے میری آنکھوں میں دوا ڈالی اور دوسرے روز سہ پہر کو پھر آنے کی ہدایت کی۔ یہاں سے نکل میں پھرتا پھراتا شام کو ہوٹل پہنچا۔ دوا پڑنے سے ذرا آنکھ میں پردہ سا آگیا تھا۔ اس لئے رات کا کھانا میں نے اپنے کمرہ ہی میں کھایا۔ صاحب بہادر نے بھی میری تقلید کی۔ دوسرے دن بھی میں کھانے کے کمرہ میں نہیں گیا۔ مگر چونکہ ہمارے صاحب ان دو وقت کے

کھانوں سے واقف ہو چکے تھے اس لئے انھوں نے ناشتہ اور لنچ کھانے کے کمرہ ہی میں جا کر کھایا۔ منیجر صاحب میری خیریت پوچھنے آئے۔ ان سے دریافت کیا تو معلوم ہوا کہ صاحب نے کل کا سبق پوری طرح دوہرایا۔ ہاں اس روز توس کو ہاتھ نہیں لگایا۔ سہ پہر تک میری آنکھیں صاف ہو گئیں میں نے جا کر ڈاکٹر ڈگن کو دکھائیں۔ معائنہ کے بعد انھوں نے کہا کہ "میں پہلے اور اب کے نمبروں میں کوئی فرق نہیں پاتا۔ آپ شوق سے ان ہی نمبروں کی عینک خرید لیجئے۔ بہت دنوں کام دے گی۔ مگر جب اتر جائے تو مجھ سے آ کر ضرور ملئے۔ کہیں اُترے ہوئے نمبروں کی عینک نہ لگائے پھرئے۔ آنکھیں ستیا ناس ہو جائیں گی۔" وہاں سے ملنبرلے میں دنشا، ایم دستور کی دوکان پر پہنچا۔ نمبر دیئے۔ انھوں نے دوسرے روز عینک دینے کا وعدہ کیا۔ اور میں چوپاٹی، اپالو بندر اور ہار نبی روڈ کی سیر کرتا ہوا، رات کو کوئی ساڑھے سات بجے ہوٹل پہنچ گیا۔ چونکہ میرے قیام کا یہ آخری دن تھا اس لئے مجھے شرارت سوجھی۔ کھانے کے کمرہ میں جو سامنے الماری تھی۔ اس میں سلفر بٹرز[1] کی ایک بوتل، خبر نہیں کیوں رکھی ہوئی تھی۔ میں نے سوچا کہ صاحب کو آج یہ پلا دو۔

رات کو کھانے کے لئے کمروں میں سے ہم دونوں ساتھ نکلے۔ میں نے صاحب سے پوچھا "فرمائیے کچھ پینے کا بھی شوق ہے؟" کہنے لگے "ہاں پیتا ہوں۔ مگر کم۔ زیادہ پینا صحت کو مضر ہے۔" میں سمجھ گیا کہ یہ پیتے پلاتے

---

[1] سلفر بٹرز آتشک کی دوا ہے۔ شاہترہ۔ چرائتہ۔ اور تلخ چند ادویات کے عرق میں گندھک کو حل کر کے بنائی گئی ہے۔ ایسی تلخ ہوتی ہے کہ خدا کی پناہ۔

نہیں، صرف انگریزی کپڑوں کی لاج رکھنے کے لئے پینے کے دعوے دار ہو گئے ہیں۔ خیر، نیچے آکر وہی اپنی اپنی نشستوں پر دونوں بیٹھ گئے۔ کھانا شروع ہوا۔ میں نے بٹلر کو آواز دی کہ سلفر بٹرز کا ایک پگ لاؤ۔ وہ بیچارا گھبرایا کہ ہیں! کہیں اس بھلے آدمی کا دماغ تو خراب نہیں ہو گیا۔ مجھ سے تو کچھ نہیں کہا، سیدھا منیجر صاحب کے پاس پہنچا۔ وہ سمجھ گئے کہ کچھ تماشہ ہونے والا ہے۔ آگے آگے وہ اور پیچھے پیچھے بٹلر دونوں کمرہ میں آئے۔ بٹلر نے الماری کھول کر سلفر بٹرز کی بوتل سے ایک پگ نکال میرے گلاس میں ڈالا۔ میں نے سوڈا منگا کر گلاس بھر لیا۔ اور کھانا شروع کیا۔ تھوڑی تھوڑی دیر بعد گلاس اُٹھاتا منہ تک لے جاتا اور پھر گلدان کی آڑ میں رکھ دیتا کہ کہیں صاحب یہ نہ دیکھ لیں کہ بھرے کا بھرا گلاس ہے۔ میری دیکھا دیکھی انھوں نے بھی سلفر بٹرز کا ایک پگ لے کر اس میں سوڈا ملوایا۔ اس کے بعد جو ایک گھونٹ لیا تو قیامت آگئی۔ میرے ہاں تو برابر گھونٹ پر گھونٹ چل رہا تھا۔ وہ بھلا اپنا ہاتھ روک کر کیوں اپنی ہتک کراتے۔ کسی نہ کسی طرح پیے ہی گئے۔ بٹرز ایک قسم کی شراب بھی ہوتی ہے۔ سمجھے ہوں گے کہ جس بٹرز کا ذکر اُن کی کتاب آدابِ مجلس میں ہے شاید وہ یہی ہو گی۔ غرض گلاس ختم کرنا مشکل ہو گیا۔ بڑا گھونٹ لیں تو حلق سے اُترنا مشکل۔ چھوٹے گھونٹ لیں، تو گلاس کا ختم ہونا دشوار۔ آخر بصد خرابی بصرہ، کوئی آدھ گھنٹہ کے بعد گلاس ختم ہوا۔ مگر صاحب بہادر کی طبیعت کچھ ایسی بگڑ گئی کہ میٹھا کھائے بغیر، میز پر سے اُٹھ گئے۔ کمرہ میں جا کر ان پر کیا گذری۔ یہ تو خدا کو معلوم ہے۔ لیکن یہ ضرور ہے کہ دوسرے دن بچارے نے دو وقت کا غوطہ کیا۔ میں دوسرے دن سہ پہر کو دنشا کی دوکان پر گیا اور عینک

لے آیا۔ ایسی ٹھیک بیٹھی کہ دل خوش ہوگیا۔ اب گھر جانے کی سوجھی۔ اور شام ہی کو روانہ ہوجانے کا ارادہ کرلیا۔

میں نے جب دوسروں کی ہنسی اُڑائی ہے تو اپنی بے وقوفی کو کیوں چھپاؤں۔ ایک مسلمان بھائی نے مجھے بھی بے وقوف بنایا اور خوب بنایا۔ دلشا دوکان سے میں ٹریم میں سوار ہوا۔ میرے ساتھ ساتھ ایک بھلے آدمی ٹریم میں داخل ہوئے۔ اُن کی شکل اب تک میری آنکھوں کے سامنے ہے چھریرا بدن، سفید رنگ، میانہ قد۔ بھورے بال۔ سر پر ترکی ٹوپی جسم پر خاکی کوٹ پتلون۔ کوٹ کے اوپر بغیر ہاتھوں کے کیپ دار برساتی۔ جب ٹریم میں وہ میرے پاس سے گذرنے لگے تو مجھے ایسا معلوم ہوا کہ میری شیروانی کی جیب میں سے روپیوں کا بٹوہ خود بخود اوپر کو اُٹھا چلا آرہا ہے۔ میں نے ایک دفعہ ہی جیب پر ہاتھ ڈالا۔ کیا دیکھتا ہوں کہ بٹوہ جیب سے باہر آگیا۔ خیر، بٹوہ کو اندر کیا۔ اور ان صاحب کی طرف دیکھ کر مسکرایا کہ آپ تیز ضرور ہیں، مگر میں آپ سے بھی کچھ زیادہ تیز ہوں انھوں نے شرما کر گردن نیچے کرلی۔ تھوڑی دیر میں ٹریم ٹھیری۔ دو آدمی اندر آئے اور آنکھوں ہی آنکھوں میں ان صاحب سے کچھ باتیں ہوگئیں۔ اُس وقت تو میں نہیں سمجھا تھا مگر ہاں بعد میں سمجھ میں آیا کہ یہ دونوں اُن حضرت کے ساتھی تھے۔ خیر، یہاں سے چل کر ٹریم کرافورڈ مارکٹ پر رُکی۔ ترکی ٹوپی والے صاحب پہلے اُتر گئے۔ اور اُن کے دونوں یار بھی نیچے اُترنے کو ایک ساتھ بڑھے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ دونوں دروازہ میں پھنس گئے۔ مجھے اُترنے کی جلدی تھی۔ میں ان دونوں کو چیر کر نیچے اتر گیا۔ جو صاحب پہلے نیچے اُترے تھے ان کو دیکھ کر میں مسکرایا کہ جناب ہر شخص کی جیب سے بٹوہ نکالنا آسان کام نہیں۔ مگر بجائے شرمندہ ہونے

سے کہ وہ بھی مسکرائے۔ اور ایک طرف چل دیے۔ اب جو جیب میں ہاتھ ڈالتا ہوں تو بٹوہ غائب۔ اُس وقت ان لوگوں کی ترکیب سمجھ میں آئی کہ ایک صاحب نے نیچے اتر کر مجھے مطمئن کر دیا۔ دو نے اس طرح راستہ روکا کہ مجھے دونوں ہاتھوں سے ان کو ہٹانا پڑے۔ اُن میں سے ایک نے اس کشمکش میں بٹوہ غائب کر دیا۔ غنیمت یہ ہوا کہ جتنے روپے میں لے کر گیا تھا وہ عینک والے کو دے آیا تھا۔ شاید پانچ روپے کا ایک نوٹ اور کچھ آنے رہ گئے تھے۔ ہاں ڈاکٹر ڈگن نے عینک کے جو نمبر دیئے تھے وہ بٹوے کے ساتھ گئے۔ واقعی کسی نے سچ کہا کہ مَنْ ضَحِكَ ضُحِكَ (جو دوسروں پر ہنستا ہے اُس پر دوسرے ہنستے ہیں) بہر حال میں ہوٹل میں سے جا کر اور روپے لایا اور دوسرا بٹوہ خریدا۔ دنشا کے ہاں جا کر نمبروں کی نقل لی۔ لیکن اس کارروائی نے کچھ ایسا کھسیانا کر دیا کہ پھر اپنے صاحب بہادر کو بھی بھول گیا۔ سات بجے کمرہ میں کھانا منگا کر کھا لیا۔ اور ساڑھے آٹھ بجے کے میل سے روانہ ہو گیا۔ بلا سے روپے گئے تو گئے۔ ایک مزے دار مضمون تو مل گیا ہاں یہ کہے دیتا ہوں کہ پڑھنے والے حضرت براہ کرم حتی المقدور اس کو فرضی قصہ سمجھنے کی کوشش کریں تو زیادہ مناسب ہے۔

عالم بیکسی و بے بسی

جناب اڈیٹر صاحب تسلیم! مضمون بھیجتا ہوں۔ مگر آپ دیکھتے ہی کہیں گے کہ۔ ہیں یہ تو متانت سے گرا ہوا ہے! جی ہاں۔ گرا ہوا ہے۔ اور ضرور گرا ہوا ہے۔ اور کیوں نہ گرتا۔ جب میں نے خود اس کو گرایا ہے۔ "نستعلیق اصحاب" کا کلام تو بہت چھپ چکا ہے۔ اور چھپے گا۔ کچھ دلی کے "یار لوگوں" کی غپیں بھی ہو جائیں۔ متانت کی گفتگو نہیں ہے، تو نہ سہی۔ پرانے زمانہ کی سوسائٹی کے ایک پہلو پر روشنی تو پڑتی ہے۔ جناب والا! یہ "یار لوگ" نہ ہوتے، تو دلی کا ہے کو لٹتی۔ امیر تیمور اور نادر شاہ جیسوں نے دلی کی تاریخ بنائی ہے اور ان حضرات نے یہ تاریخ بنوائی ہے

محمد حسین آزاد تو "ہائے دلی۔ ہائے دلی" کی راگنی سناتے سناتے اٹھ گئے۔ اب میری باری ہے۔ میں بھی وہی دھن الاپتا ہوں کہ "ہائے دلی"

ہائے کیا کہوں جب پہلی باتیں یاد آتی ہیں تو دل پر سانپ سا لوٹ جاتا ہے۔ نہ وہ اب صحبتیں رہیں نہ وہ محبت، نہ وہ دلی والے رہے نہ وہ زندہ دلی۔ نہ وہ بے فکری رہی، نہ وہ وضع داری۔ کوئی گھر نہ تھا، جہاں روزانہ کم سے کم دو چار دوست جمع نہ ہو جاتے ہوں۔ گھر میں جگہ نہ ہوئی تو کیا پروا ہے۔ دل میں تو جگہ تھی۔ سڑک ہی پر مونڈھے بچھ جاتے جب منگلو کے چھتہ سے گزر جاتا ہوں، تو پرانی صحبتیں یاد کر کے دل

بیٹھ جاتا ہے۔ چھتہ سے ملا ہوا ہی میر صاحب کا مکان تھا۔ مردانہ کا کوئی حصہ نہ تھا۔ پھر بھی ڈیوڑھی سے کام نکال لیا جاتا تھا۔ ڈیوڑھی میں دس بارہ مونڈھے ہیں۔ کچھ پرانے۔ کچھ نئے۔ کچھ ٹوٹے ہوئے۔ کچھ ثابت۔ بعض بان سے بنے ہوئے۔ بعض پر ہرن کی کھال منڈھی ہوئی۔ بازو میں بے دوان کا ایک جھلنگا پڑا ہوا ہے۔ اور میر صاحب اس پر براج رہے ہیں۔ یار دوست آتے۔ حقہ پان سے تواضع کی جاتی۔ اور یک جہتی اور اتحاد کے دم لگائے جاتے۔ اب نہ وہ دلی ہے اور نہ وہ جلسے۔ جدھر جاؤ یہ لے' وہ دے کی صدا ہے۔ جس طرف نکل جاؤ ٹکوں کا ذکر اور نفع کا فکر ہے۔ بچے کھچے گنتی کے چند پرانے گھرانے رہ گئے ہیں۔ اُن کی حالت بھی "تو چل میں آیا" پر پہنچ گئی ہے۔ اس کے بعد پھر اللہ ہی اللہ ہے۔

میر صاحب کا مکان دیکھتا ہوں، تو پچھلے نقشے آنکھوں میں پھر جاتے ہیں۔ یہ کون ہیں۔ کہ مرزا صاحب! "آئیے آئیے مرزا صاحب۔ آپ کی تو شکل ہی نظر نہیں آتی۔ کئی روز سے انتظار تھا۔ آخر کہاں غائب ہو گئے تھے۔ آئیے۔ بیٹھیئے۔ میاں صاحب زادے۔ ہمارے مرزا صاحب کے لئے حقہ تو لاؤ۔ مگر دیکھنا ذرا، توا ٹھنڈا کر لینا۔ کہیں بھڑک نہ جائے۔ سامنے کرٹیل میں اُپلا دبا ہے۔ اور دیکھنا اُس طاق میں تمباکو رکھا ہے۔"

مرزا صاحب کی شکل ملاحظہ فرمایئے۔ کوئی سات فٹ کا قد۔ سفید رنگ۔ کتابی چہرہ۔ ستواں ناک۔ غلافی آنکھیں۔ اُن میں قدرتی لال ڈورے۔ چڑھی ہوئی ڈاڑھی جس کا ایک ایک بال سرکار

انگریزی کی فوج کی طرح اپنی اپنی جگہ ٹنشن (استادہ) سر پر چوگوشیہ ٹوپی۔ نیچی چولی کا انگرکھا۔ اس پر نیم آستین۔ جس کا سینہ کھلا ہوا۔ ایک برکا پاجامہ۔ پاؤں میں سلیم شاہی جوتی۔ ہاتھ میں رام پوری بانس کی چھڑی۔ اوپر چاندی کی موٹھ۔ نیچے لوہے کی شام۔ ہنستے ہوئے آئے اور نہایت متانت کے ساتھ ایک مونڈھے پر بیٹھ گئے۔ میری طرف مخاطب ہوکر فرمانے لگے "میاں صاحب زادے کہو میر صاحب کچھ پڑھاتے بھی ہیں یا صرف چلمیں ہی بھرواتے ہیں۔ میں آداب کر کے خاموش ہو گیا۔

مرزا صاحب "ارے میاں میر صاحب! کیا کروں مرزا نوشہ پیچھا نہیں چھوڑتے۔ اُدھر گیا اور پھنسا۔ کئی روز سے آنے کا ارادہ کر رہا تھا۔ لیکن وہاں سے نکلتے نکلتے وقت ایسا تنگ ہو جاتا تھا کہ ادھر آنے کی ہمت نہ ہوتی تھی۔ بارے خدا خدا کر کے ان سے آج ذرا سویرے پنڈ چھڑایا تو تم سے ملنا نصیب ہوا۔ ارے بھئی، ہمارا کیا ہے۔ جہاں بیٹھ گئے۔ بیٹھ گئے۔ اور ہاں میر صاحب وہ ہمارے شیخ جی کہاں ہیں۔ ان کو بہت دنوں سے نہیں دیکھا"

میر صاحب "اب آتے ہی ہوں گے۔ ایلو۔ وہ آئے۔ یار بڑی عمر ہے۔ ابھی مرزا صاحب تم کو یاد کر رہے تھے"

شیخ جی بڑے سوکھے سہمے آدمی تھے۔ داڑھی بھی کچھ واجبی واجبی سی تھی۔ رنگت تو اتنی کالی نہ تھی۔ لیکن چیچک کی وجہ سے منہ پر کچھ بھوسی سی اُڑنے لگی تھی۔ مگر تھے بڑے وضع دار۔ عمر گو پچاس سے بہت اوپر تھی۔ پھر بھی گوشہ کی ٹوپی اور مشروع کا پائجامہ نہ چھوٹتا تھا۔

شیخ جی: "اوہو، مرزا صاحب اور یہاں! ہم تو یہ سمجھتے کہ تم مرزا نوشہ کے ہو رہے۔ میاں ہم بھی شاعر ہیں۔ ہمارے بھی استاد ہیں لیکن یار اس طرح اُستاد کا دُم چھلہ کوئی نہیں بن جاتا۔ شاعری کیا ہوئی بلائے جان ہوئی۔ اور اُستاد کیا ہوئے کہ لاسہ ہو گئے۔ بندۂ خدا جاؤ۔ لو اصلاح لو۔ لیکن یہ تو نہیں کہ یاروں کو بھی چھوڑ بیٹھو۔ ہاں بھئی، کیوں نہ ہو نیر ھویں صدی ہے۔"

باہر سے آواز آئی "کیوں بھئی ہم آئیں؟"

شیخ جی: "آئیے۔ آئیے۔ واہ بھئی، واہ۔ میں تو سمجھا تھا کوئی بھلا آدمی ہوگا۔ کیا خبر تھی کہ القربہ خواہ مخواہ مرد آدمی آئے ہیں۔ کیوں میاں نواب! یہ تم کو آواز دینے کی کیا ضرورت تھی۔ کیا پرایا گھر سمجھے تھے؟ دیکھو حضنت (حضرت) دوستوں میں یہ تکلفات ہوئے تو پھر دوستی کا خدا حافظ۔"

نواب بالکل شیخ جی کی ضد تھے۔ جتنے وہ دُبلے تھے اتنے یہ موٹے تھے۔ وہ ٹھنگنے تھے اتنے یہ اونچے لمبان چوڑان میں انیس بیس کا فرق بھی باقی نہیں رہا تھا۔ مربع کی مثال میں بآسانی پیش کئے جا سکتے تھے۔ آگے پیچھے کی گولائی کے چکروں نے ثابت کر دیا تھا کہ حرف (S) کی ابتدا ر کیونکر ہوئی ہے۔ وزن کا اندازہ ترازوؤں کے ٹوٹنے سے کبھی نہ ہو سکا۔ روزی سے بے فکر تھے۔ اس لئے پیتے بھی تھے۔ اس وقت بھی بھنگیائے ہوئے تھے۔ لیکن نہ ایسے کہ بہک جائیں۔ لباس تو وہی پرانی وضع کا تھا۔ مگر منڈا جوتہ، زمانہ کے تغیرات کا اثر دکھا رہا تھا۔ اندر آتے ہی بڑے زور سے "سلام علیکم" کا نعرہ مارا۔ اور بیٹھنے کو ایک مونڈھے کی طرف بڑھے۔

میر صاحب: بھئی نواب۔ ذرا سنبھل کے۔ واللہ میں نے آج

ہی چھ آنے کو لیا ہے۔ تم بیٹھے اور یہ پچپا۔ (پچکا) نا بھئی، خدا کے لئے تم اپنے اسی مونڈھے پر جاؤ۔"

نواب:۔ "یار موٹا ہونا بھی غضب ہو گیا۔ میر صاحب ایسا ہی مونڈھوں کا خیال ہے تو بھئی، ہمارے لئے تخت بچھوا دو۔ اور اگر وزن ہی پر مونڈھوں کی تقسیم ہوتی ہے تو ہمارے شیخ جی کے لئے ایک ڈگڈگی خرید لو۔"

شیخ جی:۔ "دیکھو نواب۔ تم بہت چل نکلے ہو۔ جب دیکھو مجھ پر حملہ کر بیٹھتے ہو۔ میرا دُبلا ہونا مصیبت ہو گیا۔"

نواب:۔ "تو شیخ جی۔ کیا موٹا ہونا کچھ گناہ ہے؟ جب دبلے موٹوں کی ہنسی اُڑائیں تو موٹے، دبلوں کو کیوں چھوڑ دیں۔ آہا۔ مرزا صاحب بھی براج رہے ہیں۔ قسم خدا کی۔ اندھیرے میں آپ کی صورت نظر نہیں آئی۔ اجی حضنت (حضرت) آج آپ کہاں آنکلے۔

مرزا صاحب:۔ "اندھیرے میں صورت نظر نہیں آئی یا آنکھوں پر چربی چھا گئی ہے۔ شیخ جی جیسا ننھا منا آدمی تو نظر آگیا۔ اور مجھ جیسا ہٹا کٹا آدمی نظر نہ آیا۔"

نواب:۔ "دیکھا شیخ جی۔ مرزا صاحب نے موٹے اور دبلے دونوں پر ہاتھ صاف کیا۔ ارے میاں میر صاحب۔ یہاں حقہ تو نظر ہی نہیں آتا۔ آخر کنجوسی کی کوئی انتہا بھی ہے۔ دعوت داوت تو بخیر، یاروں پر حقہ پانی بھی بند کر دیا۔"

میر صاحب:۔ "خفا کیوں ہوتے ہو۔ ایلو۔ حقہ بھی آگیا۔ مگر بھئی تم بیٹھتے کیوں نہیں۔ کیا کھڑے پیر کا روزہ رکھ کر آئے ہو۔"

نواب:۔ "بیٹھوں کہاں۔ دیکھ رہا ہوں کہ کون سا مونڈھا اس

تن نازک کو سہار سکے گا۔ بھئی تم جانتے ہو مثل ہے "مونڈھا بقدر ڈھونڈا"۔

مرزا صاحب:۔ "واہ بھئی۔ واہ خدا کی قسم کیا بے تکی مثل کہی ہے۔ اور حضرت یہ ڈھونڈا کون سی زبان کا لفظ ہے۔ اور اس کے معنی کیا ہیں"؟

نواب:۔ "آکا۔ تم نے کبھی سنسکرت بھی پڑھی ہے"؟

مرزا صاحب:۔ "نہیں"

نواب:۔ "یہ خاص سنسکرت کا لفظ ہے! اور اس کے معنی ہیں جسم اور جسم بھی کمترین کا سا جسم۔ سمجھے"

مرزا صاحب:۔ "اس کا ثبوت"

نواب:۔ "یار عزیز! تم کو تو مرزا نوشہ کی صحبت نے دین دنیا دونوں سے کھو دیا۔ اب تم سے بات کرنا بھی مشکل ہو گیا ہے۔ منہ سے کوئی بات نکلی اور تم نے کہا "ثبوت" میاں۔ کوئی ہم شاعر ہیں جو ثبوت کا گٹھرا اپنے ساتھ لئے پھریں۔ مانتے ہو مانو۔ نہیں مانتے نہیں مانو چلو چھٹی ہوئی"۔ یہ کہتے کہتے نواب صاحب ایک مونڈھے پر ٹک ہی گئے۔ گو ابتدا میں مونڈھے نے بہت آہ وزاری کی مگر آخر کو "بر سر اولاد نسل ہر چہ آید بگزرد" کہہ کر خاموش ہو گیا۔

نواب:۔ "کہو بھئی مرزا! آج کل مرزا نوشہ کس رنگ میں ہیں؟ اس میرے یار نے تو دنیا سے لڑائی باندھ رکھی ہے۔ کہتے ہیں کہ میرا شعر کوئی سمجھتا ہی نہیں۔ اب خدا جانے یہ ان کے شعر کی خوبی یا سننے والی کی سمجھ کا قصور"۔

مرزا صاحب:۔ "دیکھو بھئی۔ نواب۔ استاد کے متعلق ذرا

سنبھل کے بولا کرو۔ جس چیز سے تمھیں مس نہیں ہے اس میں خواہ مخواہ ٹلو چلانے سے کیا فائدہ۔ اب رہے ہم، تو، ہم کو تمھارا جو جی چاہے کہہ لو۔"

نواب "۔ اجی واہ آکا۔ تم تو بگڑ ہی گئے۔ خدانخواستہ ہم نے میاں نوشہ کو بُرے دل سے تھوڑے ہی کچھ کہا ہے۔ بھلا ان کی استادی میں شک کرکے کون کافر بنے۔ تو۔ حقہ۔ لو۔ ذرا طبیعت ٹھنڈی ہوگی۔"

میر صاحب "ہاں۔ مرزا صاحب۔ یہ تو کہو آج کل اُستاد ہیں کس رنگ میں۔ ان کی تو عجیب حالت ہے۔ صوفیانہ رنگ کو لیا تو مہینوں اُسی رنگ میں رنگے رہے رندانہ مضامین پر اُتر آئے، تو برسوں اسی میں گھلا دیئیے۔

مرزا صاحب "۔ آج کل عالم بے کسی و بے بسی کو نئے نئے انداز سے باندھ رہے ہیں۔ ہائے فرماتے ہیں۔

ہوا مخالف و شب تار و بحر طوفاں خیز — گستہ لنگر کشتی و ناخدا خفت است

نواب "۔ لو بھئی، اب میں کچھ کہوں تو مفت لڑائی مول لوں۔ اجی حضرت۔ جس کی نہ پھٹے کبھی بوائی وہ کیا جانے پیڑ پرائی۔ ان پر کون سا بے کسی کا عالم گزرا ہے جو ان کے الفاظ میں درد اور ان کے مضمون میں اثر ہوگا۔ بھئی۔ بے کسی کا عالم ہم سے پوچھو ہم سے پوچھو یاروں پر جو گزر رہی ہے۔ وہ ہم ہی جانتے ہیں۔ میاں ہم سمجھتے ہیں بے کسی اور بے بسی کس کو کہتے ہیں۔"

شیخ جی "۔ اللہ خیر کرے۔ آپ بھی شاعر ہو گئے۔"

نواب: "واہ۔ شیخ جی۔ واہ۔ سمجھے اور خوب سمجھے۔ ارے بندۂ خدا یہ کس نے کہا ہے کہ میں شاعر ہوں۔ میں نے تو یہ کہا تھا کہ گاؤ تکیہ سے لگ کر بیٹھنے سے بےکسی کے مضمون نہیں سوجھتے۔ پہلے کسی مصیبت کو جھیلو۔ جب معلوم ہو گا کہ بےکسی اور بےبسی کیا چیز ہے۔"

میر صاحب: "تو نواب صاحب۔ ہم بھی تو سنیں کہ۔ آپ پر کون سی بپتا پڑی تھی جو آپ سے بہتر اس مضمون کو کوئی ادا نہیں کر سکتا۔"

نواب: "نظم میں سناؤں یا نثر میں۔"

مرزا صاحب: "خدا کے لئے آپ نظم پر تو رحم کیجئے۔ نثر ہی میں ارشاد فرمائیے۔"

نواب صاحب: "مگر بھئی تم لوگ ہنسو گے۔ اور مجھے غصہ آئیگا تم جانتے ہو کہ ایک کی بےکسی، دوسروں کی ہنسی کا باعث ہو جاتی ہے۔"

شیخ جی: "نواب صاحب آپ بھی غضب کرتے ہیں۔ یار تمھاری مصیبت۔ اور ہم ہنسیں۔ بھائی توبہ کرو توبہ۔"

نواب صاحب: "اچھا۔ بھئی۔ اچھا کہتا ہوں۔ مگر ذرا حقہ تو اِدھر سرکاؤ۔" نواب صاحب کی طرف حُقّہ کھسکا دیا گیا۔ انھوں نے دو چار دم لگائے۔ منہ اوپر کر کے آہستہ آہستہ دھواں چھوڑا اور ایک دفعہ ہی زور سے قہقہہ مار کر کہنے لگے "بھئی۔ اب ان واقعات کا خیال آتا ہے، تو میں خود ہنسنے لگتا ہوں۔ مگر اس وقت کی میری بےبسی و بےکسی دیکھنے سے تعلق رکھتی تھی۔ کوئی دس برس کا زمانہ ہوا کہ

ایک کام سے مجھے غازی آباد جانا پڑا۔ کبھی گھر سے نکلا نہ تھا۔ غازی آباد کا سفر بھی میرے لئے ولایت کا سفر ہوگیا۔ اس زمانہ میں میرا جسم بھی ماشاء اللہ کسی قدر بھاری تھا۔"

شیخ جی۔"اوہو۔ نواب، خیر سے، آپ دبلے ہیں۔ واللہ اُس زمانہ میں تو دیکھنے کے قابل ہوں گے۔"

نواب۔"شیخ جی۔ خدا کے لئے جب انسانوں کا ذکر ہو تو آپ تو نہ بولا کریں۔ آپ کی کھال کو تو رہیہ لگ گئی ہے نہ گھٹ سکتی ہے۔ نہ بڑھ سکتی ہے۔ میاں۔ ہماری کھال ربڑ ہے۔ ربڑ۔ جتنا اللہ کے فضل سے جسم میں اضافہ ہوتا ہے۔ اتنی پھیلتی جاتی ہے۔"

میر صاحب۔"اجی شیخ جی۔ تم ہمیشہ مزے میں کھنڈت ڈال دیتے ہو۔ کہاں کی بات کہاں ملا دی۔ ہاں۔ بھئی، نواب آگے کہو۔" یہ کہتے کہتے میر صاحب اپنے پلنگ پر کسی قدر دراز ہوگئے۔

نواب کچھ کہنا چاہتے تھے کہ کہتے کہتے رک گئے اور بڑے زور سے قہقہہ مارا۔

مرزا صاحب۔"کیوں نواب کچھ خیر تو ہے۔ کہیں دورہ تو نہیں اُٹھا۔"

نواب۔"نہیں آکا۔ اس وقت یاروں کی نشست پر مجھے ایک پھبتی سوجھی ہے۔ ذرا قورمہ کا ہاتھ تولانا واللہ کیا تشبیہ ہے۔"

مرزا صاحب۔"بھئی۔ میں یہ معمہ کچھ نہیں سمجھا۔ آخر یہ ہے کیا۔ تم تو پہیلیاں بجھواتے ہو۔"

نواب۔"بھلا یہ تو بتاؤ ہم کس سلسلہ سے بیٹھے ہیں۔"

مرزا صاحب۔"پہلے میں۔ پھر شیخ جی۔ پھر تم۔ اس کے بعد

میر صاحب۔ میر صاحب جھلنگے پہ کچھ بیٹھے ہیں۔ کچھ لیٹے ہیں۔"

نواب۔" مرزا صاحب۔ تمھیں خدا کی قسم داد دینا۔ لاحول نے کا سلسلہ قائم ہو گیا ہے یا نہیں۔"

میر صاحب۔ میاں نواب تم بھی عجیب آدمی ہو۔ کیا کہہ رہے تھے اور کدھر سے کدھر نکل گئے آخر اپنا قصہ ختم کرو۔

نواب۔" ہاں بھئی تو میں نے کہاں تک کہا تھا۔"

میر صاحب۔" تم غازی آباد پہنچے۔"

نواب۔" خیر غازی آباد گیا۔ راستہ میں بھارکس کے ہچکولوں نے بھرکس نکال دیا۔ خدا خدا کر کے چار گھنٹہ میں ۵½ کوس زمین طے ہوئی۔ تھکا ہوا تو تھا ہی۔ سرائے میں جا کر ایسی لمبی تانی کہ نو بجا دیئے اُٹھا، تو پنجانے کی تلاش ہوئی۔ لوگوں سے پوچھا، انھوں نے ایک طرف اشارہ کر دیا۔ ادھر گیا۔ کیا دیکھتا ہوں کہ کونے میں ایک الماری کھڑی ہے۔ لیکن نظر نہیں آتا کہ پنجانہ کہاں ہے۔ لوگوں سے پھر جا کر پوچھا، تو معلوم ہوا کہ جس کو میں الماری سمجھتا تھا وہی اُن بھلے مانسوں کا بیت الخلا ہے اب میری جسامت کو دیکھو۔ رات ہوتی تو ادھر اُدھر بادشاہی پودے لگا دیتا، دن اور وہ بھی نو بجے دن۔ کروں تو کیا کروں۔ جب بیتابی حد کو پہونچ گئی تو اس الماری کا پٹ کھولا۔ کیا دیکھتا ہوں کہ ایک چھوٹے سے قدمچہ کے گرد آڑ کے لئے چیڑ کے تختہ جڑ دیئے ہیں۔ اب اگر سیدھا اندر چلا جاتا ہوں تو اندر جا کر مڑوں گا کیونکر آخر یہ ترکیب سوجھی کہ اُلٹے پاؤں اندر دھنس جاؤ۔ زور کر کرا کے اندر پہنچ ہی گیا۔ لوٹا رکھنے کے لئے کوئی جگہ نہ تھی۔ وہ تو خدا بھلا کرے میری توند کا، اس کے سہارے

سے مشکل بھی آسان ہوئی۔ اور خدا خدا کرکے بیتابی میں بھی افاقہ ہوا۔ اب ختم کارروائی کے دو چار ہاتھ رہ گئے۔ یہ ذرا ٹیڑھی کھیر تھی۔ جب تک کہنیاں اور گھٹنے نہ پھیلیں یہ کام کیونکر ہوں۔ المار ی میں تو پہلے ہی انگوٹھی کا نگینا بنا بیٹھا تھا۔ اس پھیلاؤ کی جگہ لاؤں، تو کہاں سے لاؤں۔ آخر زور کرکے کہنیاں اور گھٹنے کچھ نہ کچھ پھیلا ہی دیئے۔ اس زورا زوری میں پہلے تو پہلو کے تختوں نے "چرڑ چرڑ۔ چرڑ۔ چرڑ" کی۔ پھر ایک دفعہ ہی میری کہنیاں اور گھٹنے تختے توڑ پار نکل گئے۔ اب ہزار کوشش کرتا ہوں، نہ کہنیاں نکلتی ہیں، نہ گھٹنے نکلتے ہیں۔ معلوم ہوتا تھا کہ کسی نے مربع کے چاروں کونوں کو کیلوں سے کس دیا ہے۔ ایک ہاتھ میں بھرا ہوا لوٹا۔ دوسرا ہاتھ ذرا نیچے کی طرف مائل۔ غرض عجیب ہیئت کذائی بن گئی۔ تھوڑی دیر تک تو میں نے ہاتھ پاؤں مارے لیکن کہنیاں اور گھٹنے نہ چھوٹنا تھے نہ چھوٹے۔ اتنے میں دوسرے مسافروں نے نکلنے کا تقاضا شروع کیا۔ پہلے تو میں "ہوں۔ ہوں" کرکے ٹالتا رہا، مگر جب کاٹھ میں کسے ہوئے گھنٹہ بھر گذر گیا تو لاچار ایک مولوی صاحب سے جنھوں نے پانچویں چھٹی مرتبہ کھنکارا اور دروازہ کھٹکھٹایا تھا۔ میں نے کہا "حضرت نکلوں، تو کیونکر نکلوں۔ مجھ کو تو آپ کے صندوق نے پکڑ لیا۔ مجھ سے ہلا کب جاتا ہے آپ ذرا دروازہ کھول لیے، تو میری حالت معلوم ہو۔" وہ بیچارے سمجھے کسی بیماری کا دورہ ہوا ہے۔ دوسرے مسافروں کو بھی بلا لیا۔ اور سب نے مل کر دروازہ کا پٹ شرماتے شرماتے کھولا۔ اندر انھوں نے جو بے بسی کی تصویر دیکھی ہوگی وہ آپ کے کسی شاعر کے حاشیۂ خیال میں بھی نہیں آسکتی۔ بہرحال غل مچ گیا کہ ایک صاحب

پچانہ میں پھنس گئے۔ تمام شہر ٹوٹ پڑا بڑھیوں نے نہانیوں سے تختوں کی پچریں نکالنا شروع کیں ادھر میں نے زور لگایا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ایک دفعہ ہی میرے چاروں ہاتھ پاؤں نکل آئے۔ لیکن ساتھ ہی اس کش مکش میں ایسا جھٹکہ لگا کہ میں منہ کے بل دروازہ پر گرا صندوق ٹھیرا چیڑ کا اور وہ بھی باوا آدم کے وقت کا۔ بوجھ پڑا اس پہ دس من کا۔ قبضے اور چولیں سب اُکھڑ گئیں اور دروازے کا دروازہ سارا پیرا، سامنے جا پڑا اور میں اپنے زور میں قلا بازیاں کھاتا ہوا تماشائیوں کی خدمت میں حاضر ہو گیا۔ غرض مجھ غریب کا یہ دوسرا نقشہ بے کسی کا تھا جو ان دیہاتیوں کی ضیافت طبع کا باعث ہوا۔

ان تابڑ توڑ مصیبتوں نے کچھ ایسا سٹپٹا دیا کہ میں نے آؤ دیکھا نہ تاؤ مجمع کو چیرتا پھاڑتا، بھاگا اور سامان واسان چھوڑ چھاڑ سیدھا بہارکس میں گھس گیا۔ بیل لگاتے لگاتے لوگوں نے بہارکس کا تماشا بنا لیا۔ مگر یار یہ ضرور کہوں گا کہ جس شان و شوکت سے میں غازی آباد سے چلا ہوں ایسی روانگی کسی لاٹ صاحب کو بھی نصیب نہ ہوئی ہوگی۔

میاں مرزا جن لوگوں پر ایسی گذرے، وہ بے کسی کا نقشہ کھینچ سکتے ہیں۔ یہ نہیں کہ پانی کے نام سے تو دم نکلے اور کہیں یہ کہ

ہوا مخالف و شب تار و بحر طوفاں خیز گسستہ لنگر کشتی و ناخدا خفت است

یہ کہہ کر، نواب صاحب لڑھکتے لڑھکاتے، دروازے کی طرف چلے۔ سب کہتے ہی رہے "ارے میاں، ٹھیرو ٹھیرو" لیکن یہ کب کسی کی ماننے والے تھے دروازہ سے نکل، یہ جا۔ وہ جا۔ ہو گئے۔ ان کے جانے کے بعد تھوڑی دیر تک تو سناٹا رہا۔ پھر شیخ جی بولے "کہو بھئی مرزا۔ اس نواب نے

یہ سچا قصہ کہا، یا غپ ہی غپ اڑا گیا۔"

مرزا صاحب۔ "شیخ جی کیا کہوں کچھ سمجھ میں نہیں آتا۔ نواب کے تیور تو بتا رہے تھے کہ سچ کہہ رہا ہے۔ آگے وہ جانے اور اس کا دین ایمان جانے۔"

میر صاحب۔ "میاں مرزا یہ قصہ سچ ہو یا جھوٹ۔ مگر یار یہ صحبتیں بھی یاد رہیں گی۔ اب یہ میاں صاحب زادے بیٹھے ہیں۔ بڈھے ہوں گے تو کہا کریں گے کہ پرانے لوگ ایسے تھے اور ایسے تھے ان قصوں کا خیال کر کے ہنسیں گے۔ لیکن ان صحبتوں کو یاد کر کے خود روئیں گے اور دوسروں کو رُلائیں گے۔ سچ ہے ہمیشہ رہے نام اللہ کا۔"

کچھ تو ان بزرگوں کے ارشاد کی تعمیل تھی اور کچھ دل کا درد تھا جو دل سے نکل کر لفظوں کی شکل میں زبان قلم پر آ گیا ہے۔

ان نینن کا یہی بسیکھ ہے وہ بھی دیکھا یہ بھی دیکھ (پرکھن)

دامِ خیال

ہستی کے مت فریب میں آجائیو اسدؔ
عالم تمام حلقۂ دامِ خیال ہے

"عالم تمام حلقۂ دامِ خیال ہے" خیالات کے ساتھ ساتھ دنیا کا رنگ بھی بدلتا رہتا ہے۔ یہ تبدیلی خیالات ہی کا نتیجہ ہے کہ پہلے جن چیزوں کو اچھا سمجھتے تھے۔ وہ اب بُری ہوگئیں۔ اور جن کو برا جانتے تھے۔ وہ اچھی۔ موجودہ زمانہ کو گھٹتی کا پہرہ کہتے ہیں۔ ہاں۔ ہوگا۔ بظاہر تو صحیح معلوم ہوتا ہے۔ روحانیت کٹ چھنٹ کر اب مادیت رہ گئی ہے اور امراض دیوتاؤں کے رتبہ سے گھٹ گھٹا کر کیڑے مکوڑے بن گئے ہیں۔ ہر مرض کا ایک الگ کیڑا ہے اور ہر آزار کا ایک جدا جرثومہ وہ دن دور نہیں کہ اخلاقی امراض کے کیڑے دریافت ہو جائیں۔ خوردبینوں سے دکھا دیئے جائیں۔ اور پچکاریوں کے ذریعہ سے ان کو جسم میں داخل کر کے انسانوں کو روحانیت کے تمام مدارج طے کرا کے عرشِ معلیٰ پر پہنچا دیا جائے۔ یا مادیت کے سب مراتب سے گزار کر اسفل السافلین سے بھی کچھ نیچے گرا دیا جائے۔

زمانہ کے اس انقلاب اور تحقیقات کے اس سیلاب نے خیالات کو دماغ میں کچھ اس طرح زیر و زبر کیا کہ راہ ترقی میں دنیا کی موجودہ حالت اور زمانہ کی آئندہ کیفیت کا اندازہ لگاتے لگاتے چشم ظاہر بیں بند

اور چشم بصیرت ہو گئی۔

کیا دیکھتا ہوں کہ ایک بڑے میدان میں کھڑا ہوں۔ اس کی وسعت کے کنارے پستی و بلندی خیالات کی حدود سے جا ملے ہیں۔ اس کا سبزہ اپنی تازگی و طراوت سے گلزار وہم پر چشمک زن ہے۔ اور اس کے غنچہ و گل اپنی نزہت و خوشنمائی سے آسمانِ خیال کی تاروں بھری رات کو شرماتے ہیں۔ میدان کے بیچوں بیچ، شیشہ کا ایک نازک اور خوبصورت گنبد ہے جو بلندی میں خیال انسانی کا ہمسایہ اور صفائی میں دل مومن کا ہم پایہ ہے۔ گنبد میں یہ عجیب و غریب صنعت ہے کہ اس کی بلندی۔ خیالات[۱] کی بلندی اور پستی کے بموجب کسی کو زیادہ اور کسی کو کم معلوم ہوتی ہے گنبد کی چوٹی پر کلس کی جگہ اقبال[۲] کا ستارہ پڑا جھلمل جھلمل کر رہا ہے۔ مجھے یہ دیکھ کر اور حیرت ہوئی کہ گنبد کا صرف ایک رُخ ہے۔ دوسرے پہلو کو تراش کر کچھ اس طرح صاف کر دیا ہے کہ اس پہ پاؤں ٹکنا دشوار تو کیا محال ہے۔ میں اس صنعت عجیب اور تعمیر غریب کے نظارہ میں محو تھا کہ کسی نے میرے بائیں طرف[۳] سے کہا "کیا دیکھ رہا ہے۔ کچھ سمجھا بھی کہ یہ کیا طلسمات ہے۔ اس کو تماشہ نہ سمجھ میدان، عالم خیال ہے اور یہ گنبد ترقی دنیا کا نقشہ" مڑ کر کیا دیکھتا ہوں کہ ایک بزرگ خضر صورت مُنہ پر نیلگوں نقاب ڈالے پہلو میں

---

۱ کیا انسان اور کیا انسان کے خیالات کسی کے نزدیک دنیا سب کچھ ہے اور کسی کے نزدیک کچھ نہیں۔

۲ اقبال کی تابندگی کبھی ایک حالت پر نہیں رہتی۔

۳ دل بائیں طرف ہی ہوتا ہے۔

کھڑے ہیں۔ میں نے پوچھا کہ "حضرت آپ کون ہیں اور یہاں میرے ساتھ ساتھ کیسے آئے" فرمایا "تو کیا میں ہر ایک کے ساتھ رہتا ہوں۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ میں سب کو پہچانتا ہوں۔ مگر بہت لوگ مجھے پہچانتے ہیں۔ سمجھنے والے مجھے رہبر صادق اور تجھ جیسے ناسمجھ مجھے دل کہتے ہیں۔" میں نے عرض کیا "تو" ہاں۔ جناب یہ دنیا کا نقشہ ہے۔ مگر یہ تو فرمائیے کہ کیونکر۔ ہم تو سنتے آئے ہیں کہ دنیا گول ہے۔ یہاں تو اس کی کچھ صورت ہی نئی ہے۔ ایک طرف گول ہے تو دوسری طرف سپاٹ۔ اب میں سمجھا پرانے[له] اور نئے خیالات کو ملا کر یہ کرۂ زمین تیار کیا گیا ہے۔" میرے اس بے موقع مذاق پر ان کو غصہ آگیا۔ جھڑک کر بولے۔ "سچ ہے جو دنیا میں اندھا رہا وہ آخرت میں بھی اندھا ہی رہے گا۔ بے وقوف یہ کرۂ ارض نہیں۔ یہ تجھ جیسے اندھوں کے خیالات اور کوششوں کا نقشہ ہے۔ انسان کی پستی اور بلندی کا نقشہ ہے۔ روحانیت اور مادہ پرستی کے مقابلہ کا نقشہ ہے۔ غرض یہ سمجھ لے کہ خیر و شر کا نقشہ ہے۔ تجھے یوں کیا خاک سمجھائی دے گا۔ لے۔ میری آنکھ سے دیکھ۔" ان کا یہ کہنا تھا کہ میری آنکھوں میں خود بخود ایک عجیب قوت پیدا ہو گئی۔ کیا دیکھتا ہوں کہ گنبد کی ڈھلان پر انسان کے گروہ

له پہلے زمین کو مسطح سمجھتے تھے۔ جدید تحقیقات نے اس کو گول کر دیا مزا یہ ہے کہ دونوں فریق اپنی اپنی ضد پر اڑے ہوئے ہیں۔ دیکھا کسی نے نہیں صرف عقلی دلائل سے ایک دوسرے کو دبانا چاہتے ہیں۔ چند ہی روز ہوئے کہ جرمن کے ایک مشہور پروفیسر زمین کے کونوں کی تلاش میں نکلے تھے۔ ہماری رائے میں اگر آدھی زمین کو چپٹا اور آدھی کو گول مان لیا جائے تو قصہ ہی ختم ہو جاتا ہے۔

کے گروہ اور انبوہ کے انبوہ چڑھے چلے جارہے ہیں۔ کچھ چڑھتے ہیں بلکہ کچھ پھسلتے ہیں۔ کچھ آگے بڑھتے ہیں۔ کچھ پیچھے ہٹتے ہیں۔ بعض ایسے ہیں کہ بہت اونچے چڑھ گئے۔ کچھ ایسے ہیں کہ بیچ ہی میں ہمت ہار بیٹھے ہیں۔ بہت ایسے ہیں کہ نیچے ہی کھڑے اُچک رہے ہیں۔ گنبد کے نچلے حصہ کو میں نے دیکھا تو معلوم ہوا کہ کسی زمانہ میں اس گنبد کے اوپر بھی ایک گنبد تھا۔ شروع دونوں ایک ہی جگہ سے ہوئے تھے۔ مگر زمانہ کے ہاتھوں بڑا گنبد سارے کا سارا ٹوٹ گیا۔ صرف اور کنارے رہ گئے۔ میں نے اپنے رہبر سے پوچھا "اجی حضرت یہ اوپر والا گنبد کہاں گیا؟" فرمایا۔ میاں۔ اس دوسرے گنبد کی کچھ نہ پوچھو۔ وہ گنبد تمھارے سامنے والے گنبد سے کہیں بڑا تھا۔ اس کا کلس گنبد گردوں سے گزر کر عرش کے کنگروں سے جا ملا تھا۔ اس کا نام روحانیت کا گنبد تھا۔ دنیا والوں نے اس کی دیکھ بھال نہیں کی نتیجہ یہ ہوا کہ بیٹھ گیا۔ اب صرف مادہ پرستی کا گنبد حباب آسا رہ گیا ہے۔ جب وہ نہ رہا تو یہ کیا رہے گا۔ بڑا گنبد فولاد کا تھا۔ وہ اس شیشہ کے گنبد کو آسیب بلا سے بچاتا تھا۔ اب روحانیت کا سایہ دنیا سے اٹھ گیا۔ کوئی دن جاتا ہے کہ مادہ پرستی کا یہ نازک اور پرشکوہ گنبد بھی حوادث زمانہ سے پانی کے بلبلے کی طرح بیٹھ جائے گا۔

پہلے زمانہ کے لوگ، دونوں گنبدوں پر ایک ساتھ چڑھتے اور دنیا کو دین سے جدا نہ کرتے تھے۔ یہاں بھی اچھے رہتے۔ وہاں بھی

---

[1] ترقی یافتہ قومیں بہت کم ہیں اور غیر ترقی یافتہ قومیں بہت زیادہ۔

اچھے رہتے اب دنیا کے ایسے پیچھے پڑے ہیں کہ دین کو بالکل بھول گئے نتیجہ دیکھ لے۔ رفتہ رفتہ گنبد روحانیت تباہ ہوگیا۔ کچھ گرگئیں رہ گئی ہیں وہ بھی آگے چل کر اس چھوٹے گنبد میں مل جاتی ہیں۔ اب اگر کوئی روحانیت کا راستہ اختیار کرتا بھی ہے تو تھوڑے دنوں بعد دنیا داروں میں آملتا ہے۔ غرض دنیا ہی دنیا رہ گئی سمجھے ہوئے ہیں کہ

عاقبت کی خبر خدا جانے اب تو آرام سے گذرتی ہے

میں نے پوچھا "حضرت آخر اس نئے نمونہ کا گنبد بنانے میں بھی کوئی راز ہے" کہنے لگے "ہاں، راز ہے۔ اور بہت بڑا راز ہے، بات یہ ہے کہ ہر قوم ستارۂ اقبال تک پہنچنے کی کوشش کرتی ہے جب انتہائی[1] ترقی کو پہنچ جاتی ہے اور غرور کے نشہ میں بدمست ہوکر آنکھیں بند کرکے آگے ڈالتی ہے تو تنزل کی ڈھلان پر سے رڑھکتی ہوئی گم نامی کے غار میں جا پڑتی ہے، پھر اُٹھتی ہے، سنبھلتی ہے، ترقی کے مدارج طے کرتی ہے اور پھر ادبار کی ذلتیں اٹھاکر "رفتگان" کی فہرست میں داخل ہوجاتی ہے۔" میں نے پوچھا "پیر مرشد جب خدا نے ہر انسان کو وہی دو ہاتھ دیئے اور وہی دو پاؤں، وہی اعضا عنایت کئے اور وہی عقل تو پھر چڑھنے کے وقت ان کے آگے پیچھے رہنے کی کیا وجہ ہے۔" فرمایا "مجھ سے کیا پوچھتا ہے تو خود

---

[1] سچ ہے پستی ترقی کا اور ترقی پستی کا زینہ ہے۔ ابتدائے آفرینش سے قومیں اسی اتار چڑھاؤ کی منزلیں طے کرتی رہی ہیں اور قیامت تک کرتی رہیں گی آج جو قوم بلندی پر ہے وہ کل گرے گی اور جو گری ہوئی ہے وہ بلند ہوگی۔

دیکھو ے" اب جو میں نے غور کیا دیکھتا ہوں کہ کچھ لوگ دوسروں کے کندھوں پر کھڑے ہو کر اوپر چڑھنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ نیچے والے ہیں کہ بوجھ سے دبے جاتے ہیں۔ اوپر والے ہیں کہ تعریفوں سے ہمت بڑھاتے ہیں، یہ پھر شکریہ کے ہاتھ سے اپنی پیشانیوں کا پسینہ پوچھتے ہیں اور ان بھاری لاشوں کو اٹھاتے ہیں۔ میں نے اپنے رہبر سے کہا "حضرت یہ عجیب بے وقوف لوگ ہیں، خود تو بڑھتے نہیں دوسروں کو بڑھا رہے ہیں۔ اگر ترقی ہی مقصود ہے تو خود ترقی کریں، یہ کیا کہ محنت تو کریں یہ اور فائدہ اٹھائیں دوسرے"۔ فرمایا "ہاں، مادہ پرست دنیا میں یوں ہی ہوتا ہے۔ چھوٹے بڑوں کو بڑھاتے ہیں۔ اور خود فنا ہو جاتے ہیں۔ البتہ روحانیت کے گنبد میں اس کے خلاف عمل تھا۔ جو خود اوپر چڑھ جاتا، وہ نیچے والوں کا ہاتھ پکڑ کر اوپر کھینچ لیتا اور اس طرح یہ زنجیر کی زنجیر میدان روحانیت میں آگے بڑھتی چلی جاتی" وہ یہ کہہ ہی رہے تھے کہ میری نظر کچھ اڑتے ہوئے پرچوں پر پڑی۔ کیا دیکھتا ہوں کہ ایک گروہ کا گروہ کتابیں بغل میں دبائے گنبد پر چڑھا جا رہا ہے۔ جہاں ذرا ان کا پاؤں پھسلا کہ انھوں نے کتاب میں سے چند ورق پھاڑ ہوا میں اڑا دئے اور اس طرح کچھ ہلکے ہو کر قدم آگے بڑھایا میں نے بڑے میاں سے پوچھا "اجی جناب۔ ان کو اپنے کتابوں کے یہ گٹھر لانے کی کیا ضرورت تھی۔ خالی ہاتھ آئے ہوتے جو اس پھسلوان گنبد پر چڑھنے میں آسانی ہوتی۔ اور جب یہ کتابیں ان کو ایسی ہی عزیز ہیں کہ یہاں لاد لاد کر لائے ہیں تو اب ان کو پھاڑ پھاڑ کر پھینکنے کا کیا مطلب ہے۔ بوجھ کا بوجھ رہا۔ اور کتابیں ستیا ناس ہو گئیں"۔ ہنس کر

کہنے لگے "یہ اہل قلم اور اخبار نویسوں کا گروہ ہے۔ ان کی ترقی کا دارو مدار ان ہی کاغذ کے پرزوں پر ہے اگر ان کی تحریروں کو لوگوں نے پسند کیا تو چڑھنے میں ذرا سہارا دے دیا۔ اگر کوئی حصہ ناپسند ہوا تو انھوں نے اتنا حصہ پھاڑ اپنی رائے کو بدل، مضمون کا رُخ کچھ اس طرح پھیر دیا کہ ان کی ترقی کا باعث بن گیا۔ جو اہل قلم اس پر عمل نہیں کرتے وہ بے سہارا ہونے کی وجہ سے گرتے ہیں اور اپنی ہی کتابوں کے انبار کے نیچے دب کر فنا ہو جاتے ہیں۔ خیر یہ تو جو کچھ ہیں وہ ہیں۔ ذرا ان کے برابر والوں کو دیکھ" ادھر جو دیکھتا ہوں تو عجیب تماشہ ہے گروہ کے گروہ ہیں کہ گنبد پر چڑھتے بھی جاتے ہیں اور لڑتے بھی جاتے ہیں۔ سبحان اللہ۔ یہ چڑھائی دیکھئے۔ اور ان کی ابلہانہ حرکت ملاحظہ کیجئے۔ ایسے چکنے گنبد پر چڑھنا خود ہی کٹھن ہے۔ بھلا یہ آپس کی دھینگا مشتی کیا کچھ غضب نہ ڈھائے گی۔ میں نے پوچھا "اجی حضرت یہ کیا ہو رہا ہے"؟ بولے: "بود ہم پیشہ باہم پیشہ دشمن، کا نقشہ ہے۔ ہاں۔ ان میں جو کچھ سمجھ دار ہیں وہ ہاتھ میں ہاتھ دیئے ایک دوسرے کو کھینچتے کھنچاتے بہت دور نکل گئے ہیں۔ یہ جو منقطع صورتیں آپس میں دست و گریباں ہیں۔ یہ قوموں کے دینی پیشوا ہیں۔ ان میں یہ خوبی ہے کہ صرف دوسرے مذہب والوں ہی کو نہیں نوچتے کھسوٹتے۔ اپنے ہم مذہبوں کو بھی لہولہان کئے دیتے ہیں۔ یہ وہ لوگ ہیں جنھوں نے ترقی روحانیت کے گنبد سے شروع کی تھی۔ مگر رفتہ رفتہ مادیت کے گنبد پر نکل آئے۔ اور اپنے مصلے سجا دئے اور مرگ چھالے خانقاہوں۔ کلیساؤں اور شوالوں سے اٹھا کر کانگریس کے منڈپوں

تجار کی کانفرنسوں اور کمیشنوں کے اجلاسوں پر لا بچھائیے۔ تعلیم کچھ پائی تھی۔ لگے دوسرے کام میں۔ نتیجہ یہ ہوا کہ نہ ادھر کے رہے نہ اُدھر کے رہے۔ یہی وہ لوگ ہیں جن کے متعلق خسر الدنیا والآخرہ فرمایا گیا ہے۔"

میرے رہبر تو ان دنیوی دین داروں کی مذمت میں لگے ہوئے تھے اور میں اس گنبد کے چڑھنے والوں کے ایک دوسرے گروہ کا تماشہ دیکھنے میں مشغول تھا۔ کچھ سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ یہ آدمی ہیں یا ربڑ کے گولے۔ کچھ لوگ ہیں کہ نیچے کھڑے انھیں پھونکیں مار رہے ہیں ان گول مول انسانوں کے قدم خود تو گنبد کی ڈھلان پر ٹکتے نہ تھے۔ ہاں، صرف ہوا کے زور سے یہ کبھی اوپر جاتے تھے، کبھی نیچے آتے تھے اسی الٹ پلٹ میں شاید خیال کرتے ہوں گے کہ ستارۂ اقبال تک اب پہنچے اور اب پہنچے۔ میں نے اپنے خضر راہ سے کہا "پیرو مرشد۔ یہ کیا تماشہ ہے یہ لوگ پھول کر کپّا کیوں ہو گئے ہیں۔ پھونک کے بل پر اُڑ رہے ہیں۔ اگر خدا نخواستہ اتنی اونچان سے گرے تو کیا حال ہو گا؟" فرمایا "بیٹا۔ جو لوگ نیچے کھڑے پھونکیں مار رہے ہیں یہ خوشامدی ہیں اور جو ہوا میں اُڑ رہے ہیں وہ خوشامد خورے موٹاپے نے ان کی چشمِ حقیقت بین بند کر دی ہے اور گوش خوشامد نیوش کھول دیئے ہیں۔ خود تو کچھ دکھائی دیتا نہیں۔ ہاں دوسروں سے یہ سُن سُن کر آپے سے باہر ہوئے جاتے ہیں کہ ہم سے آگے کوئی نہیں۔ جب تک خوشامدی ان کی چاپلوسی میں اپنی ترقی دیکھیں گے اس وقت تک اُن کو یوں ہی پھونکیں مار مار کر اڑاتے رہیں گے جب جلب منفعت کی صورت نہ رہے گی اِس وقت ان کو چھوڑ کر

کسی دوسرے خوشامد خورے کے ساتھ ہو جائیں گے۔ اور پہلے صاحب اس بلندی پر سے گر کر پاش پاش ہو جائیں گے۔ میں نے عرض کی "جناب۔ اگر یہ توپ کا گولہ لڑھکا تو کئی خوشامدی خورے اس کی لپیٹ میں آ جائیں گے" کہنے لگے "نہیں یہ خوشامدی بڑے پختہ کار لوگ ہوتے ہیں۔ جب دیکھتے ہیں کہ کسی خوشامد خورے کا وقت آن لگا ہے تو جھٹ ادھر اُدھر ہو جاتے ہیں۔ آپ بچ جاتے ہیں، اس کو ٹھکانے لگا دیتے ہیں۔ خیر۔ یہاں تو کھڑا کھڑا کہاں تک اور کیا کیا دیکھے گا۔ ان سب لوگوں کی حالت کو دیکھنے اور سمجھنے کے لئے عمر نوح چاہیے۔ چل میرے ساتھ چل۔ تجھے کچھ گنبد کے اندر کا بھی تماشہ دکھلاؤں"۔ میں نے کہا "ہیں، تو کیا یہ گنبد اندر سے کھوکھلا ہے"؟ فرمایا "ہاں اور کیا تو نے مادیت کو کوئی ٹھوس چیز سمجھا ہے۔ باہر تو صرف پتلیاں ہیں۔ اس کے کُل پُرزے تو سب اندر ہی ہیں۔ اندر ہی سے پچکاریاں دے دے کر ان کو قوت پہنچائی جاتی ہے۔ ورنہ انسان کی قدرت ہے کہ شیشہ کی ایسی ڈھلان پر ایک قدم چڑھنا تو کجا ایک لمحہ ٹک بھی سکے"! میں نے کہا "بہت خوب چلئے"۔ وہ میرا ہاتھ پکڑ کر آگے بڑھے اور بات کی بات میں ہم دونوں دیوار میں سے اس طرح گذر گئے جیسے شیشہ میں سے نگاہ۔ اندر جا کر کیا دیکھتا ہوں کہ اس سرے سے اُس سرے تک کارخانے ہی کارخانے پھیلے ہوئے ہیں۔ ایک ایک کارخانہ بلندی میں آسمان سے باتیں کرتا ہے اور اپنی وسعت سے وسعتِ خیال کو شرماتا ہے۔ ہمارے سامنے ہی جو کارخانہ تھا

اس پر بہت بڑے بڑے سیاہ حرفوں میں لکھا ہوا تھا: "کارخانہ جراثیم آوارگی"۔ بڑے میاں نے مجھ سے اندر چلنے کو کہا۔ میں نے تامل کیا۔ انھوں نے فرمایا: "اب آیا ہے تو چل دیکھ لے۔ ہر کسی کو یہ چیزیں دیکھنی نصیب تھوڑی ہوتی ہیں۔" میں نے عرض کی "حضرت معاف کیجئے اور جو یہ جراثیم مجھ میں سرایت کر گئے تو پھر میرا کہاں ٹھکانا رہے گا۔" کہنے لگے "یہ بھی خوب کہی کہ کہاں ٹھکانا رہے گا۔ بیٹا نیشن ایبل ہو جاؤ گے۔ دنیا میں نام ہوگا۔ کچھ کما کھاؤ گے۔ صرف زبانی جمع خرچ میں ساری عمر چین سے گزر جائے گی۔ میاں آوارہ ہونے کو بھی ہمت چاہیئے۔ تمھارا اندر قدم رکھنے سے دم نکلتا ہے، بھلا آوارہ بننے کی ہمت کہاں سے لاؤ گے۔" میں نے کہا "بہت خوب چلئے" اندر جا کر کیا دیکھتا ہوں کہ یہاں سے وہاں تک شیشے کی دیگیں چولھوں پر چڑھی ہیں۔ مرد اور عورتوں کا لشکر کا لشکر جم غفیر اپنے اپنے کام میں لگا ہے۔ کوئی دیگوں میں عرق ڈال رہا ہے۔ کوئی چولھوں میں ایندھن ٹھونس رہا ہے ڈاکٹر ہیں کہ مقیاس الحرارت ہاتھوں میں لئے ادھر سے اُدھر اور اُدھر سے اِدھر پھر رہے ہیں۔ کبھی اس دیگ کو دیکھتے ہیں کبھی اُس دیگ کو۔ کسی سے کہتے ہیں۔ اس میں اور عرق ڈالو۔ کسی کو حکم دیتے ہیں اِس کے نیچے اور آنچ لگاؤ۔ کسی دیگ کو اُتار ٹھنڈا کرنے کے لئے رکھ دیتے ہیں۔ کسی اُتری ہوئی دیگ کو چڑھا دیتے ہیں۔ غرض ہر شخص اپنے اپنے کام میں اس طرح مشغول ہے کہ دنیا اور مافیہا کی خبر نہیں۔ ایک طرف تیار شدہ سیرم (عرق) کی شیشیاں بھر کر سر بمہر

کی جارہی ہے۔ ایک طرف پارسل بندھ کر روانہ ہو رہے ہیں۔ میں نے بڑے میاں سے پوچھا "جناب یہ سب کے سب ننگے کیوں ہیں؟" فرمایا خدا اس آگ کی گرمی سے بچائے۔ کپڑے کا ایک تار بھی جسم پر ہو تو جل کر راکھ ہو جائے۔" میں نے کہا "حضرت اس عرق کا یہاں بہت رواج معلوم ہوتا ہے۔ پیپے کے پیپے اُلٹے جا رہے ہیں اور بس نہیں ہوتا۔" کہا "عرق نہیں، شراب ہے۔ آوارگی کے جراثیم کی پرورش اور پختگی کے لئے یہی اکسیر کا کام دیتی ہے۔ کوئی تیرہ سو برس ہوئے، جب اس کارخانہ کو ایک بڑی مصیبت کا سامنا ہو گیا تھا۔ دنیا کے ایک بڑے حصہ نے شراب کو ممنوع قرار دے کر اس کی آمد کو بالکل روک دیا تھا۔ اگر کچھ دنوں وہی رنگ رہتا تو اس کارخانہ کا دیوالہ نکلنے میں کسر نہ رہی تھی۔ مگر اس کارخانہ کا مالک بھی آفت کا پرکالہ ہے۔ ہوس کے کارخانہ والوں سے مل ملا "عزت وجاہ کے جراثیم" دین داروں کے خون میں پہنچا دیئے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ احکام کی تاویلیں شروع ہوئیں اور یہ کارخانہ سنبھل گیا۔ اب تھوڑے دنوں سے تو یہ دن دونی اور رات چوگنی ترقی کر رہا ہے۔ میں نے یہ دیکھ کر کہ چولھوں میں بجائے ایندھن کے کپڑے ہی کپڑے جل رہے ہیں۔ اپنے رہبر سے پوچھا "حضرت کیا یہ مادہ صرف کپڑوں ہی سے پکتا ہے؟" کہنے لگے ہاں اس کے پکانے میں عصمت کی چادریں، عفت کے برقعے اور حیا کی نقابیں جلانی پڑتی ہیں۔ کسی زمانہ میں اس ایندھن کا بھی کال ہو گیا تھا۔ مگر اب تو یہاں خرچ سے زیادہ آمد ہے۔ تجربہ سے یہ

بھی ثابت ہوا ہے کہ ستر پوشی کے کپڑے ان کپڑوں کے تیار کرنے کا سب سے اچھا ایندھن ہیں۔ کبھی کبھی یہ چیزیں بھی آجاتی ہیں[1]۔ مگر کم اگر اِس کارخانہ کی قسمت میں ترقی لکھی ہے تو اس کی بھی کمی نہ رہیگی اچھا چلو اب دوسرے کارخانہ کو دیکھیں۔ یہاں سے نکل کر ہم دوسری عمارت کے پاس پہنچے۔ اس پر موٹے موٹے حرفوں میں لکھا تھا "سچ اور جھوٹ کے جراثیم کا مشترکہ کارخانہ" میں نے کہا "جناب والا یہ تو علیحدہ علیحدہ کارخانے ہونے چاہیئے۔ یہ ملے ہوئے کیوں ہیں"۔ فرمایا "ہاں پہلے یہ دونوں الگ الگ ہی تھے۔ سچ کا کارخانہ ٹوٹنے لگا تو جھوٹ کے کارخانہ کو شریک کرلیا گیا۔ بات یہ ہے کہ سچ کے جراثیم ایسے تلخ ہیں کہ لوگ ان کی برداشت نہیں کر سکتے۔ جھوٹ کے جراثیم کی آمیزش سے ایک نیا کیڑا پیدا ہو گیا ہے اِس کو یہاں کی اصطلاح میں "دروغ مصلحت آمیز" کہتے ہیں۔ اس کا سیرم دنیا والوں کو کچھ ایسا راس آیا ہے کہ کیا بیان کروں۔ بنڈل کے بنڈل چلے جارہے ہیں اور بس نہیں ہوتے اس سے بڑے یہاں صرف دو ہی کارخانہ ہیں۔ ایک "ہوس" کا اور دوسرا "ریاکاری" کا۔ ریاکاری کے جراثیم کا تو یہ حال ہے کہ جب تک ان کو شریک نہ کیا جائے، کوئی سیرم تیار ہی نہیں ہوتا۔ پہلے یہاں "قناعت" کا بھی ایک بڑا کارخانہ تھا۔ مگر اب اِس کو

---

[1] ایک پوری قوم نے سارا لباس اُتار پھینکا ہے۔ ابھی تھوڑے دن ہوئے یورپ کے ایک ہوٹل میں ایک بیگم صاحبہ مادرزاد ننگی تشریف لائی تھیں۔ دوسری ہیں کہ جسم ننگی ناچتی ہیں۔

"ہوس" کے کارخانے نے خرید لیا ہے" "انصاف کا کارخانہ" دولت کے کارخانے کے ہاتھ آگیا اور نیکی کا کارخانہ ریاکاری کی کمپنی میں ضم ہوگیا۔ پہلے زمانہ میں دین داری کے سیرم کی سب سے زیادہ مانگ تھی۔ مگر جب سے روحانیت کا گنبد تباہ ہوا ہے اس وقت سے اس سیرم کو کوئی پوچھتا بھی نہیں۔ اس کا کارخانہ برائے نام چل رہا ہے جو تھوڑا بہت مال تیار ہوتا ہے اس میں بھی ریاکاری کے جراثیم شریک کرنے پڑتے ہیں۔ خالص مال کی نکاسی اس زمانہ میں بالکل بند ہے۔ اچھا تو یہاں کیوں کھڑا ہو گیا۔ آگے بڑھو۔ اگر یوں ہی ہر جگہ ٹھٹکا تو ساری عمر بھی ان کارخانوں کے دیکھنے کے لئے کافی نہ ہوگی۔" یہ سن کر میں نے آگے قدم بڑھایا۔ اب جس عمارت کے سامنے ہم پہنچے، اس کی وسعت کچھ نہ پوچھو۔ ساری دنیا اس کے ایک کونہ میں سما جائے اور اس کی چھت کے نیچے آجائے۔ عمارت کی روکار پر بڑے بڑے خوبصورت سنہری حرفوں میں لکھا ہوا تھا "کارخانہ ہوس"۔ اس کارخانہ کی ہزاروں شاخیں تھیں۔ کسی کی تختی لگی تھی "شاخ جاہ و مرتبت"۔ کسی پہ لکھا تھا "شاخ جوع الارض"۔ ایک سائن بورڈ تھا "شاخ ملازمت"۔ میں نے اپنے رہبر سے کہا "چلئے۔ اسے دیکھیں۔ یہ بڑی دلچسپ شاخ معلوم ہوتی ہے۔" کہنے لگے "چلو، دیکھ لو۔ ہوس کے کارخانہ کی یہ شاخ ہمیشہ سے خوب چل رہی ہے۔ ہاں آج کل ہندوستان میں اس سیرم کی سب سے زیادہ مانگ ہے۔" اندر جا کر کیا دیکھتا ہوں کہ دہی دیگوں پہ دیگیں چڑھی ہیں۔ سوکھے سہمے آدمی چولھوں میں تعلیمی ڈگریاں۔ سفارشی

رقعے اور مدحی قصیدے دھڑا دھڑ پڑے جلا رہے ہیں۔ بھلا کاغذ کی کیا بساط۔ آگ ذرا بھڑکی اور ٹھنڈی ہوگئی۔ انھوں نے پھر کاغذوں کے بنڈل لئے اور چولھے میں رکھ دیئے۔ بے حیائی کی پھکنی سے خوشامد کی پھونکیں ماریں۔ پھر ذرا شعلہ اُٹھا اور درہم ہوکر رہ گیا۔ میں نے اپنے رہبر کی طرف پھر کر دیکھا۔ وہ مسکرا کر کہنے لگے "یہ مادہ ذرا مشکل سے پکتا ہے۔ ایک انار، اور صد بیمار، کا مضمون ہے۔ مانگ بہت ہے اور مال کم تیار ہوتا ہے، بعضوں کو ملتا ہے۔ مانگتے ہی مانگتے ختم ہو جاتے ہیں جو خالی ہاتھ رہتے تھے۔ اب انھوں نے "شورش کے جراثیم" کی پچکاریاں لینی شروع کردی ہیں۔ پچکاریاں لیتے ہیں اور مادیت کے گنبد کو کھودتے ہیں۔ پھیر لیتے ہیں۔ پھر کھودتے ہیں۔ ایک دن آنے والا ہے کہ ان ہی کے ہاتھوں اس گنبد کا بھی خاتمہ ہو جائے گا۔ روحانیت پہلے ہی جا چکی، اب مادّیت بھی رخصت ہو جائے گی۔ نتیجہ یہ ہوگا کہ انسانیت سے نکل کر سب پھر وہی جنگلی کے جنگلی ہو جائیں گے میں نے کہا "خیر دیکھا جائے گا۔ میں یہاں سے جاتے ہی سارا بھانڈا پھوڑے دیتا ہوں۔ اچھا ہوا کہ میں یہاں آگیا۔ نہیں تو دنیا ہی تباہ ہو جاتی" یہ کہہ۔ میں وہاں سے بھاگا۔ بڑے میاں نے غل مچایا "ارے میاں۔ ذرا ٹھیر، یہاں کا کچھ اور رنگ بھی دیکھتا جا" میں نے کہا۔ "بس حضرت۔ بس۔ بہت کچھ دیکھ لیا۔ مجھے پہلے ان شورش پسند حضرات کا انتظام کرنا ہے۔ ابھی سے روک تھام نہ کی تو یہ اپنے ساتھ ساری دنیا کو لے مریں گے" وہ چیختے ہی رہے کہ میاں کیوں دیوانہ ہوا ہے۔ تیری کون سنتا ہے۔ بیسیوں ان کارخانوں کو دیکھ کر

جا چکے ہیں، وہاں جا کر بہت غُل مچایا۔ مگر ان کی آواز نقار خانہ میں طوطی کی آواز ہو کر رہ گئی۔ وہاں تو "ہما ہمی کے جراثیم" اتنے ٹھونس دیئے ہیں کہ تجھ جیسے اگر ہزار سمجھ دار بھی اودھم مچائیں تو سب ان کو بے وقوف سمجھیں۔ اور پاگل خانہ پہنچا دیں" بڑے[1] میاں نے پہلے سمجھایا، خوشامد کی۔ جب دیکھا کہ یہ کسی طرح نہیں مانتا، تو لپک کر میرا دامن پکڑ لیا۔ مجھے بہت بُرا معلوم ہوا۔ دبا کر ایک ٹھوکر رسید کی ٹھوکر سے پاؤں ایسا جھنایا کہ آنکھ کھُل گئی۔ اب جو دیکھتا ہوں تو سامنے میز اُلٹی پڑی ہے اور بیٹھا اپنا پنجہ دبا رہا ہوں۔ خیر جو ہوا سو ہوا دنیا کا موجودہ نقشہ تو دیکھ آیا۔

---

[1] سچ ہے دل ہر طرح سمجھاتا ہے۔ خوشامد کرتا ہے۔ خفا ہوتا ہے۔ سرزنش کرتا ہے۔ لیکن سب اس کی باتوں کو ٹھکرا دیتے ہیں اور آخر نقصان اُٹھاتے ہیں۔

کہانی

زندگی کے بس دو ہی پہلو ہیں، زندہ دلی اور مردہ دلی۔ ایک وہ لوگ ہیں، جو مصیبت میں بھی ہنستے ہیں۔ دوسرے وہ ہیں۔ جو خوشی میں بھی روتے ہیں۔ ایک مرنے کو جینا سمجھتے ہیں اور دوسرے جینے کو مرنا۔ زندگی کے ان ہی دونوں پہلوؤں نے کبھی مذہب کی شکل اختیار کی اور کبھی فلسفہ کے مکتبوں کی صورت۔ غرض دنیا بھر کے انسانوں کو دو گروہوں میں تقسیم کر دیا۔ ایک روتی صورت دوسرے ہنستی مورت۔ کوئی انشار بنا اور کوئی تیر۔

پہلے زمانہ کے لوگوں کا کیا کہنا۔ وہ تو بچوں کو شروع ہی سے سکھاتے تھے کہ ہنستے کھیلتے عمر گزار دو۔ کہانیاں کہتے تھے تو ایسی کہ بچوں کو زندہ دلی سے محبت اور مردہ دلی سے نفرت ہو۔ پُرانے قصے کہانیاں ہو گئیں۔ ان کو اس لئے چھوڑ بیٹھے کہ پرانی ہر بات فضول ہے۔ خیر کوئی سنے یا نہ سُنے۔ میں تو ایک پرانی وضع کی کہانی لکھے دیتا ہوں۔ ذرا دیکھنا کس خوبی سے زندگی کے دونوں پہلو دکھا کر زندہ دلی کی ترغیب دی ہے۔

گرمی کا موسم ہے۔ چاندنی رات ہے۔ صحن میں پلنگ بچھے ہیں۔ کھانا دانا کھا کر سب ابھی لیٹے ہیں۔ ایک پلنگ پر دو لڑکیاں سعیدہ اور حمیدہ لیٹی کھسر پھسر کر رہی ہیں۔ دوسرے پلنگ پر اُن کے

دو چھوٹے بھائیوں احمد اور محمود میں کشتم کشتا ہو رہی ہے۔ ان کی والدہ تختوں پر جا نماز بچھائے، عشاء کی نماز پڑھ رہی ہیں۔ ان کی نانی نے ابھی نماز سے فارغ ہو کر پاندان کھولا ہے۔ پاندان کی آواز سنتے ہی احمد اور محمود لڑائی وڑائی چھوڑ پلنگ سے اُٹھے اور اور نانی سے آکر لپٹ گئے۔ احمد نے کہا "نانی اماں کہانی" محمود نے کہا "ہاں، نانی اماں کہانی" یہ سننا تھا کہ سعیدہ اور حمیدہ اُٹھ بیٹھیں اور انھوں نے بھی نانی سے کہانی کا تقاضا کیا۔ بڑی بی بہت کچھ کہتی رہیں "ارے بھئی، میرے سر میں درد ہے۔ کل کہوں گی۔ دیکھو غل نہ مچاؤ، تمھاری اماں کی نماز میں ہرج ہوتا ہے" مگر کون سنتا تھا۔ آخر گھسیٹ گھساٹ بڑی بی کو پلنگ پر لا ہی بٹھایا۔ دو ایک پہلو میں لیٹ گئے دو دوسرے پہلو میں۔ اور اب بحث شروع ہوئی کہ کون سی کہانی کہی جائے۔ میاں محمود سب سے چھوٹے تھے۔ ان کا اصرار تھا کہ طوطا مینا کی کہانی کہو۔ لڑکیاں سر تھیں کہ رانی کیتکی کا قصہ سناؤ۔ بڑی بی پریشان تھی کہ کون سی کہوں کون سی نہ کہوں۔ آخر کہنے لگیں "تم سوچنے تو دیتے ہی نہیں۔ کہوں تو کیا خاک کہوں۔ ذرا دم لو۔ میں سوچ تو لوں" یہ سن کر بچے چپ ہوئے۔ بڑی بی نے دماغ پر زور ڈالا اور اس طرح کہنا شروع کیا۔

"تو، ہاں بھئی، خدا تمھارا بھلا کرے۔ ایک تھی بڑھیا۔ بچاری کے ایک ہی بچہ تھا۔ مصیبت کی ماری سارے دن سوت کاتتی۔ شام کو جا گدڑی میں بیچ آتی۔ دینا بنئے کے ہاں"

سعیدہ "نانی اماں! وہی دینا۔ نا۔ جس کے ہاں سے ہمارا اناج

آتا ہے"۔

احمد:"نانی اماں! دینا۔ پودینہ۔ باجرہ کی روٹی۔ ٹکا مہینہ"۔

بڑی بی نے بچوں کو ڈانٹا کہ "نہ تم سنتے ہو۔ نہ کہنے دیتے ہو۔ چلے جاؤ۔ اپنی اماں سے جا کر کہانی سنو۔ وہ نماز پڑھ چکی ہیں۔ مجھ سے سننا ہے تو چپکے لیٹے رہو"۔

خیر پھر اقرار مدار ہوئے۔ اور بڑی بی نے کہا "ہاں میں نے کہاں تک کہا تھا"۔

حمیدہ:"دینا بنئے کے ہاں سے"۔

بڑی بی:"ہاں، دینا بنئے کے ہاں سے تھوڑی سی دال۔ تھوڑا سا آٹا۔ تھوڑا سا نمک، مرچ لاتی، پکاتی۔ خود کھاتی بچے کو کھلاتی۔ اسی طرح کئی برس گزر گئے۔ بچہ خاصہ سیانا ہو گیا"۔

احمد:"نانی اماں! سیانا کیا؟

نانی:"سیانا یعنی بڑا، ہوشیار"۔

میاں محمود جوش میں آکر اُٹھ بیٹھے اور کہا "نانی اماں جیسے میں" بہنوں نے میاں محمود کو پکڑ دھکڑ زبردستی لٹا دیا۔ اور پھر کہانی شروع ہوئی"۔

نانی:"جب ذرا سیانا ہوا تو میاں جی کے پاس پڑھنے بٹھا دیا۔

احمد:"نانی اماں! تختی پہ تختی۔ میاں جی کی آئی کمبختی"۔

نانی:"نا۔ بیٹا۔ نا۔ ایسی بری باتیں نہیں کیا کرتے۔ مولوی صاحب باپ کے برابر ہوتے ہیں"۔ ان کو بھی بھائی بہنوں نے زبردستی خاموش کیا اور کہانی کا پھر سلسلہ چھڑا۔

نانی:"بھئی، وہ لڑکا تو ایسا نکلا۔ ایسا نکلا کہ سبحان اللہ تھوڑے ہی دنوں میں پڑھ پڑھا خاصہ مولوی ہوگیا۔ عرضی پرزہ کر، کچہری میں دس پندرہ روپے کا نوکر بھی ہوگیا۔ اب بڑی بی کے دن پھرے اچھے اچھے کھانے پکاتیں۔ اچھے اچھے کپڑے بناتیں۔ مزے سے دونوں ماں بیٹے رہتے۔ جب ہوتے ہوتے تھوڑا بہت روپیہ بھی جمع ہوگیا۔ تو بڑی بی کو بچے کی شادی کی سوجھی۔ ڈھونڈھ ڈھانڈ کر، ایک لڑکی چندے آفتاب، چندے مہتاب بیاہ لائیں۔ بڑے چاؤ سے بہو کو گھر میں اُتارا۔ اچھے سے اچھا کھانا بہو کو کھلاتی۔ اچھے سے اچھا کپڑا پہناتی مگر بہو تھی کہ کوئی چیز اُس کے بھاویں ہی نہ آتی تھی۔ جب تک گھونگھٹ رہا اُس وقت تک تو کسی نہ کسی طرح گزرے گئی۔ گھونگھٹ اُٹھنا تھا کہ ساس پر مصیبت آگئی۔ زبان سے ہوتے ہوتے ہاتھ پر اُتر آئی خود ہی بڑھیا کو مارتی اور خود ہی ٹسوے بہانے بیٹھ جاتی۔ خاوند سے وہ وہ لگائی بجھائی کی کہ ایک دن بیٹے نے بھی ماں کو خوب مارا۔"

حمیدہ اچھل پڑی اور کہا "اے۔ ہے، اماں کو مارا۔ موئے کو بڑھیا پر ہاتھ اٹھاتے شرم بھی نہ آئی۔"

نانی:"ہاں بیٹا۔ اچھی بیٹیاں ساس کو ماں کے برابر سمجھتی ہیں۔ نوج دور پار اگر شریفوں کی بیٹیاں ایسی باتیں کرنے لگیں تو پھر شریفوں اور چوہڑے چماروں میں کیا فرق رہ جائے۔ ہاں۔ تو، بیٹے نے مار پیٹ بڑھیا کو گھر سے نکال دیا۔"

محمود:"اور ہلدی چونا نہیں لگایا۔"

نانی:"ہلدی چونا لگانا ہوتا تو مارتے ہی کیوں۔ تو خیر بچاری بڑھیا روتی

رلاتی جنگل بیابان میں جہاں آدم نہ آدم زاد ایک بڑ کے درخت کے نیچے جا بیٹھی۔ اور لگی منہ ڈھانک ڈھانک کر رونے۔ خدا کا کرنا کیا ہوتا ہے کہ انھی دنوں میں جاڑا۔ گرمی۔ برسات میں جھگڑا ہوا۔

جاڑا کہتا میں اچھا۔ گرمی کہتی میں اچھی۔ برسات کہتی میں اچھی۔ آخر یہ صلاح ہوئی کہ چلو چل کر کسی آدم زاد سے پوچھیں۔ ان کا جو اُدھر گزر ہوا۔ تو تینوں نے کہا "لو بھئی وہ سامنے ایک بڑھیا بیٹھی رو رہی ہے۔ چلو اس سے پوچھیں"۔

سب سے پہلے میاں جاڑے آئے۔ گوری گوری رنگت۔ گلّے ایسے جیسے انار کا دانہ۔ سفید داڑھی۔ موٹا سا روئی کا دگلہ پہنے۔

حمیدہ "نانی اماں! وہ کہاوت کیا ہے۔ دگلہ سب سے اگلا"۔

نانی: "دگلہ سب سے اگلا۔ پہنو تو گرم۔ بچھاؤ تو نرم۔ باندھو تو بقچی کا بھرم۔

تو، ہاں! موٹا سا روئی کا دگلہ پہنے۔ خوب اوڑھے لپیٹے آئے۔ اُن کا آنا تھا کہ بڑی بی کو تھرتھری چھوٹ گئی۔ میاں جاڑے نے آکر کہا "بڑی بی سلام"۔

بڑی بی نے کہا "بیٹا جیتے رہو۔ بال بچے خوش رہیں۔ مگر بیٹا ذرا دھوپ چھوڑ کر کھڑے ہو۔ مجھے تو تمھارے آنے سے کپکپی سی لگ گئی ہے"۔

خیر میاں جاڑے ذرا ہٹ کر کھڑے ہوئے اور کہا "بڑی بی ایک بات پوچھوں"۔ بڑی بی نے کہا "ہاں بیٹا ضرور پوچھو"۔ میاں جاڑے نے کہا "بڑی بی جاڑا کیسا ہے"۔ بڑی بی نے کہا "بیٹا جاڑا۔ جاڑے کا کیا کہنا۔ سبحان اللہ۔ مہاوٹ برس رہے ہیں۔ دالانوں کے پردے پڑے ہیں۔

انگیٹھیاں سلگ رہی ہیں۔ لحافوں میں دبکے بیٹھے ہیں۔ چائیں بن رہی ہیں۔ خود پی رہے ہیں۔ دوسروں کو پلا رہے ہیں۔ صبح ہوئی اور چنے والا آیا۔ گرم گرم چنے لئے۔ پہلے پھولے پھولے چنے کھائے۔ پھر گڑ گڑ ٹھڈیاں چبا رہے ہیں۔ حلوا۔ پوریاں اُڑ رہی ہیں بچے ہیں کہ جیبوں میں چبینا ڈالے کھاتے پھر رہے ہیں۔ کابل سے طرح طرح کے میوے آ رہے ہیں۔ سب مزے لے لے کر کھا رہے ہیں۔

سعیدہ: "نانی اماں! حلوا سوہن بن رہا ہے"

نانی: "ہاں۔ حلوا سوہن بن رہا ہے۔ گاجر کی ترّی تیار ہو رہی ہے۔ باجرہ کا ملیدہ بن رہا ہے۔ رس کی کھیر پک رہی ہے۔ ادھر کھایا اُدھر ہضم۔ خون ہے کہ چلوؤں بڑھ رہا ہے۔ چہرے سرخ سرخ ہو رہے ہیں بیٹا جاڑا۔ جاڑے کا کیا کہنا۔ سُبحان اللہ"

میاں جاڑے تھے کہ اپنی تعریفیں سُن سُن کر پھولے نہ سماتے تھے جب بڑی بی چپکی ہوئیں تو میاں جاڑے نے کہا: "بڑی بی خدا تم کو زندہ رکھے۔ تم نے میرا دل خوش کر دیا۔ لو یہ ایک ہزار اشرفی کی تھیلی۔ خرچ ہو جائے تو اگلے جاڑے میں مجھ سے آ کر اور لے جانا"

میاں جاڑے ہٹے اور بی گرمی مٹکتی ہوئی سامنے آئیں۔ کوئی ۱۵۔ ۱۶ برس کا سن۔ سرخ سرخ گال اُن پہ ہلکا ہلکا پسینہ۔ روشن آنکھیں لمبی کالی چوٹی۔ گلے میں موتیا کا کنٹھا۔ ہاتھوں میں مولسری کی لڑیاں۔ سر پہ کرن ٹکی ہوئی۔ باریک ڈوریہ کی پیازی اوڑھنی۔ غرض بڑی شان سے آئیں۔ اور آتے ہی کہا: "نانی جان۔ سلام"۔ بڑی بی نے کہا: "جیتی رہو۔ بوڑھ سہاگن ہو۔ کہو تم بھی کچھ پوچھنے آئی ہو۔ ابھی تمھارے

ابا تو آکر پوچھ گئے ہیں"۔ بی گرمی نے کہا "نانی جان وہ میرے ابا نہیں بڑے بھائی ہیں۔ ہاں تو میں یہ پوچھنے آئی ہوں کہ نانی جان گرمی کیسی"۔ بڑی بی نے کہا" بیٹا۔ گرمی۔ گرمی کا کیا کہنا۔ سبحان اللہ۔ دن کا وقت ہے۔ خس خانوں میں پڑے ہیں۔ پنکھے جھلے جا رہے ہیں۔ کٹورے پر کٹورا شربت کا اڑ رہا ہے۔ بچوں کے ہاتھوں میں ہزارے ہیں۔ ایک دوسرے پر چلا رہے ہیں۔ برف کی قلفیاں (قفلیاں) کھائی جا رہی ہیں۔ فصل کے میوے آ رہے ہیں۔ پتلی پتلی ککڑیاں ہیں لوکاٹ ہیں۔ آڑو ہیں"۔

حمیدہ۔ نانی اماں! انگور ہیں۔ سیب ہیں"۔

نانی "واہ بھئی۔ واہ۔ انگور اور سیب جاڑے میں ہوتے ہیں یا گرمی میں۔ تم جب بولتی ہو، بے تکی بولتی ہو۔ ہاں تو شام کو اٹھے۔ نہائے دھوئے، سفید سفید کپڑے پہنے۔ خس کا عطر ملا۔ گلے میں موتیا کے کنٹھے ہیں۔ ہاتھوں میں مولسری کی لڑیاں ہیں۔ صحن میں چھڑکاؤ ہو گیا ہے۔ گھڑونچیوں پر کورے کورے مٹکے رکھے ہیں۔ قلعی دار بجھیروں پر سوندھی سوندھی صراحیاں جمی ہیں۔ گھڑوں اور صراحیوں کے منہ پر لال لال صافیاں لپٹی ہیں۔ ارد گرد کاغذی آبخورے سجے ہوئے فالودے اور برف کا زور ہے۔ رات ہوئی کوٹھوں پر پلنگ بچھ گئے سفید سفید چادریں بچھی ہیں۔ اوپر پھول پڑے ہوئے خس کی پنکھیاں ہاتھوں میں۔ کوئی بھیگے ہوئے بان کے پلنگ پر پڑا لوٹ مار رہا ہے۔

احمد" نانی اماں کہانیاں ہو رہی ہیں"۔

نانی" ہاں کہانیاں ہو رہی ہیں۔ لوگ ہیں کہ رات پر فالیز پر جا رہے

ہیں۔ خربوزے، تربوز کھا رہے ہیں۔

محمود "کبڈی ہو رہی ہے۔"

نانی۔ ہاں کبڈی ہو رہی ہے۔ ریتی میں لوٹ رہے ہیں۔ صبح نہا دھو مزے مزے گھر آ گئے۔ بیٹا گرمی کا کیا کہنا۔ سبحان اللہ۔

بی گرمی کا یہ حال تھا کہ تعریفیں سنتی جاتی تھیں اور نہال ہوئی جاتی تھیں۔ جب بڑی بی تعریفیں کرتے کرتے تھک کر چپ ہو گئیں تو بی گرمی نے چپکے سے نکال کر ایک ہزار اشرفی کی تھیلی ان کے ہاتھ میں دی اور کہا "نانی جان۔ خدا تمھارا بھلا کرے۔ آج تم نے میری لاج رکھ لی۔ ورنہ بڑے بھائی صاحب تو مارے طعنوں کے مجھے جینے بھی نہ دیتے۔ میں ہر سال آیا کرتی ہوں۔ جب آؤں۔ بے کھٹکے جو لینا ہو مجھ سے لے لیا کیجئے۔ بھلا آپ جیسے چاہنے والے مجھے کہاں ملتے ہیں۔"

بی گرمی ذرا ہٹی تھیں کہ برسات خانم چھم چھم کرتی آ پہنچیں۔ سانولا نمکین چہرہ۔ چمک دار روشن آنکھیں۔ بھورے بال۔ ان میں سے پانی کی باریک باریک بوندیں۔ اس طرح ٹپک رہی تھیں جیسے موتی۔ ہاتھوں میں دھانی چوڑیاں جسم پر بادلہ ٹکا ہوا۔ آبی رنگ کا باریک دوپٹہ۔ غرض ان کے آتے ہی برکھا رت چھا گئی۔ انھوں نے بڑھ کر کہا "اماں جان سلام" بڑی بی نے کہا "بیٹا جیتی رہو۔ پیٹ ٹھنڈا رہے ہو نہ ہو تم بی گرمی کی بہن برسات خانم ہو" بی برسات نے کہا۔ "جی ہاں۔ میں پوچھنے آئی ہوں کہ میں کیسی ہوں" بڑی بی نے کہا۔ "بی برسات تمھارا کیا کہنا ہے۔ تم نہ ہو تو لوگ جئیں کیسے۔ مینہ چھم چھم برس رہا ہے۔ باغوں میں کھمب گڑھے ہیں۔ جھولے پڑے ہیں۔ عورتوں کے ہاتھوں

میں مہندی رچی ہے۔ شہرخ سرخ جوڑے۔ دھانی چوڑیاں پہنے، جھول رہی ہیں۔ کچھ جھلا رہی ہیں۔ ملار گائے جا رہے ہیں۔ ایک طرف کڑھائی چڑھی ہے۔ دوسری طرف بری پراٹھے پک رہے ہیں، مرد ہیں کہ تیرا کی کا میلہ دیکھنے گئے ہیں۔ لوگوں کے جمگھٹ ہیں۔ دریا چڑھے ہوئے ہیں۔ کوئی کسی طرح تیر رہا ہے کوئی کسی طرح۔ اودی اودی گھٹائیں چھائی ہوئی ہیں پھوار پڑ رہی ہے نوروز ہو رہے ہیں۔ حوضوں میں آم پڑے ہیں۔ آم کھا رہے ہیں۔ گٹھلیاں چل رہی ہیں۔ برسات بھئی برسات کا کیا کہنا۔ سبحان اللہ۔ بی برسات نے بھی ایک ہزار اشرفی کی تھیلی بڑی بی کے نذر کی اور رخصت ہوئیں۔ شام ہوتی چلی تھی۔ بڑی بی تھیلیاں سمیٹ سماٹ خوشی خوشی گھر آئیں۔ ان کی بہو نے دیکھا بڑھیا بستر البغل میں دابے چلی آ رہی ہے۔ آگ بگولہ ہو گئی۔ کہنے لگی "بڑھیا تو میرے گھر میں کیوں گھسی۔ کیا اپنا کفن لے کر آئی ہے۔ اب نکلتی ہے یا دھکے دے کر نکالوں" بڑھیا نے کہا "بیٹا۔ خفا کیوں ہوتی ہے۔ میں خالی ہاتھ تھوڑی آئی ہوں۔ تین ہزار اشرفی لائی ہوں۔ نکالتی ہے نکال دے۔ میں اپنا الگ گھر لے کر رہ جاؤں گی" بہو نے جو پوٹلی دیکھی اور تین ہزار اشرفیوں کا نام سُنا تو منہ میں پانی بھر آیا۔ کہنے لگی "اماں جان کیا سچ مچ تین ہزار اشرفیاں لائی ہو۔ ذرا میں بھی تو دیکھوں۔ تم صبح سے کہاں چلی گئی تھیں۔ آپ کا انتظار کر کرتے خدا جھوٹ نہ بلائے تو تین بجے کھانا کھایا ہے۔ وہ بھی آپ ہی کو ڈھونڈنے گئے ہوئے ہیں" اتنے میں بیٹے صاحب بھی آ گئے۔ وہ کچھ کہنا ہی چاہتے تھے کہ بیوی نے آنکھ کے اشارے سے منع کر دیا۔ اب کیا تھا۔ تھیلیاں کھولی گئیں کئی کئی دفعہ

اشرفیاں گنی گئیں۔ دو سو نکال لیں۔ باقی گڑھا کھود کر دبا دیں۔ اوپر بیٹے بہو نے اپنا بستر کر دیا۔ رات ہی کو نانبائی کے ہاں سے اچھے سے اچھا کھانا، حلوائی کے ہاں سے اچھی سے اچھی مٹھائی آئی۔ سب نے مزے مزے سے کھائی۔ صبح ہوئی تو بیٹے صاحب جا۔ اپنے اور بیوی کے لئے اچھے سے اچھے تھان لائے۔ کپڑے بننے شروع ہوئے۔ بڑی بی کے پجاموں کے لئے آٹھ آنے گز والی چھینٹ۔ انگیا کرتی کے لئے چار آنہ گز والی ململ۔ لال نری کی گول پنجے کی جوتی۔ سر میں ڈالنے کو دھوئی تلی کا تیل۔ کانوں کے لئے۔ ملمع کی چار چار بالیاں۔ ہاتھوں کے لئے ڈیڑھ ڈیڑھ ماشے کے دو چھلے۔ غرض بہت کچھ آیا۔ بہو اور بیٹا خوش خوش تھے کہ بڑھیا قارون کا خزانہ لے آئی۔ بڑھیا خوش تھی کہ بہو اور بیٹے نے ماں تو سمجھا۔ چلو سب ہنسی خوشی رہنے سہنے لگے۔ بی ہمسائی نے جو یہ چہل پہل دیکھی تو اُن سے نہ رہا گیا۔ ایک دن پوچھا بہن میں ایک بات پوچھوں برا تو نہ مانو گی" بڑھیا کی بہو نے کہا۔ "شوق سے پوچھو۔ بُرا ماننے کی کون سی بات ہے" بی ہمسائی نے کہا" بہن۔ آخر ہم سے بھی تو کہو کہ یہ تمہاری ساس کہاں سے روپیہ لے آئیں۔ کہیں ایسا ویسا تو نہیں ہے۔ بہن زمانہ بہت بُرا ہے اگر چوری کا نکلا تو بڑھیا کے ساتھ کہیں تم بھی لپیٹ میں نہ آجاؤ۔ "حق ہمسایہ ماں کا جایا، ہم کہے دیتے ہیں۔ آگے تم جانو تمہارا کام جانے" بڑھیا کی بہو نے کہا" نا بہن۔ یہ بڑھیا چوری کے قابل رہی ہے۔ اِس کو تو یہ روپیہ جاڑے۔ گرمی۔ برسات نے دی ہے" بی ہمسائی نے ناک پر انگلی رکھ کر کہا" اوئی، بوا۔ اپنے ہوش کی دوا کرو۔ بھلا جاڑا

گرمی۔ برسات۔ کہیں روپیے بانٹتے پھرتے ہیں۔ تم نے مجھے کوئی دیوانہ سمجھا ہے۔ جو ایسی اڑان گھائیاں بتاتی ہو۔ بتاؤ۔ نہیں بتاتیں نہ بتاؤ۔ ہمارا سمجھانے کا کام تھا۔ سمجھا دیا۔" بڑھیا کی بہو ڈری کہ بی ہمسائی اِدھر اُدھر کچھ کی کچھ نہ لگاتی پھریں۔ ساس پر جو گزری تھی وہ بی سنا دی بی ہمسائی سنتی رہیں، ہنستی رہیں۔ سب کچھ سُن سُنا کھڑکی بند کر اپنے میاں کے پاس پہنچیں اور اُن کو سارا قصہ سنا دیا۔

بیٹے صاحب نے جو سُنا تو کہا، لاؤ ہم بھی لگے ہاتھوں اپنی بڑھیا کے ذریعہ سے روپیہ سمیٹ لیں۔ اُن کی بھی ماں تھیں۔ وہ بڑھیا کیا آفت کی پڑیا تھی۔ گھر بھر کا ناک میں دم کر رکھا تھا۔ ذرا بگڑی اور بہو کے سات پشت کو تو م ڈالا۔ بہو نے کچھ کہا اور قیامت آگئی۔ بہو کو آج موقع ملا۔ میاں کو سمجھا بجھا کر بڑھیا کی خوب کندی کرائی۔ اور ڈنڈا ڈولی کر جنگل میں اُسی بڑ کے نیچے ڈال آئے۔ بڑھیا نے چیخ چیخ کر سارا جنگل سر پر اُٹھا لیا۔ خدا کا کرنا کیا ہوتا ہے کہ جاڑا۔ گرمی۔ برسات۔ تینوں اس دن پھر ملے۔ ایک نے دوسرے سے پوچھا "کہو بھئی، بڑھیا نے کیا تصفیہ کیا۔"

جاڑے نے کہا، "اُس نے مجھے اچھا بتایا۔" گرمی نے کہا "مجھے اچھا بتایا" برسات نے کہا "مجھے اچھا بتایا۔" جاڑے نے کہا "بھئی وہ بڑھیا آفت کی پرکالا تھی۔ یہ نہیں بتایا کہ تینوں میں کون اچھا ہے۔ سب ہی کی تعریفیں کر مفت میں تین ہزار اشرفیاں مار لیں۔ غرض تینوں چلے پھٹے اُسی بڑ کی طرف آئے۔ دیکھا کہ ایک بڑھیا بیٹھی رو رہی ہے۔ پہلے میاں جاڑے پہنچے۔ اُن کا آنا تھا کہ بڑھیا سردی سے تھر تھر

کانپنے لگی۔ جاڑے نے کہا، "بڑی بی سلام۔ مزاج تو اچھا ہے"۔ بڑھیا بولی" چل بڈھے پرے ہٹ۔ بڑی بی ہوگی تیری میّا۔ اب جاتا ہے یا نہیں۔ خود تو روئی کا بنولہ بن کر آیا ہے اور اس جاڑے میں غریبوں کا مزاج پوچھتا ہے۔ چل سامنے سے ہٹ۔ دھوپ چھوڑ" میاں جاڑے نے کہا "بڑی بی، میں جاڑا ہوں، سچ بتانا میں کیسا ہوں" بڑی بی نے کہا "آپ اس بڑھاپے میں بھی اپنی تعریف چاہتے ہیں۔ لو۔ اپنی تعریف سُنو۔ آپ آئے، اس کو فالج ہوا۔ اس کو لقوہ ہوا۔ ہاتھ پاؤں پھٹے جارہے ہیں۔ ناک سُرسُر بہ رہی ہے۔ دانت ہیں کہ کڑکٹ بج رہے ہیں کپڑے اِدھر پہنے اُدھر میلے ہوئے۔ رضائی ہے کہ لٹکی پڑتی ہے۔ لحاف ذرا کھلا اور سر سے ہوا گھسی۔ بچھونے ہیں کہ برف ہو رہے ہیں۔ کھانا اِدھر اُترا۔ اُدھر جما۔ اور جو خدانخواستہ مہاوٹوں میں کہیں اولے پڑ گئے تو غضب ہی ہوگیا۔ سی سی کر رہے ہیں۔ بتیسی بج رہی ہے۔ ناک معلوم ہوتا ہے کہ مُنہ پر ہے ہی نہیں۔ انگلیاں ہیں کہ ٹیڑھی ہوئی جاتی ہیں۔ آنکھوں سے پانی بہا جارہا ہے۔ نہ کام ہوسکتا ہے نہ کاج۔ آخر کہاں تک کوئی آگ تاپے اور دھوپ سینکے۔ توبہ توبہ آگ کی بھی تو گرمی جاتی رہتی ہے لیجئے۔ اپنی تعریف سُنی یا اور سناؤں"۔ جاڑا جلا ہوا تو پہلے کا تھا۔ اب جو بڑھیا کی یہ جلی کٹی باتیں سنیں، تو اور جل کر کوئلہ ہوگیا۔ اپنی ٹھوڑی پکڑ۔ ڈاڑھی کی جو ہوا دی تو بڑھیا کو لقوہ ہوگیا چلتے چلتے دو تین ٹھوکریں بھی رسید کردیں۔ ذرا فاصلہ پر بی گرمی اور بی برسات کھڑی تھیں۔ اُن سے کہا" لو۔ جاؤ۔ بڑھیا سے اپنا تصفیہ کرالو۔ ہم تو ہار گئے"۔

بی گرمی خوشی خوشی بڑھیا کے پاس آئیں اور کہا "نانی اماں سلام"۔ بڑھیا نے کہا "چل دور ہو نگوڑی، میں تیری نانی کیوں ہونے لگی۔ آج مجھے نانی بنایا ہے کل کسی کو خصم بنائے گی۔ اے۔ ہے۔ تو ایسی جوان جان اور جنگل جنگل پھر رہی ہے۔ آوارہ ہو گئی ہوگی جو ماں باپ نے گھر سے نکال دیا۔ اور نکالا بھی ایک کپڑے سے۔ اچھا ہوا۔ تم جیسے ولدروں کے ساتھ ایسی ہی کرنی چاہئے"۔ بی گرمی نے کہا: "نانی اماں۔ میں ہوں گرمی، تم سے یہ پوچھنے آئی ہوں کہ گرمی کیسی"۔ یہ سننا تھا کہ بڑھیا کے تو آگ لگ گئی۔ کہنے لگی: "اوہو۔ چونی بھی کہے مجھے گھی سے کھاؤ۔ ابھی تمہارے بھائی صاحب اپنی تعریف سُن گئے ہیں۔ لو تم بھی سُن جاؤ۔ گرمی۔ گرمی کا کیا کہنا۔ سبحان اللہ۔ واہ۔ واہ پسینہ بہ رہا ہے۔ کپڑوں میں سے بُو آرہی ہے۔ صبح کپڑے بدلے شام تک چیکٹ ہو گئے۔ کھانا کھایا ہے۔ کسی طرح ہضم نہیں ہوتا۔ سینہ پر رکھا ہے۔ صبح ہوئی اور لُو چلنی شروع ہوئی۔ اس کو لو لگی۔ اُس کو ہیضہ ہوا۔ منہ جھلسا جاتا ہے۔ ہونٹوں پر پپڑی جمی ہوئی ہے۔ پانی پیتے پیتے جی بیزار ہو جاتا ہے۔ پانی کیا تھڑے کا پانی ہے۔ سینہ پر اونٹ رہا ہے۔ زمین آسمان تپ رہے ہیں۔ دن بھر آگ برستی ہے۔ رات بھر ریت برستی ہے۔ نیند غائب ہے۔ نہ اس کروٹ چین آتا ہے نہ اُس کروٹ پنکھا ہاتھ سے نہیں چھوٹتا۔ ذرا ہاتھ رُکا اور دم گھٹنے لگا۔ ذرا خدا خدا کرکے نیند آئی اور کھٹمل نے چٹکی لی۔ آنکھ کھُل گئی۔ اور پھر وہی مصیبت۔ ہاں بیگم صاحب کیوں نہ ہو گرمی ہو۔ تمہاری جتنی تعریف کی جائے کم ہے۔ چل دور ہو میرے سامنے سے۔ نہیں تو، ایسی بے نقط سناؤں گی کہ تمام عمر بھر یاد کرے گی"۔

بڑھیا کی باتیں سُن کر بی گرمی تو آگ بگولا ہوگئیں۔ کہا "ٹھیر۔ بڑھیا دیکھ تجھے اس بدزبانی کا کیا مزا چکھاتی ہوں۔ خیر نہیں مجھے تونے کیا سمجھا ہے۔" یہ کہہ کر جو پھونک ماری تو ایسا معلوم ہوا کہ لو لگ گئی۔ بڑھیا تو "ہائے مری" کہتی رہی۔ بی گرمی پیٹھ پر ایک دوہتڑ مار چلتی بنی۔

جب ان کو بھی روکھی صورت بنائے آتے بی برسات نے دیکھا تو دل میں بہت خوش ہوئیں اور سمجھیں چلو میں نے پالا مار لیا۔ بڑی مٹکتی مٹکاتی بڑھیا کے پاس گئیں اور کہا "نانی جان سلام، کہیے مزاج تو اچھا ہے؟" بڑی بی نے کہا "بابا۔ مارلو۔ پھر مزاج پوچھنا۔ وہ تو اپنے دل کی بھڑاس نکال گئے تم کیوں لگی لپٹی رکھتی ہو۔ بے وارثہ سمجھ لیا ہے۔ جو آتا ہے مار جاتا ہے۔" بی برسات نے کہا "نانی جان خدا نہ کرے میں کیوں مارنے لگی۔ وہ تو دونوں ہوئے ایسے ہی ہیں۔ خواہ مخواہ بیٹھے ٹھائے بچاری بڑی بی کا مار مار کو پلیتھن نکال دیا۔ نانی جان آپ بےخوف رہئے۔ میں ایسا بدلہ لوں گی کہ وہ دونوں بھی تمام عمر یاد ہی کریں گے۔" یہ سُن کر ذرا بڑھیا کے حواس درست ہوئے۔ آنکھ اُٹھا کر کیا دیکھتی ہے کہ ایک جوان لڑکی نہائی، دھوئی آب رواں کا دوپٹہ اوڑھے سامنے کھڑی ہے۔ کہنے لگی "لڑکی۔ کیا دیوانی ہے جو اس طرح گیلے بالوں سے شام کے وقت جنگل میں آئی ہے۔ اور تیرا کوئی والی وارث بھی ہے یا نہیں جو اس طرح اکیلی ماری ماری پھرتی ہے۔ جا۔ اپنے گھر جا کر بیٹھ۔ کیوں باپ دادا کا نام بدنام کرتی ہے۔ اور میں تو بالکل ننگی ہے جا۔ جا۔ دور ہو۔ میں تجھ جیسی لچّی۔ لفندریوں سے بات بھی کرنا نہیں چاہتی۔

بی برسات نے کہا" نانی جان خفا کیوں ہوتی ہو۔ میں برسات ہوں اچھا یہ تو بتا دو کہ برسات کیسی" بڑھیا نے کہا" برسات خدا نخواستہ آپ بھی تعریف کے قابل ہیں۔ اے۔ ہے۔ تم سے خدا بچائے۔ بجلی چمک رہی ہے بادل گرج رہے ہیں۔ کلیجہ ڈھلا جاتا ہے۔ دھما دھم کی آوازیں آرہی ہیں۔ یہ مکان بیٹھا۔ وہ پاکھا گرا۔ جو مکان گرنے سے بچ گیا۔ اُس میں یہاں ٹپکا لگا۔ وہاں ٹپکا لگا۔ کبھی اِدھر کے بچھونے اُدھر بچھ رہے ہیں۔ کبھی اُدھر کا پلنگ اِدھر آرہا ہے۔ باہر نکلنا مشکل ہے ذرا پاؤں باہر رکھا اور چھینٹے سر سے اوپر گئے۔ سواری پاس سے نکل گئی تو سب کپڑے چھینٹم چھانٹ ہو گئے۔ ذرا تیز چلے اور جوتیاں کیچڑ میں پھنس کر رہ گئیں۔ ہوا بند ہے۔ اُوس ہو رہی ہے۔ کپڑے ہیں کہ چھیٹے جا رہے ہیں۔ رات کو مچھر ہیں کہ کھائے جاتے ہیں۔ کھٹمل ہیں کہ کاٹے جا رہے ہیں۔ نہ رات کو نیند نہ دن کو چین۔ اور پھر اس پر یہ سوال کہ نانی جان میں کیسی ہوں۔ نانی جان سے تعریف سُن لی۔ اب تو دل ٹھنڈا ہوا۔ اے۔ ہے۔ یہ بے موسم کی گرج کیسی خدا خیر کرے۔" بڑھیا یہ کہہ ہی رہی تھی کہ برسات کی نگاہ بجلی بن کر گری۔ اور بڑی بی کے پاؤں کو چاٹتی ہوئی نکل گئی۔ اِدھر بی برسات بڑھیا کو لنگڑا کر منہ پر تھوک رخصت ہوئیں اور اُدھر اُن کے بہو اور بیٹا اشرفیوں کی تھیلی لینے کے شوق میں بڑ کے نیچے پہنچے۔ کیا دیکھتے ہیں کہ بڑی بی۔ پٹی۔ کٹی لوتھ۔ لوتھ پڑی ہیں۔ بڑی مشکل سے لاد لود کر گھر لائے۔ خوب ہلدی چونا تھوپا۔ مرہم پٹی کی جب کہیں جا کر سر بارہ دن میں بڑھیا اس قابل ہوئی کہ اپنی کہانی بیان کرے۔ بہو اور بیٹے نے

جو سنا کہ بڑھیا نے جاڑے۔ گرمی۔ برسات کو بُرا بھلا سُنا کر اور اشرفیاں کھو کر جوتیاں کھائیں تو ان دونوں نے بھی اس کو خوب مارا اور گھر سے نکال دیا۔ اب بچاری سڑک کے کنارے بیٹھی بھیک مانگا کرتی ہے مگر ایسی نکچڑھی کو کوئی بھیک بھی تو نہیں دیتا۔ بیٹا۔ بات یہ ہے کہ اللہ شکر خورے کو شکر ہی دیتا ہے۔ جو لوگ خوش مزاج ہوتے ہیں وہ ہر حال میں خوش رہتے ہیں۔ اور موئے رونی صورت تو ہمیشہ جوتیاں ہی کھاتے ہیں۔ اے۔ ہے۔ ایلو۔ یہ احمد تو سو گیا۔ سعیدہ ذرا اُٹھا کر اسے پیشاب تو کرا لے۔ کہیں ایسا نہ ہو موت کر میرے بچھونے خراب کر دے۔"

فرمانبردار بیٹا

سلیمان اعظم پر ترک تو کیا اگر سارے مسلمان فخر کریں تو بجا درست ہے۔ ایک بادشاہ میں جتنی خوبیاں ہونی چاہئے وہ اس میں بدرجہ اتم موجود تھیں۔ دربار میں اس کا رعب داب ایسا تھا کہ بڑے بڑے سرکش آنکھ ملانے کی تاب نہ لاتے تھے۔ لڑائی میں اس کی چالیں اس بلا کی تھیں کہ دنیا کے زبردست سے زبردست جرنیل ان کو سمجھنے سے عاجز تھے۔ خلوت میں اس کا علم ایسا کہ جید سے جید عالم اس کے سامنے زبان کھولتے ہوئے گھبراتے تھے۔ رعایا اس پر ایسی دل دادہ اور وہ رعایا کا ایسا عاشق تھا کہ ایک کو دوسرے سے اپنا حال دل کہنے میں ذرا باک نہ ہوتا تھا۔ اس کے دربار میں غریب سے غریب کسان اپنا حال بیان کرنے میں ذرا نہ جھجکتا تھا۔ اور وہ اس غریب کے مقابل میں بڑے سے بڑے گورنر اور چاہتے سے چاہتے مصاحب کو سزا دینے میں کبھی تامل نہ کرتا تھا یہی وجہ تھی کہ رعایا شاد اور ملک آباد تھا۔ قسمت اس بلا کی لے کر آیا تھا کہ جس کام میں ہاتھ ڈالا اس کو پورا کیا۔ جس مہم کا قصد کیا اُس کو سر کیا۔ اور جس سرکش کو دبایا اُس کو پھر سر اُٹھانے کی ہمت نہ ہوئی اگر ایک طرف سلطنت کو بڑھاتے

لہ یہ پورا مضمون تاریخی ہے۔ یہاں تک کہ گفتگو کے الفاظ میں بھی کوئی رد و بدل نہیں کیا گیا ہے۔

بڑھاتے اُس کی سرحد وائنا سے ملادی تو دوسری طرف تمام بحرِ روم میں اپنے بیڑے کی دھاک بٹھادی۔ اگر ایک جانب بلقان کی ریاستوں میں سکہ جاری کیا۔ تو دوسری جانب تمام شمالی افریقہ میں اپنا خطبہ پڑھوا دیا۔ اُس کی آواز اگر میدانِ جنگ میں سپاہیوں کے دلوں کو مضبوط کرتی تھی تو اُس کا قلم مُلک میں امن و امان کے دریا بہاتا تھا۔ اس نے ان لڑائی جھگڑوں کے ساتھ ساتھ اپنے ملک کے انتظام کو بھی ہاتھ سے نہیں دیا۔ ملک کی مناسب تقسیم اور قوانین کی تدریج سے ترکی کو دنیا کا بہترین مُلک بنادیا۔ اس کے قوانین ایسے تھے کہ انھیں اگر عدل وانصاف کی جان کہا جائے تو بجا ہے۔ یورپ کے بادشاہوں نے اپنے سفیروں کے ذریعہ سے ان کی نقلیں منگوائیں لوگوں کو بھیج بھیج کر عدالت کے آداب و طریقے سکھوائے۔ اور اُن پر عمل پیرا ہونے کو اپنی اور اپنے ملک کی بہبودی کا باعث سمجھا۔ یورپ کے ملکوں میں آج جو قوانین رائج ہیں، ان کی بنیادیں قوانین روما کے ساتھ اس بادشاہ کے اکثر احکام پر بھی قائم ہیں۔ اگر یورپ والوں نے اس کو (Magnicent) (محتشم) اور اعظم کا خطاب دیا ہے تو خود اس کے ملک والے اس کو سلیمان قانونی کے نام سے یاد کرتے ہیں۔

خدا نے اُس کو ایک فرزند بھی ایسا عطا کیا تھا جو علم وفضل تدبر وکاردانی۔ سپاہگری وجہانبانی میں کسی طرح باپ سے کم نہ تھا۔ مصطفےٰ پاشا کو چھوٹی ہی عمر میں ایک صوبہ کا والی مقرر کیا گیا۔ اور اُس نے تھوڑے ہی دنوں میں بتادیا کہ سلیمان اعظم کا اگر کوئی سچا جانشین ہوسکتا ہے،

تو وہ ہوسکتا ہے۔ رعایا اس پر جان دیتی تھی۔ فوج اس کی عاشق تھی۔ علماء اس کی قدر کرتے تھے۔ اور نافرمانوں اور سرکشوں کی روح اس کے نام سے کانپتی تھی۔ بدطینت لوگوں نے باپ بیٹے میں لڑائی ڈلوانے کی ہزار کوشش کی۔ لیکن باپ کو بیٹے پر اتنا اعتماد تھا کہ اس نے ہر شکایت کرنے والے کو جھڑک دیا۔ اور بیٹے کی شکایت سننے سے ہمیشہ اپنے کان بند کرلئے۔ بیٹے کو باپ پر اتنا بھروسا تھا کہ نہ تو اس نے کبھی ان شکایتوں کے متعلق کوئی شکایت کی اور نہ شاکیوں کے خلاف اپنے باپ سے کچھ کہا۔ وہ جانتا تھا کہ میری فرماں برداری نے جو گھر باپ کے دل میں کرلیا ہے اس میں ایسی بے سروپا شکایتیں در انداز نہیں ہوسکتیں۔ وہ سمجھتا تھا کہ باپ کو میرے ساتھ جو محبت ہے وہ کسی شکایت سے نہیں مٹ سکتی۔ لیکن وہ نہیں جانتا تھا کہ اگر باپ کے دل میں کسی دوسرے کی محبت بس گئی اور دونوں محبتوں کا مقابلہ ہوا تو معلوم نہیں کونسی محبت دب جائے اور کون سی غالب آجائے۔ اور اگر خود اس کا خیال باپ کے دل سے نکل جائے تو خدا جانے اس پر کیا مصیبت نازل ہوجائے۔

خدا کے کارخانوں میں بھلا کس کو دخل ہے۔ ان باپ بیٹوں کی محبت کو ایک عورت کے جال نے ایسا توڑا کہ آخر بیٹے کو خود باپ کے ہاتھوں موت کے گھاٹ اُتروادیا۔

زرینہ کا سلیمان اعظم کی حرم سرا میں داخل ہونا۔ گویا ترکی سلطنت کی بنیادوں کا ہل جانا تھا۔ یہ نہ تو کچھ بہت خوبصورت تھی اور نہ بہت تعلیم یافتہ مگر اس بلا کی جوڑ توڑ کرنے والی تھی کہ اس کے

تریا چلتر بڑے بڑوں کی سمجھ میں آنے مشکل تھے۔ زرینہ کا باپ روس کا ایک غریب پادری تھا۔ خدا جانے یہ اپنے گھر سے کیونکر نکلی اور کیونکر قسطنطنیہ پہنچ کر حرم سرا میں داخل ہوئی۔ قسمت نے یاوری کی۔ تھوڑے ہی دنوں میں اس کے ناز و ادا نے سلیمان کو اپنا گرویدہ کر لیا۔ اس نے بھی اس موقع سے پورا فائدہ اُٹھایا۔ چھوٹتے ہی پہلے مصطفےٰ پاشا ولی عہد کی ماں پر ہاتھ مارا۔ کسی بات پر سلطانہ کو خوب کوسا کاٹا۔ بھلا ولی عہد کی ماں یہ زبان درازی کب گوارا کر سکتی تھی۔ اُس نے نوکروں کو بلوا اس منہ پھٹ کو خوب پٹوایا۔ زرینہ نے خود بھی اپنا مُنہ نوچ نوچ کر لہولہان کر لیا۔ جب رات کو بادشاہ نے اُس کو طلب کیا تو کہلا بھیجا کہ میرا منہ اس قابل نہیں رہا ہے کہ حضوری میں آسکوں۔ آخر بڑے کہنے سننے سے آئی۔ بہت روئی پیٹی۔ ایک ایک کی دس دس لگائیں۔ سلیمان تو اس پر جان دیتا ہی تھا۔ حکم ہوا کہ سلطانہ کو محل سے نکال دو۔ وہ بچاری یہاں سے نکل بیٹے کے پاس پہنچی۔ مصطفےٰ پاشا اس وقت کرمانیا کا والی تھا۔ اس طرح ملک میں ان عورتوں نے دو محاذ جنگ قائم کر دیے ایک قسطنطنیہ میں اور دوسرا کرمانیا میں۔

بایزید اول کے وقت سے سلاطین ترکی شادی نہیں کرتے تھے۔ وجہ یہ تھی کہ بایزید نے شہزادی رسپائنا سے شادی کی تھی۔ وہ لڑائی میں تیمور کے ہاتھ پڑی۔ تیمور نے اس سے لونڈی کی طرح کام لیا اس بے عزتی کا اثر شاہان ترکی کے دلوں پر ایسا پڑا کہ انھوں نے شادی کرنے کا خیال ہی دل سے نکال دیا۔ مصطفےٰ پاشا کی ماں بھی حرم تھی۔ اور زرینہ بھی حرم تھی۔ اب زرینہ کو خیال آیا کہ کسی طرح خود

سلطانہ بن کر سب حرموں کو محل سے نکال دے۔ آخر سوچتے سوچتے ایک ترکیب نکالی جو کچھ روپیہ وپیسہ جمع کیا تھا اُس کو راہ خدا میں خرچ کرنا شروع کیا۔ مسجدیں بنوائیں۔ خانقاہیں بنوائیں۔ مدرسے بنوائے غرض لاکھوں روپیہ ان نیک کاموں میں اٹھا کر مفتی اعظم سے دریافت کیا کہ "رفاہ عام کے کاموں کا اجر مجھ کو ملے گا یا نہیں"۔ انھوں نے لکھ کر بھیجا کہ "خدا کی راہ میں جو کام کیا جائے اس کا اجر ضرور ملتا ہے۔ مگر چونکہ تم آزاد نہیں ہو۔ اس لئے تمھارا مالک اس اجر کا مستحق ہے"۔ یہ فتوےٰ ملنا تھا کہ وہ نیا رنگ لائی۔ سلیمان کے پاس دکھی صورت بنا کر گئی۔ اُس نے وجہ پوچھی تو رو رو کر برا حال کر لیا اور کہا کہ "دیکھئے قیامت میں مجھ پر کیا گذرتی ہے۔ میں غلام ہوں کوئی نیک کام بھی کرتی ہوں تو اُس کا اجر مجھ کو نہیں ملتا"۔ بادشاہ نے اسی وقت مفتی اعظم کو بلا کر مسئلہ پوچھا۔ انھوں نے جو کچھ لکھا تھا اُس کو پھر دوہرایا۔ بادشاہ کو بھی زرینہ کے حال پر رحم آیا۔ اُسی وقت آزادی کا پروانہ لکھ دیا۔ یہ پروانہ لے۔ خوشی خوشی رخصت ہوئی۔ اس کے بعد جو بادشاہ نے خلوت میں طلب کیا تو اُس نے صاف انکار کر دیا۔ اور کہلا بھیجا کہ میں اب آزاد ہوں۔ غیر مرد کے سامنے بلا نکاح کئے نہیں آسکتی۔ کچھ دنوں سلیمان نے اپنی طبیعت کو روکا۔ آخر محبت غالب آئی اور زرینہ سے نکاح کر کے اُس کو ملکہ بنانا پڑا۔ نکاح کے بعد خرم سلطانہ کا خطاب ملا۔ اور سارے محل میں اس کا عمل دخل ہو گیا۔

زرینہ کے بطن سے سلطان سلیمان کے چار لڑکے۔ محمد۔ جہانگیر۔ بایزید

اور سلیم اور ایک لڑکی مہر ماہ ہوئی۔ محمد تو کم عمری میں مرگیا۔ جہانگیر
اپاہج تھا اور مصطفےٰ پاشا پر جان دیتا تھا۔ اس لئے کام کا نہ تھا۔
بایزید پر اس کو بھروسہ نہ تھا۔ اسی وجہ سے زرینہ نے چاہا کہ کسی طرح
سلیم کو ولی عہد بنا دے۔ سب سے پہلا کام تو اس نے یہ کیا کہ سلیم کو صوبہ
سروخاں کی گورنری سے بدل کر قونیہ کی گورنری پر بلوا لیا۔ تاکہ قریب ہونے
کی وجہ سے ضرورت کے وقت فوراً قسطنطنیہ آسکے۔ اس کے ساتھ
ساتھ بادشاہ کے چہیتے وزیر ابراہیم پاشا کے خلاف سازشیں شروع
کیں تاکہ اپنے داماد رستم پاشا کو وزارت پر جمائے۔ ابراہیم اور سلیمان
میں ایسی دوستی تھی کہ شاید ہی کسی وزیر اور بادشاہ میں کبھی ہوئی ہو اور
کیوں نہ ہوتی۔ ابراہیم پاشا کوئی معمولی آدمی نہ تھا۔ تاریخ میں ایسے بہت
کم وزیر ملیں گے جو بند وبست ملک اور انتظام میدان جنگ دونوں
میں اس کا مقابلہ کرسکیں۔ سلیمان نے ابراہیم سے وعدہ کیا تھا کہ جب
تک میں زندہ ہوں۔ تجھ کو کوئی گزند نہ پہنچے گا۔ ابراہیم کو اس وعدے
پر اعتبار تھا۔ اس لئے اکثر اپنی مرضی سے وہ کام کر بیٹھتا تھا جو اس
کے اختیارات۔ کے باہر ہوتے تھے۔ لیکن سلیمان ہمیشہ طرح دے جاتا
اور کہتا کہ "کیا کروں تجھ سے وعدہ کیا ہے۔ لاچار ہوں۔ نباہوں گا۔" زرینہ
کو بھی اس وعدے کی خبر تھی۔ سوچتے سوچتے ایک پہلو نکالا کہ بادشاہ
نے زندہ رہنے تک ابراہیم کا ساتھ دینے کا وعدہ کیا ہے۔ سوتا اور مرا
دونوں برابر ہیں۔ اگر بادشاہ کے سوتے وقت ابراہیم کو قتل کر دیا جائے تو
اس وعدہ پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔ اُسی زمانہ میں ابراہیم پاشا نے ایک دوسرے
جرنیل کو جو اس کے ساتھ ایران پر فوج کشی کے لئے بھیجا گیا تھا، قتل کر دیا

بادشاہ کو یہ بات ناگوار ہوئی۔ زرینہ سے شکایت کی اور ساتھ ہی اپنے وعدہ کا بھی ذکر کیا۔ زرینہ نے کہا "یہ کیا مشکل ہے۔ آپ سو جائیے میں ابراہیم کو ٹھکانے لگا دیتی ہوں"۔ معلوم نہیں کہ سلیمان اس پر راضی ہوا یا نہیں۔ مگر یہ ضرور ہوا کہ اُسی رات کو ابراہیم پاشا قتل کر دیا گیا اس کے بعد تھوڑے دنوں کے لئے اعجاز پاشا اور سلیمان پاشا وزیر ہوئے لیکن سال بھر کے اندر ہی اندر خرم سلطانہ نے اپنے داماد رستم پاشا کو وزارت کی کرسی پر لا بٹھایا۔ رستم پاشا نے وزارت ملتے ہی مصطفےٰ پاشا کو چھیڑنا شروع کیا۔ بڑے سخت سخت احکام جاری کئے۔ تنخواہ کم کر دی۔ مراسلات میں سے القاب و آداب حذف کئے۔ مگر مصطفےٰ پاشا نے ان چیزوں کا خیال تک نہ کیا۔ اور اس کی فرمانبرداری میں ذرہ برابر فرق نہ آیا۔ جب اس طرح کام نہ چلا تو بادشاہ کی جانب سے زہر آلود خلعت بھیجا گیا۔ مصطفےٰ پاشا کی ماں اپنی سوکن کو خوب سمجھتی تھی۔ اس لئے پہلے لانے والے ہی کو یہ خلعت پہنوایا۔ اور اس طرح ایک ناکردہ گناہ زرینہ کی چالوں کا شکار ہو گیا۔ جب یہاں بھی ناکامی ہوئی تو کھلم کھلا مخالفت شروع ہوئی۔ قسمت نے یاوری کی تھوڑے ہی دنوں میں اس کو ایک موقع بھی مل گیا۔ شاہ طہماسپ صفوی ایران کے بادشاہ کا بھائی الیاس مرزا قسطنطنیہ پہنچا اور اپنے بھائی کے خلاف سلطان سلیمان سے مدد چاہی۔ زرینہ تو ایسے موقعہ کی تاک ہی میں تھی۔ کہہ سن کر بادشاہ کو فوج کشی پر راضی کر لیا۔ اس میں دو مصلحتیں تھیں ایک یہ کہ بادشاہ کی عدم موجودگی میں شہزادہ سلیم کو حکومت کرنے کا موقع ملے۔ دوسرے

یہ کہ بادشاہ کو مصطفیٰ کے خلاف بھڑکانے کی شکل نکلے۔ ابھی قسطنطنیہ میں لشکر جمع ہو رہا تھا کہ مصطفیٰ پاشا کا ایک افسر گرفتار ہو کر دربار میں لایا گیا۔ اور اس کے پاس سے شاہ طہماسپ کے نام مصطفیٰ کا ایک خط نکلا۔ جس میں لکھا تھا کہ "اپنی لڑکی سے میری شادی کر دیجئے تو میں سلطان کو قتل کر کے لڑائی کی مصیبت سے آپ کو بچائے لیتا ہوں"۔ یہ نمک حرام افسران سازش کرنے والوں سے ملا ہوا تھا۔ اور جان بوجھ کر اس جعلی خط کے ساتھ گرفتار ہوا تھا۔ اب کیا تھا اُدھر زرینہ نے زمین آسمان ایک کر دیا۔ ادھر رستم پاشا نے مصطفیٰ پاشا کرمانیا میں حملہ کی تیاریاں کر رہا ہے۔ آخر کسی نہ کسی طرح مصطفیٰ پر لشکر کشی کی اجازت حاصل کر ہی لی۔ رستم پاشا بڑے لاؤ لشکر کے ساتھ کرمانیا کی طرف روانہ ہوا۔ مصطفیٰ پاشا نے باپ سے اس حملہ کی وجہ دریافت کی تو اُس کا جواب تک نہیں دیا گیا۔ آخر دونوں کا مقابلہ ہوا اور رستم نے شکست کھائی۔ جب بادشاہ نے بازپرس کی تو رستم نے اس شکست کا باعث مصطفیٰ کی ہر دل عزیزی بتایا اور کہا کہ ولی عہد کے مقابلہ میں کوئی فوج مقابلہ کو تیار نہیں ہے۔ زرینہ نے داماد کی ہاں میں ہاں ملائی۔ لیکن سلیمان کو کسی طرح یقین نہ آیا۔ آخر صلاح یہ ہوئی کہ ایران پر فوج کشی کے بہانہ سے کرمانیا کے پاس سے گذرا جائے اور مصطفیٰ کو طلب کیا جائے۔ اگر وہ آنے سے انکار کرے تو فوج کا رُخ بجائے ایران کے اس کی طرف پھیر دیا جائے۔ ہاں اگر وہ آ جائے تو ایسی صورت میں واقعات کی دریافت کی جائے۔

قصہ مختصر۔ لشکر روانہ ہوا۔ اور سلطان کے ساتھ زرینہ، رستم پاشا

جہانگیر اور سلیم بھی چلے۔ شام سے گزر کر جب ارغلی پہنچے تو مصطفےٰ پاشا کے نام حکم جاری ہوا کہ فوراً حاضر دربار ہو۔ ادھر یہ حکم جاری ہوا اور ادھر احمد پاشا وزیر خارجہ نے مصطفےٰ کو لکھا کہ "اگر جان عزیز ہے تو ادھر آنے کا ہرگز قصد نہ کرنا"۔ یہ دونوں خط ساتھ ہی ساتھ پہنچے۔ مصطفےٰ پاشا پریشان تھا کہ کیا کرے اور کیا نہ کرے۔ آخر مفتی کو بلایا اور پوچھا کہ "عزت کی موت، بغاوت کے شبہ سے بہتر ہے یا نہیں؟" اُنھوں نے جواب دیا کہ "شرافت کی زندگی تمام دُنیا کی بادشاہت سے بہتر ہے"۔ یہ جواب سُن کر مصطفےٰ پاشا نے دل میں ٹھان لی کہ جو کچھ ہو، سو ہو میں جاؤں گا اور ضرور جاؤں گا۔ چنانچہ اُسی وقت تھوڑے سے سوار لے کر دربار کا رُخ کا۔ زرینہ اور رُستم سمجھے تھے کہ مصطفےٰ بڑی بھاری فوج کے ساتھ آئے گا اور اس طرح باپ کو بیٹے کے خلاف بھڑکانے کا موقع ملے گا۔ لیکن مصطفےٰ کے اس طرح یکہ و تنہا آنے نے اُن کی امیدوں پر پانی پھیر دیا۔ اب صرف ایک چال رہ گئی تھی کہ مصطفےٰ پاشا کا پر جوش خیر مقدم کرنے کے لئے فوج کو اُبھارا جائے تاکہ سلطان کو یہ یقین ہو جائے کہ فوج دلی عہد کے ساتھ ہے۔ فوج تو مصطفےٰ پاشا پر جان دیتی ہی تھی۔ جب زرینہ اور رستم دونوں نے اس کو اظہار جذبہ پر اُبھارا تو اُنھوں نے شاہزادہ کے آنے پر ایسا اظہار مسرت کیا کہ کبھی اپنے بادشاہ کے لئے بھی نہیں کیا تھا۔ مصطفےٰ پاشا اس چال کو سمجھ گیا۔ اس نے ہزار کوشش کی کہ یہ جوش کم ہو لیکن ایک طرف تو فوج کے حقیقی جوش عقیدت اور دوسری طرف ان لگانے والوں کی ترکیبوں نے اس کی ایک

نہ چلنے دی اور وہ سمجھ گیا کہ اب اس جال سے نکلنا مشکل ہے۔ اس نے بہت چاہا کہ فوراً باپ سے مل کر اپنی صفائی پیش کرے لیکن زرینہ نے پورے ایک دن بادشاہ کو محل سرا سے باہر نہ آنے دیا۔ اور اس عرصہ میں وہ لگائی بجھائی کی کہ سلیمان کو حکم دینا پڑا کہ اگر کل تک فوج کا جوش کم نہ ہو تو مصطفےٰ پاشا کا خاتمہ کر دیا جائے۔ دوسرے دن شاہی خیمہ میں شاہزادہ کی طلبی ہوئی۔ اس کے ہوا خواہوں نے اس کو جانے سے بہت روکنا چاہا مگر وہ کسی طرح راضی نہ ہوا اور کہا کہ "مجھے اپنی جان جانے کا ذرا افسوس نہیں ہے۔ کیونکہ وہی شخص میری جان لے رہا ہے۔ جس نے مجھے یہ جان دی تھی"۔ بہر حال اپنے ساتھیوں سے رخصت ہوا۔ اپنی بے گناہی کے ثبوت میں سفید لباس پہنا۔ واقعات کے متعلق ایک تفصیلی خط باپ کے نام لکھ۔ جیب میں ڈالا۔ اور گھوڑے پر سوار ہو دربار کا راستہ لیا۔

رستم پاشا نے سوچ سمجھ کر راستہ میں دو رویہ فوج کا پرا قائم کر دیا تھا۔ فوج نے جو شاہزادہ کو آتے دیکھا تو اس زور سے "مصطفےٰ پاشا جوق لیشا" کے نعرے مارے کہ زمین و آسمان ہل گئے۔ زرینہ اور رستم دونوں پہلے سے بادشاہ کے خیمہ میں پہنچ گئے تھے۔ اُنھوں نے جال کی ڈوریاں کسنی شروع کیں۔ سلیمان کو بھی یقین ہو گیا کہ مصطفےٰ اگر چاہے تو ابھی مجھ کو تخت سے اتار کر خود بادشاہ بن سکتا تھا۔ اس خیال کا آنا تھا کہ اُس نے سلطانہ کو مصطفےٰ کے معاملہ میں مختار کُل کر دیا۔ یہ اجازت ملنی تھی کہ زرینہ بادشاہ کو بازو کے خیمہ میں لے گئی اور دربار کا خیمہ بالکل خالی کر دیا گیا۔

مصطفےٰ پاشا، لشکر میں سے گذر، شاہی خیمہ کے دروازہ پر آیا یہاں

اس نے اپنے ان دو چار ساتھیوں کو بھی رخصت کیا جو ہر وقت اس کے ساتھ رہتے تھے۔ کمر سے اپنا خنجر کھول کر دربان کے ہاتھ میں دیا۔ اس نے لینے سے تامل کیا تو شاہزادہ نے کہا "عزیز من، میں اپنے ساتھ اپنی بے گناہی کے سوا اور کوئی چیز باپ کے حضور میں لیجانا نہیں چاہتا۔ کیا خبر ہے کہ واقعات ایسے پیش نہ آئیں جو بلا سوچے سمجھے میرا ہاتھ خنجر پہ جا پڑے اور ہمیشہ کے لئے میری اطاعت و فرمانبرداری پر حرف آئے۔" یہ کہہ اور خنجر رکھ اس نے خیمہ کا پردہ اُٹھایا۔ کیا دیکھتا ہے کہ سارے خیمہ میں اندھیرا اور سناٹا ہے نہ آدم ہے نہ آدم زاد۔ لیکن چاروں طرف پردوں کی شکنیں چھپے ہوئے قاتلوں کا پتہ دے رہی ہیں۔ اس بدلے ہوئے رنگ کو دیکھ کر بھی وہ ذرا مایوس نہ ہوا۔ اسی طرح آہستہ آہستہ چل کر خالی تخت کے سامنے سر جھکا کر کھڑا ہوا ابھی تھوڑی دیر نہ گذری تھی کہ پہلو کے پردوں میں سے سات حبشیوں کے چودہ ہاتھ اس کی گردن کی طرف بڑھے۔ یہ دیکھ کر اس کو جوش آ گیا۔ لیکن پھر سنبھلا اور کہا "ٹھیرو۔ میں پہلے یہ پوچھ لوں کہ والد کی مرضی سے یہ سب کچھ ہو رہا ہے۔ یا اس میں کسی اور کا اشارہ ہے۔" اس کا جواب ایک پردہ کے پیچھے سے ملا کہ "یہ میرا حکم ہے!" یہ سننا تھا کہ مصطفےٰ پاشا نے گردن جھکا لی۔ باہر فوج "مصطفےٰ پاشا جوق یشا" کے نعرے مار رہی تھی اور اندر سات حبشی اس فرمانبردار بیٹے کی گردن دبا کر ہمیشہ کے لئے اس کو خاموش کر رہے تھے۔ باپ کا حکم سننے کے بعد اس ناکردہ گناہ نے اپنے بچانے کی ذرا کوشش نہ کی اور تھوڑی دیر میں اس کی لاش اس تخت پر لٹا دی گئی جس پہ اُسے ایک دن

بیٹھتا تھا۔ یہ حبشی اپنے کام سے فارغ ہوکر پردوں کی آڑ میں ہوئے ہی تھے کہ شاہزادہ جہانگیر خیمہ کے اندر آیا۔ اس کو مصطفیٰ پاشا سے عشق تھا۔ کیا دیکھتا ہے کہ بھائی کی نعش تخت پر پڑی ہے۔ دیوانہ وار نعش سے لپٹ گیا۔ اور وہیں بھائی کی پیشانی کو بوسہ دیتے دیتے خود اپنی جان دے دی۔ یہ دونوں مر گئے۔ لیکن ایک دنیا کو یہ سبق دے گیا کہ فرمانبردار بیٹے ایسے ہوتے ہیں۔ اور دوسرا بتا گیا کہ سوتیلے بھائیوں میں بھی ایسی محبت ہوسکتی ہے۔ جو سگے بھائیوں میں بھی ہونا مشکل ہے۔

بارے دنیا میں رہو غمزدہ یا شاد رہو
ایسا کچھ کر کے چلو یاں کہ بہت یاد رہو

ایک وصیّت کی تعمیل

خدا بخشے۔ مولوی وحید الدین "سلیم" بھی ایک عجیب چیز تھے۔ ایک نگینہ سمجھئے کہ برسوں ناتراشیدہ رہا۔ جب تراشا گیا۔ پھل نکلے۔ چمک بڑھی۔ اہل نظر میں قدر ہوئی۔ اُس وقت چٹ سے ٹوٹ گیا۔ شہرت بھی "غالب" کے قصیدے کی طرح آج کل کسی کو راس نہیں آتی۔ اِدھر نام بڑھا اور اُدھر مرا۔ صف سے آگے نکلا اور تیر قضا کا نشانہ ہوا۔ اجل چلاؤ کا زور ہے۔ آج یہ گیا، کل وہ گیا۔ مولوی نذیر احمد گئے، شبلی گئے، حالی گئے، وحید الدین گئے۔ اب بڑوں میں مولوی عبدالحق رہ گئے ہیں اُن کو بھی شہرت کی ریہ لگ گئی ہے۔ سوکھے چلے جا رہے ہیں کسی دن یہ بھی خشک ہو کر رہ جائیں گے۔ یہ تو جو کچھ تھا، سو تھا، ایک نئی بات یہ ہے کہ آج کل کا مرنا بھی کچھ عجب مرنا ہو گیا ہے۔ پہلے زندگی کو چراغ سے تشبیہ دیتے تھے، بتی جلتی، تیل خرچ ہوتا، تیل ختم ہونے کے بعد چراغ جھلملاتا، ٹمٹماتا، لَو بیٹھنی شروع ہوتی اور آخر رفتہ رفتہ ٹھنڈا ہو جاتا۔ اب چراغ کی جگہ زندگی، بجلی کا لیمپ ہو گئی ہے۔ ادھر بٹن دبا، اُدھر اندھیرا گھپ۔ عظمت اللہ خاں، اسی طرح مرے، مولوی وحید الدین اسی طرح رخصت ہوئے۔ اب دیکھیں کس کی باری ہے۔ اُردو کی مجلس میں دو چار لیمپ جل رہے ہیں۔ وہ بھی کسی وقت، کھٹ سے گُل ہو جائیں گے، اس کے بعد بس اللہ ہی اللہ ہے۔

میں مدت سے حیدرآباد میں ہوں۔ مولوی وحیدالدین بھی برسوں سے یہاں تھے۔ لیکن کبھی ملنا نہیں ہوا۔ انھیں ملنے سے فرصت نہ تھی۔ مجھے ملنے کی فرصت نہ تھی، آخر ملے تو کب ملے کہ مولوی صاحب مرنے کو تیار بیٹھے تھے۔ گزشتہ سال کالج کے جلسہ میں مولوی عبدالحق صاحب نے مجھے اورنگ آباد کھینچ بلایا۔ روانہ ہونے کے لئے جو حیدرآباد کے اسٹیشن پر پہنچا، تو کیا دیکھتا ہوں کہ اسٹیشن کا اسٹیشن اورنگ آباد جانے والوں سے بھرا پڑا ہے۔ طالب علم بھی ہیں ماسٹر بھی ہیں۔ کچھ ضرورت سے جارہے ہیں، کچھ بے ضرورت چلے جارہے ہیں۔ کچھ واقعی مہمان ہیں، کچھ بن بلائے مہمان ہیں۔ غرض یہ کہ آدھی ریل انھی اورنگ آباد کے مسافروں نے گھیر رکھی ہے۔ ریل کی روانگی میں دیر تھی سب کے سب پلیٹ فارم پر کھڑے گپیں مار رہے تھے میں بھی ایک صاحب سے کھڑا باتیں کررہا تھا کہ کیا دیکھتا ہوں کہ ایک بڑے میاں بھیڑ کو چیرتے پھاڑتے، بڑے بڑے ڈگ بھرتے، میری طرف چلے آرہے ہیں۔ متوسط قد، بھاری گٹھیلا بدن بڑی سی توند، کالی سی سیاہ فام رنگت، اس پہ سفید چھوٹی سی گول ڈاڑھی چھوٹی چھوٹی کرنجی آنکھیں، شرعی سفید پائجامہ، کتھئی رنگ کے کشمیرے کی شیروانی، سر پر عنابی ترکی ٹوپی، پاؤں میں جرابیں اور انگریزی جوتہ۔ آئے اور آتے ہی مجھے گلے لگالیا۔ حیران تھا کہ یا الٰہی کیا ماجرا ہے۔ کیا امیر حبیب اللہ خاں اور مولوی نذیر احمد مرحوم کی ملاقات کا دوسرا اسین ہونے والا ہے۔ جب اُن کی اور میری ہڈیاں پسلیاں گلے ملتے ملتے تھک کر چور ہوگئیں۔ اُس وقت اُنھوں نے فرمایا "میاں فرحت! مجھے تم سے ملنے کا بڑا شوق تھا۔ جب سے تمھارا نذیر احمد والا مضمون دیکھا ہے۔ کئی

دفعہ ارادہ کیا کہ گھر پر آکر ملوں۔ مگر موقع نہ ملا۔ قسمت میں ملنا تو آج لکھا تھا بھئی! مجھے نذیر احمد کی قسمت پر رشک آتا ہے کہ تجھ جیسا شاگرد اس کو ملا، مرنے کے بعد بھی اُن کا نام زندہ کر دیا، افسوس ہے ہم کو کوئی ایسا شاگرد نہیں ملتا جو مرنے کے بعد اسی رنگ میں ہمارا حال بھی لکھتا" میں پریشان تھا کہ یا اللہ یہ ہیں کون اور کیا کہہ رہے ہیں۔ مگر میری زبان کب رُکتی ہے میں نے کہا" مولوی صاحب! آپ گھبراتے کیوں ہیں بسم اللہ کیجئے، مر جائیے، مضمون میں لکھ دوں گا" کیا خبر تھی کہ سال بھر کے اندر ہی اندر مولوی صاحب مر جائیں گے اور مجھے ان کی وصیت کو پورا کرنا پڑے گا۔ جب مجھے معلوم ہوا کہ یہ مولوی وحید الدین سلیم ہیں تو واقعی مجھے بہت پشیمانی ہوئی۔ میں نے معذرت کی، وہ خود شگفتہ طبیعت لے کر آئے تھے، رنج تو کجا بڑی دیر تک ہنستے اور اس جملے کے مزے لیتے رہے۔ سر ہو گئے کہ جس گاڑی میں تو ہے۔ میں بھی اُسی میں بیٹھوں گا۔ شاگردوں کی طرف دیکھا۔ انھوں نے ان کا سامان لا، میرے درجے میں رکھ دیا۔ ادھر ریل چلی، اور اُدھر ان کی زبان چلی رات کے بارہ بجے، ایک بجا، دو بج گئے، مولوی صاحب نہ خود سوتے ہیں اور نہ سونے دیتے ہیں، درجہ اول میں ہم تین آدمی تھے۔ مولوی صاحب، اور رفیق بیگ۔ رفیق بیگ تو سو گئے ہم دونوں نے باتوں میں صبح کر دی۔ اپنی زندگی کے حالات بیان کئے، اپنے علمی کارناموں کا ذکر چھیڑا، اصلاحات زبان اُردو پر بحث ہوتی رہی، شعر و شاعری ہوئی، دوسروں کی خوب خوب برائیاں ہوئیں، اپنی تعریفیں ہوئیں مولوی عبد الحق کو بُرا بھلا کہا کہ اس بیماری میں مجھے زبردستی کھینچ بلایا

غرض چند گھنٹے بڑے مزے سے گذر گئے۔ صبح ہوتے ہوتے کہیں جاکر آنکھ لگی۔ شاید ہی گھنٹہ بھر سوئے ہوں گے کہ ان کے شاگردوں اور ساتھیوں نے گاڑی پر یورش کردی۔ پھر اُٹھ بیٹھے اور پھر وہی علمی مباحث شروع ہوئے، پھبتیاں اُڑیں، اُس کو بے وقوف بنایا، اس کی تعریف کی ہنسی اور قہقہوں کا وہ زور تھا کہ درجہ کی چھت اُڑی جاتی تھی۔ تھوڑی دیر کے بعد مجھ کو نواب مسعود جنگ اپنے پاس لے گئے اور یہاں اورنگ آباد تک وہی غل غپاڑہ رہا۔

میں شاعر نہیں ہوں، ہاں بعض دوستوں کی فرمائش سے زبردستی شعر کہتا ہوں، مجھے بڑا تعجب ہوا، جب مولوی صاحب نے کہا "فرحت تو شاعر ہے، کیوں اس جوہر کو خاک میں ملا رہا ہے، ہو سکے تو کچھ کہہ لیا کرو" میرے ایک قطعہ تاریخ سے ایسے خوش ہوئے کہ اُسی وقت اُٹھ قلم دوات نکال وہ قطعہ لکھ لیا، آپ بھی سُن لیجئے، کہتے ہیں نئی طرز کی تاریخ ہے، ہوگی۔ ہم کو تو نہ اس کے لکھنے میں دماغ سوزی کرنی پڑی اور نہ اس کی قدر ہے، ہاں قطعے سے پہلے اس کی شان نزول سُن لیجئے واقعہ یہ ہے کہ میرے ایک نہایت عزیز دوست کے دماغ میں یورپ جانے کے خیالات ہمیشہ چکر لگاتے تھے، پیسہ پاس نہیں تھا، مگر چاہتے تھے کہ ساری دنیا میں پھریں اور وہ بھی اس طرح نہیں جس طرح امریکہ والے پھرتے ہیں، بلکہ اس طرح جیسے پہلے زمانے کے سیّاح پھرتے تھے۔ ادھر کوشش کی آخر سرکار سے منظوری ہو ہی گئی ڈھائی تین برس میں سارا یورپ چھان مارا۔ شمالی افریقہ کے سب ملک دیکھ لئے۔ عراق، عرب، شام، ٹرکی غرض سیکڑوں ملکوں کی سیر کی۔

آئے اور بڑی دھوم سے آئے۔ وہ نام پیدا کیا کہ خدا سب کو نصیب کرے۔ دوستوں نے مجھ سے تاریخ کہنے کا تقاضہ کیا۔ مار مار کر شاعر بنایا تاریخ ہوئی ہے:-

پھر پھرا کر مرے اک دوست سفر سے آئے
دوستوں کا ہے تقاضا کہ لکھو جلد لکھو
میرے انکار سے احباب نہ رنجیدہ ہوں
ایک طائر کو قفس میں تھا خیال گلشن
رحم کچھ آگیا صیاد کے دل میں شاید
در کھلا پایا تو آہستہ سے طائر نکلا
خوب دل بھر کے مزے زمزمہ سنجی کے لئے
بچا وہ گردش افلاک سے آخر کب تک
آب و دانہ اُسے پھر کھینچ کے لایا سوئے دام
لکھی "فرحت" نے ہے کس زور سے فصلی تاریخ

۲۱۳

بار تاریخ کا ڈالا گیا میرے سر پر
میں بھی شاعر ہوا، اللہ کی قدرت ہے مگر
اس لئے لکھتا ہوں تاریخ، بہت ڈر ڈر کر
پر سمیٹے ہوئے بیٹھا تھا جھکائے ہوئے سر
ہٹ گیا سامنے سے ایک طرف کھول کے پر
پھر چلا تیر سا گلشن کی طرف مار کے پر
خوب دل کھول کے باغوں میں لگائے چکر
ہوتا کب تک نہ زمانے کے تغیر کا اثر
باندھے صیاد نے پھر[1] طائر آزاد کے پر
پھر وہی کنج قفس پھر وہی صیاد کا گھر

۱۱۲۰

میں نے باتوں باتوں میں یہ بھی کوشش کی کہ مولوی صاحب کی طبیعت کا اندازہ لگاؤں پہلے تو ذرا بند بند رہے۔ لیکن آخر میں کھل گئے میں نے جو رائے ان کے متعلق قائم کی ہے وہ سن لیجئے سب سے پہلے تو یہ ہے کہ اُن میں ظرافت کا مادہ بہت تھا لیکن یہ ظرافت اکثر رکاکت کی صورت اختیار کر لیتی تھی۔ کسی کو بُرا بھی کہتے تو ایسے الفاظ

---

[1] "پھر" کی جگہ "اور" رکھا جائے تو مادہ تاریخ پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔

میں کہتے کہ سُننے سے تکلیف ہوتی اور جب کہنے پر آتے تو پھر یہ نہ دیکھتے کہ میں کیا کہہ رہا ہوں اور کس کے سامنے کہہ رہا ہوں، نتیجہ اکثر یہ ہوتا کہ لوگ اِدھر سے اُدھر لگا دیتے اور مولوی صاحب کی کسی نہ کسی سے بگڑ جاتی۔ شاید ہی کوئی بھلا آدمی ہوگا جو سچے دل سے اُن کو چاہتا ہو ان کے علم، ان کی سمجھ، ان کی زود فہمی اور ان کی طبع رسا کی سب تعریف کرتے ہیں۔ لیکن ان کی طبیعت کے سب شاکی ہیں۔ اور وہ خود بھی اس سے بیزار تھے۔ بات یہ ہے کہ انھوں نے زمانے کی وہ ٹھوکریں اُٹھائی تھیں کہ خدا کی پناہ۔ خاصا بھلا چنگا آدمی دیوانہ ہو جائے۔ اگر مولوی صاحب کی طبیعت پر ان مصیبتوں نے اتنا اثر کیا تو کیا تعجب ہے۔ جب کسی نا اہل کو بڑی خدمت پر دیکھتے تو اُن کے آگ لگ جاتی۔ ریل میں دو ایک بڑے شخصوں کا ذکر آیا۔ انھوں نے ہر دفعہ یہی کہا" ارے میاں گدھا ہے، ایک سطر صحیح نہیں لکھتا۔ اور دیکھو تو کون ہیں کہ نواب صاحب، ہم کو دیکھو تمام عمر علم حاصل کرنے میں گزار دی۔ اس اخبار کی ادیٹری کی، اُس رسالہ کے منیجر ہوئے، سر سید کی خدمت میں سر گاڑی پاؤں پھیہ کیا، اب جو چند روٹی مل رہے ہیں، تو فلاں صاحب جلے جاتے ہیں، خبر نہیں کچھ ہوتے گلا ہی گھونٹ دیتے۔" میں نے کہا "مولوی صاحب! یہ دنیا ہے آخرت نہیں ہے کہ جیسا بوؤ گے ویسا پھل ملے گا۔ یہاں اہل کمال ہمیشہ آشفتہ حال رہے ہیں۔ آپ کیوں خواہ مخواہ اپنا دل جلاتے ہیں، جو اللہ نے دیا ہے، بہت ہے۔" "آگے ناتھ نہ پیچھے پگا" مزے کیجئے۔ بہت گئی ہے، تھوڑی رہی ہے۔ ہنسی خوشی یہ بھی گزار دیجئے۔" وہ بھلا میری

باتوں کو گیا سننے والے تھے۔ اُن کے تو دل میں زخم تھے۔ تمام عمر مصیبت اُٹھائی تھی، نااہلوں کو آرام و آسائش میں دیکھ کر وہ زخم ہرے ہو جاتے تھے۔ زبان اپنی تھی، کسی کا دینا نہیں آتا تھا۔ بے نقط سنا کر دل ٹھنڈا کر لیتے تھے۔

زمانے کے ہاتھوں ان کی طبیعت میں ایک دوسرا انقلاب یہ بھی ہو گیا تھا کہ جتنی ان کی نگاہ وسیع ہوئی، اتنا ہی ان کا دل تنگ ہوا، جتنی ان کے قلم میں روانی پیدا ہوئی، اتنی ہی ان کی مٹھی بند ہوئی۔ میں ان کے پیٹھ پیچھے نہیں کہتا، جب ان کے منہ پر کہہ چکا ہوں کہ مولوی صاحب، آپ کی کفایت شعاری نے بڑھتے بڑھتے کنجوسی کی شکل اختیار کر لی ہے، تو اب لکھتے کیوں ڈروں واقعی بڑے ہی کنجوس تھے۔ ہزار روپے کے گریڈ میں تھے۔ دارالترجمہ سے بہت کچھ مل جاتا تھا۔ مگر خرچ کی پوچھو تو صفر سے کچھ ہی زیادہ ہو گا۔ اس کی صراحت میں آگے چل کر کروں گا۔ ہاں ان کا یہ عذر سب کو ماننا پڑے گا کہ مفلسی کے پے در پے حملوں نے ان کی آنکھیں کھول دی تھیں۔ ان کو یہ بھی معلوم نہ تھا کہ وہ اس خدمت پر کب تک ہیں اور کب نکال دیئے جائیں گے۔ خشک سالی کے اندیشے سے ارزانی کے زمانے میں کھتے بھرنے کی فکر میں رہے خود چل بسے اور جمع پونجی دوسروں کے لئے چھوڑ گئے۔ اور چھوڑ بھی اتنی گئے کہ بعض لوگوں کو افسوس ہوا کہ ہم ان کے بیٹے کیوں نہ ہوئے۔

بہرحال یونہی ہنستے، بولتے دو بجے اورنگ آباد پہنچ گئے۔ بڑے زور

کا استقبال ہوا۔ موٹروں میں لدکر اورنگ آباد کالج پہنچے۔ کیا دیکھتے ہیں کہ یہاں سے وہاں تک خیمے ہی خیمے لگے ہیں۔ خیموں کے سامنے جلسہ کا منڈوا ہے۔ منڈوے کے سامنے جو خیمہ تھا اس میں مجھے اور مولوی صاحب کو جگہ ملی۔ مولوی صاحب کی طبیعت پہلے سے بدمزہ تھی۔ راستہ کی تکان اور رات بھر کے جاگنے سے اور خراب ہوگئی۔ بخار چڑھ آیا۔ دو وقت کھانا نہیں کھایا۔ تیسرے وقت بڑے کہنے سننے سے تھوڑا سا دودھ پیا۔ دوسرے روز اُن کا لکچر تھا۔ طبیعت صاف نہیں تھی۔ پھر بھی بڑے میاں کو جوش آگیا۔ ٹرنک میں سے جوڑا نکالا، ریشمی شیروانی نکالی، نئی ترکی ٹوپی نکالی، اپنا میلا کچیلا جوڑا پھینک نیا پہن اس ٹھاٹھ سے جلسے میں آئے کہ واہ واہ واہ۔ کھڑے ہو کر لکچر دینے کا دم نہ تھا۔ اسٹیج پر کرسی بچھا دی گئی۔ انھوں نے جیب میں سے چھوٹے چھوٹے نیلے کاغذ کے پرچوں کی ایک گڈی نکالی اور لکچر پڑھنا شروع کیا۔ میں ہمیشہ سے یہ سمجھتا تھا کہ اسپیچ کے پڑھنے میں الفاظ کا زور کم ہو جاتا ہے۔ مگر مولوی صاحب کے طرز ادا نے میرا خیال بالکل بدل دیا۔ ان کے پڑھنے میں بھی وہی بلکہ اس سے زیادہ زور تھا، جتنا بولنے میں ہوتا ہے۔ معلوم ہوتا تھا کہ شیر گرج رہا ہے۔ تقریباً دو ہزار آدمی کا مجمع تھا مگر سناٹے کا یہ عالم تھا کہ سوئی گرے تو آواز سن لو۔ لفظوں کی نشست، زبان کی روانی، آواز کے اُتار چڑھاؤ سے یہ معلوم ہوتا تھا کہ ایک دریا ہے کہ اُمڈا چلا آرہا ہے۔ یا ایک برقی رو ہے کہ کانوں سے گذر کر دل و دماغ پر اثر کر رہی ہے۔ برس روز ہو چکا ہے۔ مگر اب تک وہ

آواز میرے کانوں میں گونج رہی ہے۔ میں نے بڑے بڑے لکچر دینے والوں کو سنا ہے مگر میں یقین دلاتا ہوں کہ لکچر پڑھ کر ایسا اثر پیدا کرنے والا میری نظر سے کوئی نہیں گزرا۔ کچھ تو بات تھی کہ آخر زمانے میں سرسید مرحوم اپنے اکثر لکچر انھیں سے پڑھوایا کرتے تھے۔ یا تو یہ لکچر پڑھتے پڑھتے یہ خود منجھ گئے تھے یا یہ ان کی خداداد قابلیت تھی جس کو دیکھ کر سرسید مرحوم نے اس کام کے لئے ان کا انتخاب کیا تھا۔ غرض کچھ ہی ہو، اس میں ان کا مدمقابل نایاب نہیں تو کمیاب ضرور ہے۔

اسی روز ایک واقعہ ایسا پیش آیا کہ اُس کا خیال کر کے اب تک مجھے ہنسی آتی ہے۔ "۱۲۶۱ھ میں دہلی کا ایک مشاعرہ" اُس جلسے میں زندہ کیا گیا تھا۔ وہی ساز و سامان وہی کپڑے اور وہی لوگ، سو برس کے بعد پھر سامنے لائے گئے تھے۔ اسٹیج کے انتظام ہی کے لئے مولوی عبدالحق صاحب نے مجھے پکڑ بلایا تھا۔ پہلے بہروپ اور نقلیں ہوتی رہیں۔ آخر پردہ گرا اور مشاعرے کا نمبر آیا۔ تھوڑی دیر میں اسٹیج کا رنگ بدلنا کچھ آسان کام نہ تھا۔ دریاں، چاندنیاں، قالین بچھانا، گاؤ تکئے لگانا، سامان جمانا، مشعلیں جلانا، غرض اتنا کام تھا کہ پردہ گرے گرے بڑی دیر ہوگئی۔ اور لوگوں میں ذرا ہل چل ہونے لگی۔ مجھے اس وقت سوا، اس کے اور کچھ نہ سوجھا کہ ایک چھوٹی سی تقریر کر کے اس بےچینی کو کم کروں، میں نے کہا "یارو! ذرا جلدی کرو۔ دیر ہو رہی ہے مزا کرکرا ہو جائے گا۔ میں باہر جا کر کچھ بولنا شروع کرتا ہوں، تمھارا کام جب ختم ہو جائے تو سیٹی بجا دینا۔ میں اپنی اسپیچ ختم کر دوں گا۔" اتنا کہہ میں چٹ باہر پردے کے سامنے آگیا۔ مضمون سوچنے کا موقعہ نہیں ملا تھا،

اُس وقت یہی سمجھ میں آیا کہ اپنے مضمون کی تمہید کو ذرا مذاق میں ادا کردوں۔ جن صاحبوں نے وہ مضمون پڑھا ہے، وہ واقف ہیں کہ میں نے اس مضمون کو مولوی کریم الدین صاحب مؤلف "طبقات شعراء ہند" سے منسوب کرکے یہ ظاہر کیا ہے کہ یہ مشاعرہ ان ہی کے مکان پر نواب زین العابدین خاں کی مدد سے ہوا تھا۔ چنانچہ میں نے اپنے لکچر میں ابتدائ اس زمانے کی دہلی کا نقشہ کھینچا اور پھر مولوی کریم الدین صاحب کا پانی پت سے دہلی آنا مذاقیہ پیرایہ میں بیان کیا۔ اُن کی پھٹی ہوئی جوتیوں اُن کے خاک آلودہ کپڑوں، اُن کی وحشت زدہ شکل اور ان کی مفلسی کا نقشہ خدا جانے کن کن الفاظ میں کھنچ گیا۔ پھر اِن کے دہلی میں آکر تعلیم پانے، مسجد کی روٹیوں پر پڑے رہنے، دوسروں کی مدد سے مطبع کھولنے کا ذکر کرکے یہ بتایا کہ آخر کس طرح اس مشاعرے کی اجازت ہوئی اور کس طرح دہلی کے تمام شعرا اس میں جمع ہوئے۔ میں اسپیچ دینے میں سیدھا کھڑا نہیں رہتا، کچھ ہاتھ پاؤں بھی ہلاتا ہوں۔ خدا معلوم مولوی کریم الدین کا حال بیان کرنے میں کیوں میرے ہاتھ کا اشارہ کئی دفعہ مولوی وحیدالدین سلیم کی طرف ہوگیا۔ مجھے تو معلوم نہیں، مگر جلسے میں اس نے کچھ اور ہی معنے پیدا کرلئے۔ مولوی صاحب کے والد بھی پانی پت سے دہلی آئے تھے کتابوں کا بیوپار کرتے تھے۔ لوگ سمجھے کہ مولوی کریم الدین ہی مولوی وحیدالدین کے والد تھے۔ ناموں کے یکساں ہونے نے اس خیال کو اور تقویت دی۔ اب جو ہے وہ مولوی صاحب سے پوچھتا ہے "مولوی صاحب! کیا مولوی کریم الدین صاحب آپ کے والد تھے؟" مولوی صاحب کے تاؤ کی کچھ نہ پوچھو، دل ہی دل میں اونٹتے رہے۔ خدا خدا کرکے

ڈیڑھ بجے مشاعرہ ختم ہوا۔ اسٹیج کے دروازے سے جو نکلتا ہوں تو کیا دیکھتا ہوں کہ مولوی صاحب دیوار سے چپکے کھڑے ہیں، مجھے دیکھتے ہی بپھر گئے۔ کہنے لگے "فرحت! یہ سب تیری شرارت ہے۔ کریم الدین کو میرا باپ بنا دیا۔" میری کچھ سمجھ میں نہیں آیا کہ آخر یہ کہہ کیا رہے ہیں۔ بڑی مشکل سے مولوی صاحب کو ٹھنڈا کیا۔ وہاں سے لے جاکر خیمے میں بٹھایا۔ پان بنا کر دیا۔ سگریٹ پیش کیا، جب جاکر ذرا نرم پڑے، اور واقعہ بیان کیا۔ میں نے کہا "مولوی صاحب! بھلا مجھ سے ایسی گستاخی ہو سکتی تھی۔ اول تو اس مذاق کا یہ موقعہ ہی کیا تھا۔ دوسرے مجھے کیا معلوم کہ آپ کے والد کون تھے، کہاں کے تھے۔ دہلی آئے بھی تھے یا نہیں کتابیں بیچتے تھے یا کیا کرتے تھے۔" کہنے لگے "تو گھڑی گھڑی، ہاتھ سے میری طرف کیوں اشارہ کرتا تھا" میں نے کہا "مولوی صاحب! اسپیچ دینے میں ہاتھ کا اشارہ خود بخود اسی طرح ہو جاتا ہے۔ اب اگر اگلی صف میں بیٹھ کر آپ اس اشارے کو اپنے سے متعلق کرلیں تو اس میں میرا کیا قصور ہے۔" بہر حال یہ بات لوگوں کے دلوں میں کچھ ایسی جم گئی کہ مٹائے نہ مٹی۔ جب تک اورنگ آباد میں رہے، ہر شخص مولوی صاحب سے یہی سوال کرتا تھا "مولوی صاحب! کیا مولوی کریم الدین صاحب آپ کے والد تھے؟" یہ کبھی تو ہنس کر چپ ہو جاتے تھے۔ کبھی صرف جھڑک دیتے، کبھی جل کر کہتے "جی ہاں میرے والد تھے کچھ آپ کا دینا آتا ہے؟"

اورنگ آباد سے واپس آنے کے بعد میرا اُن کے ہاں آنا جانا بہت ہو گیا تھا۔ جب کچھ لکھتا، پہلے اُن کو جاکر سناتا۔ بڑے خوش ہوتے، تعریفیں کرتے، دل بڑھاتے، ہائے، ان کے گھر کا نقشہ اس وقت آنکھوں میں پھر گیا

گھر بہت بڑا تھا، مگر خالی ڈھنڈار۔ ساٹھ روپے مہینہ کرایہ دیتے اور اپنی اکیلی جان سے رہتے۔ نہ بال نہ بچہ نہ نوکر نہ ماما۔ میں گیا، باہر کا دروازہ کھٹکھٹایا۔ آواز آئی کون؟ میں نے کہا "فرحت"۔ اسی وقت کرتہ پہنتے ہوئے آئے، دروازہ کھولا، اندر لے گئے۔ برآمدے میں ایک بان کی چارپائی پڑی ہے، دو تین تختے جڑی ٹوٹی پھوٹی کرسیاں ہیں۔ اندر ایک ذرا سی دری بچھی ہے، اس پر میلی چاندنی ہے۔ دو چار چوہا چکٹ تکیے اور ایک سڑی ہوئی رضائی رکھی ہے۔ دیواروں پر ایک دو سگریٹ کے اشتہاروں کی تصویریں اور تین چار پرانے کیلنڈر لٹکے ہیں۔ سامنے دیوار کی الماری میں پانچ چھ کنڈا ٹوٹی چائے کی پیالیاں، کنارے جھڑی رکابیاں ایک دو چار کے ڈبے رکھے ہیں۔ سامنے کے کمرے میں کھونٹیوں پر دو تین شیروانیاں دو تین ٹوپیاں لٹک رہی ہیں۔ نیچے دو تین پرانے کھڑنک جوتوں کے جوڑے پڑے ہیں۔ لیجئے، مولوی صاحب کے گھر بار کا یہ خلاصہ ہے۔ مولوی صاحب بیٹھے ہیں۔ سامنے دو انگیٹھیاں رکھی ہیں۔ ایک پر پانی، دوسری پر دودھ جوش ہو رہا ہے۔ چائے بن رہی ہے، خود پی رہے ہیں، دوسروں کو پلا رہے ہیں۔ ایک نمک کا ڈلا پاس رکھا ہے چائے بنائی، نمک کے ڈلے کو ڈال، دو ایک چکر دے نکال لیا۔ بس سارے دن ان کا یہی شغل تھا گھر میں برتن ہی نہیں تھے، کھانا کیسے پکتا اور پکاتا۔ خبر نہیں کہاں جا کر کھا پی آتے تھے، کبھی میں گیا، دیکھا کہ دروازے میں یہ بڑا قفل لٹک رہا ہے، سمجھ گیا کہ مولوی صاحب کہیں چرنے چگنے تشریف لے گئے۔ میں نے کئی دفعہ پوچھا بھی کہ مولوی صاحب! آپ کے ہاں کچھ پکتا پکاتا نہیں کہنے لگے

نہیں، بھئی! میں نے تو مدتوں سے کھانا چھوڑ دیا ہے۔ صرف چائے پر گزران ہے۔" تم مان لو، میں تو نہیں مانتا، میں نے خود اپنی آنکھوں سے ان کو کھاتے اور خوب کھاتے دیکھا ہے۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ اپنے گھر کا پکا نہیں کھاتے تھے اور کھاتے تو کیونکر کھاتے، پکانے کا انتظام کرنا کوئی آسان کام نہیں تھا۔ ماما رکھنی پڑتی۔ سامان منگوانا ہوتا۔ لکڑی کا خرچ، تیل کا خرچ، نون کا خرچ۔ غرض اتنے خرچ کون اپنے سر باندھے اور اپنی بھلی چنگی جان کو بیٹھے بٹھائے روگ لگائے۔ چائے بنائی پی لی۔ اِدھر اُدھر گئے، پیٹ بھر لیا۔ گھر آئے، بان کی کھُری چارپائی پر لوٹ ماری۔ چلو زندگی کا ایک دن کٹ گیا۔ ان کی بان کی چارپائی بھی نمائش میں رکھنے کے قابل تھی۔ ننگی بیٹھ اس پر اتنا لوٹتے تھے کہ بان صاف اور چمکدار ہو کر کالی اطلس ہو گیا تھا، ادوان خود کھینچتے تھے اور ایسی کھینچتے تھے کہ ہاتھ مارو تو طبلے کی آواز دے۔ خدا معلوم اب یہ چارپائی کس کے قبضہ میں ہے۔ کسی کے پاس بھی ہو، سونے میں بڑا آرام دے گی۔

مولوی صاحب کو مٹھاس کا بڑا شوق تھا۔ خدا شکر خورے کو شکر دیتا ہے۔ ان کے بھی یار، دوست، شاگرد غرض کوئی نہ کوئی ان کو مٹھائی پہنچا ہی دیتا تھا۔ یہ کچھ کھاتے، کچھ رکھ چھوڑتے۔ مٹھائی کی ٹوکریوں میں جو کاغذ آتے، ان کو پونچھ پانچھ، صاف کر جمع کرتے جاتے، انھی کاغذوں پر خط لکھتے۔ غزلیں لکھتے غرض جو کچھ لکھنا پڑھنا ہوتا بس انھیں کاغذوں پر ہوتا۔ خدا معلوم ایسے جھر جھرے کاغذ پر یہ لکھتے کیونکر تھے۔

مولوی صاحب دنیا میں کسی سے نہیں ڈرتے تھے، ہاں ڈرتے تھے

تو مولوی عبدالحق صاحب سے۔ میں نے کئی دفعہ کوشش کی کہ مولوی عبدالحق صاحب کے متعلق ان کی رائے معلوم کروں۔ مگر وہ کسی نہ کسی طرح ٹال گئے۔ تھوڑے دن اور جیتے تو پوچھ ہی لیتا۔ دوسروں کے متعلق مجھے ان کی رائے معلوم ہے۔ اگر ان ہی کے الفاظ میں لکھوں تو ابھی فوجداری ہو جائے۔

مولوی صاحب کو اصطلاحات وضع کرنے کا خاص ملکہ تھا۔ ایسے ایسے الفاظ دماغ سے اُتارتے کہ۔ باید وشاید۔ جہاں ثبوت طلب کیا اور انھوں نے شعر پڑھا۔ اور کسی نہ کسی بڑے شاعر سے منسوب کر دیا۔ اب خدا بہتر جانتا ہے کہ یہ خود ان کا شعر ہوتا تھا یا واقعی اُس شاعر کا۔ بھلا ایک ایک لفظ کے لئے کون دیوان ڈھونڈتا بیٹھے۔ اگر کوئی تلاش بھی کرتا اور وہ شعر دیوان میں نہ ملتا تو یہ کہدینا کیا مشکل تھا کہ یہ غیر مطبوعہ کلام ہے۔ انگریزی بالکل نہیں جانتے تھے مگر انگریزی اصطلاحات پر پورے حاوی تھے۔ یہ ہی نہیں بلکہ یہاں تک جانتے تھے کہ اس لفظ کے کیا ٹکڑے ہیں، ان ٹکڑوں کی اصل کیا ہے، اور اس اصل کے کیا معنی ہیں۔ اس بلا کا حافظہ لے کر آئے تھے کہ ایک دفعہ کوئی لفظ سُنا اور یاد ہو گیا۔ الفاظ کے ساتھ انھوں نے اس پر بھی بہت غور کیا تھا کہ انگریزی میں اصطلاحات بنانے میں کن کن اصولوں کو پیش نظر رکھا گیا ہے، انھیں اصولوں کو وہ اُردو کی اصطلاحات وضع کرنے میں کام میں لاتے اور ہمیشہ کامیاب ہوتے۔ میری کیا اس وقت سب کی یہی رائے ہے کہ اصطلاحات بنانے کے کام میں مولوی وحیدالدین سلیم، اپنا جواب نہیں رکھتے تھے۔ اور اب ان کے بعد

ان کا بدل ملنا دشوار تو کیا ناممکن ہے۔ عربی اور فارسی میں اچھی دسترس تھی۔ مگر وہ اُردو کے لئے بنے تھے، اور اُردو، ان کے لئے۔ خوب سمجھتے تھے اور خوب سمجھاتے تھے۔ زبان کے جو نکات وہ اپنے شاگردوں کو بتا گئے ہیں، اسی کا نتیجہ ہے کہ کالج کے لونڈے وہ مضمون لکھ جاتے ہیں، جو بڑے بڑے اہل قلم کے حاشیۂ خیال میں بھی نہیں آتے۔ مولوی صاحب کیا مرے، زبانِ اُردو کا ایک ستون گر گیا اور ایسا ستون گرا کہ اس جیسا بننا تو کجا، اس حصے میں اڑواڑ بھی لگانی مشکل ہے۔ ان کی جگہ بھرنے کے لئے دوسرے پروفیسر کی تلاش ہو رہی ہے۔ مگر عثمانیہ یونیورسٹی کے ارباب حل وعقد لکھ رکھیں کہ چاہے اس سرے سے اس سرے تک ہندوستان چھان مارو، مولوی وحیدالدین سلیم، جیسا پروفیسر ملنا تو بڑی بات ہے ان کا پاسنگ بھی مل جائے تو غنیمت اور بہت غنیمت سمجھو۔

حکیم آغا جان عیش دہلوی

اگر" خطائے بزرگاں گرفتن خطاست" کے مقولے پر میں بھی عمل کروں تو نہ مجھے اس مضمون پر قلم اُٹھانے کی ضرورت ہو اور نہ آپ کو پڑھنے کی زحمت۔ خدا ہی بہتر جانتا ہے کہ اس مقولہ اور اس خیال نے بعض تاریخی واقعات کو کیا سے کیا کر دیا ہے۔ جہاں کسی ایک بزرگ نے کسی واقعے کے لکھنے میں غلط فہمی، ضرورت یا تعصب سے کوئی غلطی کی یا ردو بدل کیا تو سمجھ لیجیے کہ اب اس غلطی کا ٹھکانا نہیں، وہ ایک نہ ایک دن تاریخ کا جزو ہو کر رہے گی۔ بحث مباحثہ کیجیے۔ ردو قدح کیجیے۔ مگر" خطائے بزرگاں گرفتن خطاست"، کا خیال اس غلطی کو قیامت تک نہ نکلنے دے گا۔ اسکندریہ کے کتب خانے ہی کے واقعے کو دیکھ لو۔ دنیا بھر تسلیم کر چکی ہے کہ عربوں کی فتح مصر سے بہت پہلے یہ کتب خانہ جل چکا تھا۔ مگر جس تاریخ کو اُٹھا کر دیکھو گے یا آئندہ تاریخ لکھی جائے گی اس میں یہی ہوگا کہ عربوں نے اس کو تباہ کیا۔ واقعات سے اورنگ زیب کو بہترین بادشاہ ثابت کر دو، لیکن خافی خاں کو کوئی غلط نہ کہے گا اور تاریخ لکھنے میں ہمیشہ اسی کی پیروی کی جائے گی۔ بات یہ ہے کہ بعض وقت قلم کا زور واقعات کا رُخ اس طرح پھیر دیتا ہے کہ پڑھنے والا جھوٹ کو سچ اور سچ کو جھوٹ مان لیتا ہے۔

اور بعض دفعہ یہ ہوتا ہے کہ ضرورت غلط واقعات کو تسلیم کرنے پر مجبور کرتی ہے۔ مولوی محمد حسین آزاد مرحوم کے زورِ قلم نے سید انشاء کی ایک تصویر دلوں میں قائم کر دی ہے کہ اب کوئی تاریخ اس کو نہیں مٹا سکتی۔ کسی صاحب نے اعتراض کیا تھا کہ جو واقعات انھوں نے سعادت یار خاں رنگین کی کتاب مجالس رنگین کے حوالے سے لکھے ہیں۔ اُن کا ذکر اس کتاب میں کہیں نہیں لیکن کسی نے بھی اس کی پروانہ کی۔ اور بچارے معترض کو خاموشی اختیار کرنی پڑی۔ اب اگر میں یہ کہوں کہ حکیم آغا جان عیش دہلوی کا حال لکھنے میں بھی آزاد مرحوم نے بعض اہم غلطیاں کی ہیں۔ خواہ وہ عمداً ہوں یا سہواً، تو بھلا میری کون سُنے گا۔

آزاد مرحوم نے آبِ حیات لکھ کر زبانِ اُردو پر جو احسان کیا ہے، اس کو نہ ماننا انصاف کا خون کرنا ہے۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ عبارت کے زور اور طبیعت کی روانی میں بعض جگہ واقعات بچ کر کہیں سے کہیں نکل گئے ہیں۔ اور بعض جگہ اُنھوں نے کسی واقعے کو چمکانے کے لئے گرد و پیش کے دوسرے واقعات کو مدھم کر دیا ہے آزاد مرحوم اُستاد ذوق کے عاشق تھے اور کیوں نہ ہوتے، وہ اُن کے اُستاد تھے، بادشاہ کے اُستاد تھے، قلعہ بھر کے اُستاد تھے، ایسے اُستاد کی جتنی بھی تعریف کی جائے وہ تھوڑی ہے۔ لیکن مشکل یہ تھی کہ اس زمانے میں ساری دلی استادوں سے بھری پڑی تھی۔ اُستاد ذوق کو آسمان پر بٹھانا آسان نہ تھا۔ آبِ حیات کی قدر بڑھانے کے لئے ظلمات پیدا کرنا اور آئینے کو چمکانے کے لئے چوکھٹے کی چمک کو

مارنا پڑا۔ اس گھسنے گھسانے میں چوکھٹے کا ایک کونہ ہی توڑ بیٹھے۔ دنیا بھر نے غل مچایا کہ حضرت! بچارے حکیم مومن خاں۔ مومنؔ نے کیا قصور کیا تھا، نہ وہ اس مرقع میں نظر نہیں آتے۔ آپ نے جھٹ اِدھر اُدھر سے ٹکڑا اُڈھونڈھ گوند سے چپکا دیا۔ آزاد نے نواب الٰہی بخش خاں ،معروف، کے دونوں دیوان اُستاد ذوق سے منسوب کردئیے۔ اس کے متعلق نواب احمد سعید خاں ،طالب، دہلوی نے اُن سے پوچھا کہ اُستاد جب ،معروف، کا پہلا دیوان مرتب ہوا ہے، اس وقت ذوق کی عمر (۶) سال کی تھی۔ ذرا یہ تو بتا دیجئے کہ کیا پیدا ہونے سے پہلے اُنھوں نے اس دیوان کو لکھتا یا کم سے کم اصلاح دینی شروع کردی تھی، اس کا جواب ملا۔ ہاں غلطی ہوگئی۔ آئندہ اڈیشن میں درست کردوں گا۔ اس کے بعد خود دیوانے ہوگئے، چلو چھٹی ہوئی ،معروف، کے دونوں دیوان بھی اُستاد کے قبضے میں آگئے، اب رہے بچارے بادشاہ سلامت۔ وہ تو شاگرد ہی تھے، اُن کے متعلق جو کچھ کہو۔ سچ اور درست ہے۔ اس کی تردید کون کرے گا ایک شاگرد نے دوسرے شاگرد کی تمام عمر کی کمائی اُستاد کو دے دی۔ اچھا کیا۔ اُستاد باپ کی جگہ ہوتا ہے شاگرد کا مال اُستاد کا اور اُستاد کا مال تو اُستاد کا ہے ہی۔ میری تو یہ رائے ہے کہ بادشاہ یا امیر کبھی شاعری کریں تو خدا کے لئے کسی کے شاگرد نہ ہوں۔ دنیا کو یہ غلط فہمی ہوگئی ہے کہ بادشاہ اور امیروں میں شعر گوئی کا مادہ نہیں ہوتا۔ اور وہ کچھ لکھ ہی نہیں سکتے۔ سب لکھا پڑھا اُستاد ہی کا ہوتا ہے۔ ظفر کے جیتے جی ذرا دبی دبی آواز میں پہلو بچا کر حکیم آغا جان عیش نے بھی اس کا اظہار

کیا ہے۔ چنانچہ لکھتے ہیں۔

طرز سخن میں ذوق و ظفر دونوں ایک ہیں
شاگرد و اُستاد میں ہوتا ہے فرق پر

غدر ہوا۔ ظفر قید ہوئے۔ جلا وطن ہوئے۔ مر گئے۔ آزاد مرحوم نے ان کے چاروں دیوان اُٹھا اُستاد ذوق کے بستے میں باندھ دیئے اب خدارا کوئی انصاف کرے کہ کیا "طرز سخن میں ذوق و ظفر دونوں ایک ہیں۔" کیا ذوق کے دیوان بھر میں ایک غزل بھی ظفر کے طرز کی نکل سکتی ہے۔ کیا ظفر کے چاروں دیوانوں میں کوئی غزل بھی ایسی ہے جو ذوق کی غزل کہی جا سکے۔ اگر نہیں ہے تو اس کے یہ معنی ہوئے کہ ذوق کے دو علحدہ علحدہ رنگ تھے۔ اور اگر معروف کے کلام کو بھی شریک کر لو، تو گویا تین رنگ تھے۔ اور اُستاد ذوق ان تینوں رنگوں میں ایسے مشاق تھے کہ ایک رنگ کی جھلک تک دوسرے رنگ میں آنے نہیں دیتے تھے۔ آپ مانیں یا نہ مانیں میں تو یہی کہوں گا کہ اصلاح سے اُستاد کا کچھ رنگ شاگرد کے کلام میں پیدا ہو جاتا ہے۔ انشاء اللہ خاں جس کے اُستاد ہوئے اس کے ہاں چہل پیدا کر دی۔ میر صاحب کے جو شاگرد ہوئے، اُن کے ہاں وہی "ہائے ہائے" کا رنگ آگیا۔ پھر آخر یہ کیا بات ہے کہ معروف کا رنگ ظفر کے رنگ سے اور اُن دونوں کا رنگ اُستاد ذوق سے بالکل جدا ہے۔ حالانکہ کہا جاتا ہے کہ دو دیوان معروف کے اور چار دیوان ظفر کے، چھوٹوں کے چھوٹوں بسم اللہ سے لگا کر تمت تک اُستاد ذوق کے لکھے ہوئے ہیں۔ ذوق کی وفات کے بعد کا جو کلام ظفر کا ہے، اُس کے متعلق جواب دہی کرنی خود آزاد مرحوم کو بھی دشوار ہو جاتی۔ وہ تو خدا بھلا کرے مولانا حالی کا

کہ انھوں نے اس بچے بچائے حصہ کو اپنے اُستاد کے لئے سمیٹ کر اس مشکل کو حل کر دیا۔ شاید مولانا حالی سے بھی دریافت کیا جاتا تو وہ نہ بتا سکتے کہ ظفر کی وہ کون کون سی غزلیں تھیں جن کا صرف ایک مصرعہ لکھ کر آیا تھا اور اُن کی تکمیل غالب نے کی تھی۔ غالب مرحوم کی اصلاح سے تو ان کے شاگردوں کی غزلیں اس طرح کی ہو جاتی تھیں۔

میں نے کہا کہ دعوئے اُلفت مگر غلط
کہنے لگے کہ ہاں غلط اور کس قدر غلط

بھلا غالب کی کہی ہوئی یہ غزل ہو سکتی ہے۔

پسِ مرگ میرے مزار پر جو دیا کسی نے جلا دیا
اسے آہ دامنِ باد نے سرِ شام ہی سے بجھا دیا
مجھے دفن کر چکو جس گھڑی تو یہ کہنا اس سے کہ اے پری
وہ جو تیرا عاشقِ زار تھا، تہ خاک اُس کو دبا دیا

بات دراصل یہ ہے کہ ظفر کا نام دنیا سے مٹانا چاہتے تھے سلطنت جا چکی تھی۔ پھر بھی خاندان مغلیہ کی پُرانی محبت لوگوں کے دلوں میں جاگزیں تھی۔ ظفر کا کلام دیکھنے سے دلوں میں جوش آتا تھا کہ ہمارا بادشاہ اگر زمین کا بادشاہ نہ تھا تو کم سے کم زبان کا تو بادشاہ تھا۔ اس نقش کو مٹانا مقصود تھا۔ آزاد مرحوم کے زورِ قلم نے اس منشار کو بھی پورا کر دیا۔ ظفر رنگون میں مر گئے اور اُن کا کلام ان دونوں بزرگوں کے ہاتھوں مر نہیں گیا، تو کم از کم دوسروں کا ضرور ہو گیا۔

بہر حال آزاد مرحوم نے اپنے اُستاد کو خلعت دوام دینے کے لئے بہتوں کے خلعت یا تو اُتار لئے یا پھاڑ چیر کر گدڑی کر دیئے۔ اور اس

غرض کو حاصل کرنے میں کچھ خود محنت لی، کچھ دوسروں کے سر ڈال دی۔ ان کی ذاتی عنایت کا اوپر ذکر آچکا ہے۔ دوسروں کی کارگذاری دیکھنا ہو، تو آب حیات میں حکیم آغا جان عیش اور ہُدہُد کے واقعات دیکھ لو آزاد جانتے تھے کہ اگر ہُدہُد کو غالب اور مومن جیسے لوگوں سے مشاعرے میں لڑا دوں گا، تو دُنیا بھر میں کوئی بھی میری بات ماننے والا نہیں۔ اس لئے انھوں نے یہ کیا کہ ہُدہُد کو حکیم آغا جان عیش کا پٹھو بنا کر میدان میں اُتارا۔ جو جانور ہُدہُد کے مقابلے میں آیا اس کو کسی نہ کسی بڑے شاعر سے منسوب کر دیا۔ اور اس پالی کی ہار جیت سے کچھ نہیں کیا تو کم سے کم ذوق کے برابر والوں کا مذاق اڑا کر ان کی شان میں بٹہ ضرور لگا دیا۔

آزاد مرحوم نے ہُدہُد کو ایک نہایت بے وقوف شخص ظاہر کر کے اس کے کلام کو حکیم آغا جان عیش سے منسوب کیا ہے۔ حکیم صاحب کا سرمایۂ حیات ان کے دو دیوان ہیں۔ اور دونوں کے دونوں اس وقت میرے پاس موجود ہیں۔ میں دعوے سے کہہ سکتا ہوں کہ ان کے کلام اور ہُدہُد کے کلام میں زمین و آسمان کا فرق ہے۔ خوش مذاقی ان کو چھو کر نہیں گئی ہے۔ خدانخواستہ کسی شعر میں مذاق کا پہلو اختیار کیا بھی ہے تو سبحان اللہ، اس لکھنے سے نہ لکھنا ہی بہتر تھا۔ ان کے دونوں دیوانوں میں خوش مذاقی کے صرف چند ہی شعر ہیں۔ وہ سب کے سب لکھے دیتا ہوں۔ آپ خود اُن کے مذاق کو ہُدہُد کی خوش مذاقی سے ملا کر دیکھئے۔ اور انصاف کیجئے کہ ہُدہُد کی چونچ میں حکیم صاحب کا دیا ہوا چونگا ہے، یا وہ یہ آذوقہ کہیں اور سے اُٹھا کر لایا ہے۔ حکیم صاحب

فرماتے ہیں۔

حکیم صاحب کی خوش مذاقی

بیٹھا جب مونڈ منڈا یار کے در پر میں ہوں
کیوں نہ دعویٰ ہو مجھے یہ کہ قلندر میں ہوں

نہ چھوڑی شیخ جی صاحب کے سر پہ
سنا، رندوں نے کل دستار باقی

تم نے سنا بھی ڈھایا ہے رندوں نے کیا ستم
لی شیخ جی کی بزم میں پگڑی اُتار، رات

اسی پگڑی اُتارنے کے مضمون کو ذرا سید انشاء کی زبانی سنئے۔ فرماتے ہیں۔

آتا ہے جی میں شیخ کی پگڑی اُتار دیئے
اور تان کر چٹاخ سے اک دھول ماریئے

حضرت شیخ جی کل شب گروے کیلئے
میکدے میں گئے تسبیح و مصلّٰی لے کر

یہی خیال میر صاحب کا بھی ہے، مگر کیا پاکیزہ رنگ میں ہے۔

تسبیح کو مدتوں سنبھالا ہم نے
خرقہ برسوں گلے میں ڈالا ہم نے
اب آخر عمر میں میسر مئے کی خاطر
سجادہ گرو رکھنے نکالا ہم نے

اور تو اور اُستاد ذوق جیسے روکھے پھیکے آدمی نے اس مضمون میں کچھ تو لطف رکھا ہے۔

میکدے میں کل ہوئی ہے ایک پگڑی گرو مئے
ذوق وہ تیری ہی دستار فضیلت ہو تو ہو

حکیم صاحب کے یہ دو شعر ذرا مزیدار ہیں۔ اور کنائے ہی کنائے میں سب کچھ کہہ گئے ہیں۔

آ گئے رندوں کے گر ہاتھ، تو تم سُن لینا
شیخ صاحب کو بتا دیویں گے آداب کے ڈھنگ

رند کہتے ہیں، کریں گے ان کی خدمت ایک دن
شیخ جی صاحب کو جب شاید نصیحت ہو تو ہو

ایک جاٹ سر پہ چارپائی لئے جا رہا تھا، ایک خاں صاحب بھی اُدھر سے گزرے، ذرا غور سے جاٹ کو دیکھا، مونچھوں پر تاؤ دیا، دماغ پر زور ڈالا اور تمام شاعری کا رس نچوڑ کر جاٹ کو ایک مصرعہ سُنایا ع "جاٹ رے جاٹ ترے سر پر کھاٹ" بھلا جاٹ کیا چوکنے والا تھا فوراً ہی جواب دیا ع "خان رے خان تیرے سر پہ کولھو" خان صاحب کو بہت غصہ آیا اول تو جواب اور اس پہ ایسا بے تکا جواب کڑک کر بولے "ابے نامعقول تُک تو ملا ہی نہیں" جاٹ نے کہا "خاں صاحب تُک ملے نہ ملے بوجھوں تو مرو گے" بس اس نمونے پر حکیم صاحب کے یہ شعر ہیں۔

شیخ کی شکل کسی سے نہیں ملتی لیکن
کچھ مشابہ ہے تو ہے صورت دجال کے ساتھ

جناب شیخ جی صاحب کو رند کہتے ہیں
کہ ان کی ذات جہاں میں ہے صورت خنّاس

کیا مکروہ مضمون ہے اور کیا بُرے الفاظ ہیں۔

عروس ڈھونڈے ہے دنیا کی نت نیا دھگڑا
زیادہ سب سے بُرا ہے یہ اس چھنال میں نقص

ٹکڑے کر کر کے بنائی ہے لنگوٹی اپنی
لو یہ رندوں کو ہوا شیخ کی دستار سے فیض

ذرا ان کے معشوق کی زبان ملاحظہ فرمائیے۔

کل بدل تیوری کہنے لگے مجھ کو چل بے   نام چاہت کا مری لیوے، ہوا تو ایسا

لیجئے یہ ہے حکیم صاحب کے دونوں دیوانوں کی خوش مذاقی کا خلاصہ اس کے بعد بھی اگر آپ آزاد مرحوم کی اس تحریر کو صحیح سمجھیں اور یہ فیصلہ کریں کہ آغا جان عیش ہی ہُد ہُد کو شعر لکھ دیا کرتے تھے اور اس لئے لکھ دیا کرتے تھے۔ کہ اس زمانے کے نامور شعراء پر چوٹ کی جائے تو آپ جانیں اور آپ کا دین ایمان جانے۔

حکیم صاحب کے کلام کی تلاش اور تذکروں میں ان کا ذکر | مجھے حکیم صاحب کے دیوان دیکھنے اور اُن کے حالات معلوم کرنے کا شوق آبحیات نے دلایا۔ ورنہ تذکروں میں ان بچارے کا ذکر بہت کم آیا ہے۔ عبدالغفور "نساخ" نے اپنے تذکرہ "سخن شعراء" میں تحقیق حالات کی انتہا کر دی ہے۔ فرماتے ہیں "عیش تخلص، حکیم آغا جان باشندہ دہلی" اس کے ساتھ تبرکاً چار شعر بھی دیدیئے ہیں۔ "گلشن بیخار" میں تو ان کا نام آنے ہی کیوں لگا۔ مومن کے مدمقابل تھے۔ بھلا "شیفتہ" ان کا ذکر کس طرح کرتے ہاں گلشن بیخار کے توڑ پر قطب الدین "باطن" نے جو گلستان بے خزاں،

لکھی ہے اس میں عیش کے حال میں دو چار سطریں اور ایک شعر لکھدیا ہے عبارت ایسی ہے، کہ اس سے کوئی نتیجہ نکالنا یا حال معلوم کرنا بے سود ہے۔ ہائے کیا خوب فرماتے ہیں۔

"عیش تخلص، حکیم آغا جان نام، حکیم سخن ان کے دربان کا محتاج مدام، طبیب طبع، مریضانِ مضمون کا معالج۔ خواہ کسی کو لقوہ ہو یا فالج یہ نسخہ ہے یہ دوا، حکیم مطلق کے ہاتھ شفا"

دی تاسی کے تذکرۂ شعرائے ہند اور کریم الدین صاحب کے، طبقات شعراء ہند، میں عیش کا نام ہی نہیں ہے۔ البتہ مرزا قادر بخش صابرؔ کی کتاب 'گلستان سخن' میں ان کے بہت سے شعر بھی دیئے ہیں اور ان کے کلام پر ریویو بھی کیا ہے۔

جویندہ یابندہ میں حکیم صاحب کے حالات معلوم کرنے کی اس ادھیڑ بن میں تھا کہ ان کے پرپوتے سے میری ملاقات ہوئی۔ ان کی زبانی معلوم ہوا کہ حکیم صاحب کا دیوان لالہ سری رام صاحب رئیس دہلی مصنف خمخانہ جاوید کے پاس ہے۔ انھوں نے یہ بھی بتایا کہ کس طرح یہ دیوان ان کے خاندان سے نکل کر لالہ صاحب کے پاس پہنچا۔ ان واقعات کے اظہار کی مجھے ضرورت نہیں ہے۔ خدا کا کرنا کیا ہوتا ہے کہ گذشتہ محرم میں مجھے دہلی جانا پڑا، شام کو ریل سے اُترا۔ صبح ہی لالہ صاحب کے پاس پہنچا۔ وہ خود میرا مضمون "۱۲۶۱ھ میں دہلی کا ایک مشاعرہ" دیکھ کر مجھ سے ملنے کے مشتاق تھے۔ بڑی دیر تک اِدھر اُدھر کی باتیں ہوتی رہیں، آخر میں حرف مطلب زبان پر لایا۔ انھوں نے کہا کہ دیوان کی نقل میں نے کرائی تھی وہ کہیں رکھ کر بھول گیا ہوں،

بھجوا دوں گا۔ اس کے بعد میں حیدر آباد چلا آیا۔ انھوں نے وہ نقل میرے پاس بھیجدی۔ دیوان کا آخری حصہ نقل کرنے سے رہ گیا تھا۔ تھوڑے دنوں بعد وہ بھی آگیا، یہ خوشامد نہیں واقعہ ہے کہ اگر کسی کو دہلی کی پرانی صحبت دیکھنی ہے تو لالہ سری رام صاحب سے جاکر ملے۔ جس خلوص اور محبت سے ملتے ہیں اور جس طرح زبان اُردو پر جان دیتے ہیں۔ اس کا لطف کچھ ان سے مل کر ہی آسکتا ہے۔ قلم سے اس کا اظہار نہیں ہوسکتا۔ خیر ایک دیوان تو مجھے لالہ صاحب سے ملا۔ دوسرا دیوان خود حکیم صاحب کی پوتی کے پاس تھا۔ وہ ان سے لیا اور اس طرح حکیم صاحب کا پورا کلام میرے پاس آگیا اب رہے حالات تو وہ خود ان کی پوتی سے زیادہ کون بتا سکتا تھا۔ جب حکیم صاحب کا انتقال ہوا، اس وقت یہ خاصی جوان تھیں۔ اُن کی ایک ایک بات ان کو یاد ہے۔ بہت کچھ حالات ان سے معلوم کئے۔ تھوڑے بہت واقعات کا خود ان کے دیوان سے پتہ چلا۔ غرض یہ معلوم ہوگیا کہ حکیم صاحب کون تھے اور کیا تھے۔

ہاں ایک چیز کا ذکر کر دینا ضروری سمجھتا ہوں۔ جب میں نے آب حیات میں سے حکیم صاحب کا حال ان کی پوتی کو سُنایا تو وہ تعجب سے پوچھنے لگیں، "میاں جنھوں نے یہ کتاب لکھی ہے کیا انھوں نے دادا جان کو دیکھا تھا۔ یا جو جی میں آیا لکھ دیا۔" لیجئے یہ ہے آزاد مرحوم کی تحریر کے متعلق خود حکیم آغا جان عیش کی پوتی کی رائے۔

آب حیات میں حکیم صاحب کے حالات

آب حیات میں حکیم صاحب کے متعلق آزاد مرحوم نے جو کچھ لکھا ہے، اس کو یہاں نقل کئے دیتا ہوں۔ اس کے بعد جو حالات مجھے معلوم ہوئے ہیں وہ لکھوں گا مقابلہ کر کے نتیجہ آپ نکال لیجئے۔

"حکیم آغا جان عیش بادشاہی اور خاندانی طبیب تھے۔ زیور علم اور لباس کمال سے آراستہ۔ صاحب اخلاق۔ خوش مزاج شیریں کلام۔ شگفتہ صورت۔ جب دیکھو یہی معلوم ہوتا تھا کہ مسکرا رہے ہیں۔ ساتھ اس کے شعر کا عشق تھا۔ طبیعت ایسی ظریف، لطیف اور نکتہ سنج پائی تھی کہ جسے شاعری کی جان کہتے ہیں۔ غزل، صفائی کلام۔ شوخی مضامین اور حسن محاورے سے پھولوں کی چھڑی ہوتی تھی۔ اور زبان، گویا لطائف وظرائف کی پھلجڑی۔ میں نے دو دفعہ اُستاد کے ساتھ مشاعرے میں دیکھا تھا۔ ہائے افسوس اس وقت تصویر آنکھوں میں پھر گئی۔ میانہ قد۔ خوش اندام، سر پر ایک ایک انگل بال سفید، ایسی ہی ڈاڑھی۔ اس گورے سرخ و سفید رنگ پر کیا بھلی معلوم ہوتی تھی۔ گلے میں ململ کا کرتہ۔ جیسے چنبیلی کا ڈھیر پڑا ہنس رہا ہے۔ میں ان دنوں دہلی کالج میں پڑھتا تھا، اُستاد مرحوم کے بعد ذوق سخن اور اُن کے کمال کی کشش نے کھینچ کر ان کی خدمت میں پہنچایا۔ اب ان صورتوں کو آنکھیں ترستی ہیں اور نہیں پاتیں ۱۸۵۷ء کے غدر کے چند روز بعد دنیا سے انتقال کیا۔ خدا مغفرت کرے۔

حکیم صاحب کے متعلق میری دریافت حکیم آغا جان 'عیش' کے والد کا نام حکیم عیسیٰ خاں اور دادا کا نام حکیم خواجہ عبدالشکور خاں تھا۔ پشتینی حکیم تھے۔ یہ خاندان، بخارا کی طرف سے آکر کشمیر میں بسا، وہاں سے دہلی آیا۔ ذات کے مغل اور عقیدے کے لحاظ سے سنی المذہب تھے۔ حکیم عیسیٰ خاں کے ایک لڑکی اور دو لڑکے تھے بڑے لڑکے آغا جان تھے اور انھیں کی وجہ سے خاندان کا نام روشن ہوا۔ چنانچہ اب تک انھیں کی وجہ سے دہلی میں چیلوں کے کوچہ میں آغا جان کا چھتہ مشہور ہے۔ ایک منزلہ مکان تھا۔ زنانہ میں دالان در دالان۔ سامنے کے حصے میں دو چھتی۔ بہت بڑا صحن باہر، اکہرا دالان۔ دالان کے سامنے سائبان۔ صحن باہر کا بھی بڑا تھا۔ صحن میں چمن تھا۔ اور درختوں میں اناج پانی کے بھرے ہوئے کونڈے لٹکتے رہتے تھے۔ کبوتروں۔ چڑیوں۔ طوطوں کے غول کے غول اور جھلڑ کے جھلڑ آتے، دانا پانی کھاتے پیتے اور چلے جاتے حکم تھا کہ کسی وقت کونڈا خالی نہ رہے۔

مطب صبح سے بارہ بجے تک مطب کرتے۔ ضرورت ہوئی تو کبھی کبھی شام کو بھی مریضوں کو دیکھ لیتے۔ غریبوں سے بڑی محبت کرتے۔ اسی وجہ سے ان کا مطب ہمیشہ بھرا رہتا تھا۔ خود بھی اس پر فخر کرتے ہیں۔ فرماتے ہیں۔

پا کے صحت، تجھے دیتے ہیں دعا، عیش غریب
دیوے اللہ ترے ہاتھ میں تاثیر سوا

روزی سے بے فکر تھے۔ اس لئے یا تو علاج معالجے میں لگے رہتے

یا شعر شاعری کرتے یا بیٹھے اللہ اللہ کیا کرتے۔ اپنی اس فارغ البالی کے متعلق اپنے کلام میں کہیں کہیں اشارہ کیا ہے۔

ترے آرام کو اللہ نے عیش — مہیا کر دیئے اسباب کیا کیا

ملازمت| نواب صاحب جھجر کے ہاں ملازم تھے۔ بس نام کے ملازم تھے کبھی ضرورت پڑی تو چلے گئے، نہیں تو گھر بیٹھے تنخواہ لیتے تھے۔ قلعے سے بھی تعلق تھا۔ بادشاہ کے لڑکے شاہ رُخ مرزا کی ڈیوڑھی سے کچھ مل رہتا تھا۔ چنانچہ ایک قصیدے میں اس کا ذکر ہے۔

کروں جو صفحۂ کاغذ پہ تیری مدح رقم — عجب نہیں ہے کہ ہو درفشاں زبان قلم
نہ فیض عام ہو کس طرح تیرا عالم میں — خدا نے تجھ کو بنایا ہے صاحبِ عالم
ترا وہ رتبۂ عالی ہے شاہ رخ مرزا — نہ ہو سکے ترے ہم جب رتبہ رتبۂ جم
ترے ہی ناخن تدبیر سے جہاں میں آج — کھلے ہے عقدۂ کار جہاں، خدا کی قسم
اب آگے عرض مری تجھ کہ یہ روشن ہے — زبان پر نہیں لایا۔ اسی سے ہے مبہم
پر اتنی عرض ضروری ہے سب رہیں سرسبز — میں تشنہ کام رہوں، ایک اے سحاب کرم

پھر بادشاہ سلامت کے حکم سے مرزا فرخندہ شاہ کی سرکار سے تعلق ہو گیا۔ اس واقعے کو ایک دوسرے قصیدے میں ظاہر کیا ہے۔

نہ کیوں ہو تیری عنایت کا مجھ کو شکر ضرور — کہ تیرا شکر ہے بس عین شکر رب غفور
ادائے شکر ترا اگرچہ غیر ممکن ہے — مگر میں حکم الٰہی سے ہوں، شہا، مجبور
ملا علوفہ ترے خانہ زاد کو شاہا — تصدقِ سر اقدس، موافق دستور
علاوہ اس کے عنایت ہوئی غلام پہ یہ — کہ جس کا حال ہے اس قطعے میں ہوا مذکور
جناب میرزا فرخندہ شہ کی خدمت میں — کیا حضور نے اس خانہ زاد کو مامور

اس کے بعد بڑھتے بڑھتے شاہی طبیب ہو گئے۔ ہر دوسرے روز

قلعے سے پالکی آتی تھی۔ اس میں بیٹھ کر قلعہ جاتے۔ تھوڑی دیر وہاں ٹھیرے۔ کوئی مریض ہوا۔ اس کو دیکھ لیا۔ بادشاہ سلامت کو مجرا کیا۔ اور چلے آئے۔ قلعے سے تنخواہ ذرا مشکل سے ملتی تھی۔ غالب کو قصیدہ لکھنا پڑا۔ جب کہیں جا کر تنخواہ ملی۔ بچارے عیش کے سر پر بھی یہی مصیبت آئی۔ اُنھوں نے بھی ایک قصیدہ لکھا جب مشکل آسان ہوئی۔ لکھتے ہیں۔

نسیم صبح ہوئی آج یہ نوید رسا | کہ ہے بہار کی آمد کا ہر طرف جلسا
جلوس شاہد گل کے لئے بچھایا ہے | صبا نے باغ میں فرش زمردی ہر جا

خیر؛ بہار یہ حصہ لکھ کر یہ دبیر خرد سے مل کر پوچھتے ہیں کہ حضرت آج یہ کیا چہل پہل ہے، وہ جواب دیتا ہے کہ بادشاہ سلامت کی سالگرہ کا جلسہ ہے۔ اس کے بعد بادشاہ سلامت کی تعریف شروع ہوتی ہے، اور پھر۔

یہ میں نے سُن کے کہا اس سے اے دبیر خرد | خدا کے واسطے تدبیر کوئی مجھ کو بتا
کہ اس جناب مقدس میں، میں بھی حاضر ہوں | کہ جس کی ذات سے ہے کامیاب ارض وسما
کہا یہ اس نے کہ کیوں پوچھتا ہے تو تدبیر | ضرور اس کی تو بخشش کو کچھ نہیں حیلا
وہاں ہے بخشش عام، اس کی بے سبب پر | خصوص تو، تو قدیمی ہے خانہ زاد اس کا
جو اس پہ بھی ہے تو پابند عالم اسباب | تو ایک بات بتاؤں تجھے میں چل، اچھا
خدا نے ذات بنائی ہے اس کی مستغنی | اسے بس اور کسی شئے کی کچھ نہیں پروا
مناسبت ہو طبیعت کو تیری شعر سے گر | تو چند شعر دعائیہ کہہ کے تو نے جا
میں عرض حال کو اپنے سمجھ کے ترک ادب | زبان پر نہیں لایا ہوں اب تلک شاہا
مگر یہ عرض، کہ بے اس کے زندگی ہے محال | رکا ہے اگلے مہینے سے میرا درماہا

خدا ہی جانے کہ یہ کس نے گل کھلایا ہے مجھے خبر نہیں۔ دریافت کر تو داد رسا

حلیہ | جب کوئی روزی سے بے فکر ہوتا ہے تو عمر گذارنے کے لئے ہمارے ہندوستانی بھائیوں کے لئے بس دو ہی طریقے ہیں۔ یا شعر شاعری کرنا۔ یا اللہ اللہ کرنا۔ حکیم صاحب نے دونوں راستوں کو اختیار کیا تھا۔ مطب سے فرصت ہوئی۔ کچھ لکھنے بیٹھ گئے۔ اس سے فارغ ہوئے تو تسبیح سنبھالی۔ سارا دن وظیفہ وظائف ہی میں گزار دیتے۔ رات کو گیارہ بجے گھر میں آتے کھانا کھاتے اور سو رہتے۔ چوبیس گھنٹے میں بس ایک ہی دفعہ کھاتے تھے پھر بھی آخر وقت تک ان کے قویٰ میں فرق نہ آیا۔ کوئی (۹۸) برس کی عمر میں ان کا انتقال ہوا لیکن مرتے دم تک نہ کوئی دانت ٹوٹا نہ بینائی کمزور ہوئی۔ ان کا حلیہ آزاد مرحوم کی زبانی سُن چکے۔ اب ان کی پوتی کی زبانی بھی سُن لیجئے۔ بہت اونچا قد۔ نہایت سُرخ و سفید رنگ۔ نیچی گول بھرواں ڈاڑھی۔ کتابی چہرہ۔ منڈا ہوا سر۔ ستواں ناک۔ بڑی بڑی آنکھیں شکل پر نور برستا تھا۔ ہمیشہ نیچی چولی کا انگرکھا پہنتے تھے۔ آستینوں کے چاک کہنی تک کٹے ہوئے۔ کرتہ تمام عمر انھوں نے کبھی نہیں پہنا۔ جاڑے میں فرغل یا دگلہ استعمال کرتے تھے۔ فرغل تو عموماً مومی چھینٹ کی ہوتی تھی۔ مگر دگلہ اکثر اونی کپڑے کا ہوتا تھا۔ ایک برکا پیجامہ۔ پاؤں میں ٹھواں چوڑے پنجہ کی۔ ریشم کے کام کی جوتی ہاتھ میں سبز رنگ کی جریب۔

ان کا زہد و تقویٰ | ان کے زہد تقویٰ کا حال ان کے دیوان سے جا بجا کھلتا ہے۔ حضرت محمد شاہ صاحب کے مرید تھے۔ مگر ہر بزرگ سے عقیدت تھی۔ اکثر رباعیاں بزرگان دین کی شان میں لکھی ہیں۔ حضرت امیر خسروؒ کی شان میں فرماتے ہیں۔

رباعی

آتا ہے ترے در پہ ہر ایک حاجت خواہ   اللہ نے دیا ہے تجکو وہ رتبہ وجاہ
اے طوطیٔ بوستانِ محبوب الٰہ   کر عیش کے حق میں بھی دعا از رہِ لطف

اپنے پیر کو اس طرح پکارتے ہیں۔

رہتا ہوں میں فکر سے نہایت دلگیر   تو حال پہ میرے کر توجہ۔ یا پیر
بن آتی نہیں ہے مجھ سے کوئی تدبیر   کر حق میں دعا میرے، کہ ہوں میں لاچار

آلِ رسول اللہ کے عاشق تھے فرماتے ہیں۔

جو کھاؤ غم، تو غم آلِ مصطفےٰ کھاؤ   نہ کھاؤ تم غم دنیائے دوں مگر ہاں عیش

اولیاء اللہ کی محبت کی ضرورت کو کس خوبی سے بیان کیا ہے۔

کہ ان کے نام میں اللہ کا آتا ہے نام آخر   محبت اولیاء اللہ کی آتی ہے کام آخر

ہے تو بے موقعہ مگر ایک اور شعر سنائے دیتا ہوں۔ یاد نہیں کس کا ہے مگر خوب کہا ہے۔ اور لفظ کے خوب ٹکڑے کئے ہیں۔

دیکھو اللہ میں ہے اس کا اثر دو بستین   ظالموں لِس سے ڈرو، آہ کو جانو نہ حقیر

رات دن صدقے نہ ہوں سو جان سے کیوں اس کے ہم
عیش جس دل کو ہے عشق حضرت باری کا شوق

فقیروں سے خاص عقیدت تھی، پوری کی پوری غزل اس بارہ میں

لکھ گئے ہیں۔

نہ کر فقیروں سے تو چھیڑ چھاڑ دیوانے　　نہ چھیڑ کر انھیں حق سے بگاڑ دیوانے
تو اپنے حق میں نہ بو، ان کو چھیڑ کر کانٹے　　یہ اپنے پیچھے نہ چمٹا تو جھاڑ دیوانے
تو اپنی طرح سے مردانِ حق کو مُردہ نہ جان　　یہ مردے وہ ہیں کہ ڈھادیں پہاڑ دیوانے
جو ان کی کرتا ہے کوئی جہان میں توہین　　حق ان کو دیتا ہے جڑ سے اکھاڑ دیوانے
جو غیر حق انھیں سمجھے ہیں عیش ان کو سمجھ
کہ حق نے ان کو بنایا ہے آڑ دیوانے

معلوم ہوتا ہے کہ سالک کے دیکھنے والے تھے مجذوبوں سے کچھ شوق نہ تھا اپنا عقیدہ یوں بیان کرتے ہیں۔

مست کیا جانے ہیں لطفِ مستی　　لطفِ مستی کسی ہوشیار سے پوچھ

ہاں بالکل سچ ہے، پی کر جو ہشیار رہے وہی کچھ پینے کا مزا جانتا ہے، اگر پی کر موری میں جا پڑے تو پینے کا کیا خاک لطف اُٹھایا۔

سلوک کا طریقہ ایک رباعی میں اس طرح بتاتے ہیں۔

رباعی

گر طالب حق ہے چھوڑ دے لاف و گزاف　　بغض و حسد و کینہ سے کر سینہ صاف
جب ہو چکے بات یہ تجھ کو حصول　　کر مصلقۂ ذکر سے دل کو شفاف

ایک جگہ دعا کرتے ہیں، دیکھنا کیا سوز و گداز ہے۔

جان پر میری کر۔ کرم یا رب　　دور کر دل سے میرے غم یا رب
بغض و کینہ کو صفحۂ دل سے　　دے مٹا میر سے یک قلم یا رب
ہم گنہ گار تیرے بندے ہیں　　تجھ سوا کہویں کس سے ہم یا رب
مونس جان و دل رہے میرا　　ذکر تیرا ہر ایک دم یا رب

اور رہِ مستقیم پہ تیرے — رہے ثابت مرا قدم یارب
عیش تیرا ہے دور رکھ اس سے — درد و رنج و غم و الم یارب

تاریخ وفات غرض یوں ہی اللہ اللہ کرتے کرتے ختم ہو گئے۔ مگر کب مرے، اس کا حساب لگانا مشکل ہے۔ آزاد مرحوم فرماتے ہیں کہ غدر کے چند روز بعد انتقال کیا۔ حکیم صاحب کی پوتی کہتی ہیں کہ "اے ہے ابھی تھوڑے ہی دن تو ہوئے جب وہ مرے، اس وقت میرا سب سے چھوٹا بھائی تین سال کا تھا۔ کوئی ایک ہفتہ بیمار رہے۔ تپ محرقہ تھی۔ دل پر صندل میں بھگو بھگو کر کپڑے رکھے جاتے تھے، آخر میرانجی[1] کی گیارہ تاریخ کو ختم ہو گئے۔" غدر ۱۲۷۳ھ میں ہوا، اس کے بہت بعد تک وہ زندہ رہے، کیونکہ انھوں نے غالب کی تاریخ وفات کہی ہے اس کے شروع کا حصہ پھٹا ہوا ہے۔

اور بڑے چین سے گزاری عمر — جب تلک وہ یہاں مقیم ہوئے
اب جو یہاں سے وہاں گئے تو وہ عیش — موردِ بخشش کریم ہوئے
رکھتے دل خوش تھے وہ سو با دلِ خوش — داخلِ جنتِ نعیم ہوئے

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ۱۲۸۵ھ تک وہ زندہ سلامت تھے۔ سب سے آخری تاریخ جو ان کے دیوان میں ہے اس میں انھوں نے منشی امو جان کی تاریخ وفات لفظ "غفور" سے نکالی ہے۔ گویا ۱۲۸۶ھ یعنی

---

[1] دہلی کی عورتوں نے مہینوں کے جو نام رکھے ہیں وہ بھی سن لیجئے۔ (۱) محرم (۲) تیرہ تیزی (۳) بارہ وفاتیں (۴) میرانجی (۵) مدار (۶) خواجہ معین الدین (۷) رجب (۸) شب برات (۹) رمضان (۱۰) عید (۱۱) خالی (۱۲) بقرید (بقرعید)

غدر سے کم سے کم تیرہ سال بعد تک وہ بقید حیات تھے۔

اب ان کی پوتی صاحبہ کے بیان سے حساب لگائیے۔ ان کے چھوٹے بھائی کا نام ڈاکٹر سعید جان ہے اور اس وقت ان کی عمر (۵۳) سال کی ہے، وہ (۳) سال کے تھے۔ جب حکیم صاحب کا انتقال ہوا۔ اس لحاظ سے ان کا سنہ وفات ۱۲۹۷ھ پڑتا ہے۔ انتقال کے وقت ان کی عمر دو کم سو برس کی تھی گویا اُن کا سنہ پیدائش ۱۱۹۹ھ یا ۱۲۰۰ھ تھا۔

انتقال کے بعد ترکمان دروازے کے باہر ناصر وزیر کی بارہ دری میں خواجہ میر دردؔ کی پائنتی دفن ہوئے، پہلے پختہ مزار تھا۔ اب نشان مٹ کر مٹی کا ڈھیر رہ گیا ہے۔

اولاد | اولاد میں ایک لڑکا اور تین لڑکیاں تھیں۔ مگر چار بچوں سے بھی گھبرا گئے تھے۔ کہتے ہیں۔

کمرِ شاخ کو توڑے ہے ثمر ۔۔۔ اس سوا لطف تاہل کیا ہے

توڑ دے جب کمرِ شاخ ثمر ہی اس کا ۔۔۔ کیا توقع رکھے اپنی کوئی اولاد سے اب

اسی مضمون کو استاد ذوقؔ نے خوب باندھا ہے، فرماتے ہیں۔

توڑا کمرِ شاخ کو کثرت نے ثمر کی ۔۔۔ دنیا میں گرانباریِ اولاد غضب ہے

ابن یمین بھی اسی مصیبت کا غل مچاتے مچاتے مر گئے۔

مرا در وقت پیری بار اطفال ۔۔۔ نہ واحق بود حقا ثم حقا

فھا انا فی الغروبۃ لی عیال ۔۔۔ یدق الظھر دقا ثم دقا

ترجمہ:۔ اس عالم غربت میں بال بچوں کے بوجھ نے میری کمر توڑ دی اور بری طرح توڑ دی۔

ان کی شاعری پر غدر کا اثر | غدر کے بعد سے ان کی شاعری نے مرثیے کا رنگ اختیار کر لیا تھا۔ دلّی والوں کو جو صدمہ دلی کی تباہی کا ہوا۔ اس کا دھیان کرنے سے دل بھر آتا ہے۔ بہادر شاہ کو بادشاہ کہو یا شاہ شطرنج۔ پھر بھی ایک قلعہ ہی تھا جو شریفوں کا ملجا و ماوی تھا۔ ہر کسی کا قلعہ سے کچھ نہ کچھ تعلق تھا۔ سلطنت نہ تھی۔ پھر بھی سمجھتے تھے کہ سلطنت ہماری ہے۔ اور کیوں نہ سمجھتے۔ مال گروی رکھنے کے بعد بھی گروی کرنے والے ہی کا رہتا ہے، خواہ سود اور اصل ملا کر مال کی قیمت سے بڑھ ہی کیوں نہ جائے بادشاہ کیا گئے، دلی والوں کا دل مرگیا۔ اپنا درد دوسروں کو سُنا سنا کر خود روتے تھے، دوسروں کو رُلاتے تھے، غرض یوں ہی روتے روتے تمام ہو گئے اور ہم کو رُلانے کے لئے اپنا کلام چھوڑ گئے۔ غدر کے کئی برس بعد دلّی میں ایک مشاعرہ ہوا تھا اس میں کوئی طرح نہیں دی تھی۔ بس یہی تھا کہ دلّی کا مرثیہ کہو۔ غزل میں کہو۔ چاہے۔ رباعی میں، مخمس میں کہو، چاہے مسدس میں۔ یہ کل کلام ایک کتاب کی شکل میں چھپا ہے اور ڈھونڈے سے مل جاتا ہے۔ اسی مشاعرہ میں داغ مرحوم نے اپنا شہر آشوب پڑھ کر سُننے والوں کو تڑپا دیا تھا۔ ہائے لکھتے ہیں۔

فلک زمین و ملائک جناب تھی دہلی ۔۔۔ بہشت و خلد میں بھی انتخاب تھی دہلی
جواب کاہے کو تھا لاجواب تھی دہلی ۔۔۔ مگر جو دیکھی حقیقت تو خواب تھی دہلی

پڑی ہیں آنکھیں جو پہلے جگہ تھی نرگس کی
خبر نہیں کہ اسے کھا گئی نظر کس کی

دو بند اور سن لیجئے۔

کھلایا زہر ستمگر نے پان کے بدلے پلایا خونِ جگر بیچوان کے بدلے
نصیب دار ہوئی ہے نشان کے بدلے ملا نہ گورِ گڑھا بھی مکان کے بدلے

یہ دعوتِ فلکِ کینہ ساز تو دیکھو
اور اس پہ اس ستم آرا کے ناز تو دیکھو

الٰہی بخت بد، ایسے ہمارے ہو جائیں کہ ہیں جو لعل و گہر سنگ پارے ہو جائیں
جو دانے مانگیں تو خرمن شرارے ہو جائیں جو پانی چاہیں تو دریا کنارے ہو جائیں

پئیں جو آبِ بقا بھی تو زہر ہو جائے
جو مانگیں رحمتِ باری تو قہر ہو جائے

اس مشاعرہ میں مفتی صدرالدین صاحب آزردہ بھی شریک تھے۔ انھوں نے دہلی کی تباہی پر خدا کا شکر ادا کیا ہے۔ فرماتے ہیں۔

ہوا، اچھا جو مٹا نام و نشانِ دہلی
کس کی پاپوش بنے مرثیہ خوانِ دہلی

تو خیر، اس مشاعرے میں حکیم آغا جان عیش نے بھی بہت کچھ دلی کا رونا رویا ہے ایک شہر آشوب میں دلی کی شریف بی بیوں کی حالتِ زار لکھتے ہیں۔

فلک کی آنکھ نہ تھی جن کو دیکھنے پاتی نہ تھی مجال صبا کی جو ان تلک جاتی
خدا نے دی تھی انھیں ایسی عصمتِ ذاتی کہ نامِ غیر جو سنتیں تو، ان کو شرم آتی

فلک نے بخشا ہے ان کو لباسِ عریانی
ہے ستر ان کے لئے ان کی پاک دامانی

دوسرے شہر آشوب میں قلعے کی بربادی کا یوں ذکر کرتے ہیں۔

سر جھکاتا تھا جہاں اُن کے سارا عالم قبلہ و کعبہ سمجھتے تھے جنھیں اہلِ حشم

دست بستہ جہاں حاضر تھی سدا شوکت جم دفعتاً ان سے ہوا ایسا زمانہ برہم

آج تونان شبینہ کو بھی محتاج ہیں وہ
کل گدا بھی کوئی ایسا نہ تھا جو آج ہیں وہ

شرفا کے گھرانوں کی تباہی کا یوں رونا روتے ہیں۔

تھا وہ جن لوگوں کے ہاتھوں کی نزاکت کا خیال بارے رنگ حنا کے وہ ہوئے جاتے تھے لال
خواب مخمل سے کفِ پا کو بھی تھا جن کے ملال میلے ہوتے تھے نظر کرنے سے وہ چاند گال

اب وہی لوگ ہیں اور بادیہ پیمائی ہے
مل گئی خاک میں سب میری وہ مرزائی ہے

غرض دوسرا دیوان تقریباً سارے کا سارا اسی رونے دھونے سے بھر دیا ہے۔ تھوڑا بہت نقل کئے دیتا ہوں۔ دل سے نکلی ہے دل میں اثر کرے گی ہاں جن کے دل کو لگی نہیں ہے وہ اس حصے کو چھوڑ دیں۔ یہ اہل درد کی صف ماتم ہے۔ بے درد خدا کے لئے یہاں سے اُٹھ جائیں۔

جب دلی بھری ہوئی تھی اُس وقت کا رنگ دیکھو معلوم ہوتا ہے کہ باغ میں بلبل چہک رہا ہے۔

جو آکے جنت سے حور دیکھے زمین فصل بہار دہلی
تو ہوئے سو جاں سے بے تکلف یقین سمجھو نثار دہلی

جہاں کی جو خوبیاں ہیں ساری، وہ سب ہیں دہلی کی سر زمیں میں
نہیں ہے کوئی دیار ہرگز جہاں میں مثلِ دیار دہلی

مبالغہ اس میں کچھ نہیں ہے، جو نقش ارژنگ آکے دیکھے
تو گم ہو اس کی بھی دیکھو سٹی، ہیں ایسے نقش و نگار دہلی

دعا ہے یوں عیش، خوش زباں کی بصد تضرع جناب حق میں
الٰہی عیش و نشاط و عشرت رہیں سدا ہم کنار دہلی

بادشاہ کے لئے قصیدے لکھتے ہیں۔ دعائیں دیتے ہیں۔
عیش، آباد رکھے خالق اکبر اس کو کیونکہ ہے وہ دل تیمر کے نگیں کا ٹکڑا

سراج الدین غازی ہے سرپرآرا جو عالم میں نصیب اس کو اور اس کی ساری محفل کو ہو آرائش

یا ایک دفعہ ہی ایسی ہوا چلی کہ بساط الٹ گئی۔ زمانہ بدل گیا۔ کچھ سے کچھ ہو گیا۔ اس ناگہانی آفت کا جو کچھ اثر دلی والوں کے دلوں پر نہ ہوا ہو۔ وہ کم ہے ایک دفعہ ہی گھبرا کر کہتے ہیں۔ کہ ہیں۔

یہ ہوا کیسی چلی برہم زمانہ ہو گیا حال دہلی، اہل عالم میں فسانہ ہو گیا
دل کسی فرد بشر کا خالی اس غم سے نہیں غم یہ شائع کو بہ کو خانہ بہ خانہ ہو گیا
ہر سر مژگاں نہ ہو فوارۂ خوں کس طرح غمزدوں کے دل میں جب غم کا خزانہ ہو گیا
ایک ہو تو رو دیے کس کس کو روئیں یاد کر دیکھ کر اس حادثہ کو دل دوانہ ہو گیا
دیکھتے ہی دیکھتے آنکھوں کے آگے اپنے ہاں دم کے دم میں اور ہی کچھ کارخانہ ہو گیا
آہ گلگون بہار گلشن دہلی کو عیش موجۂ باد خزاں کیا تازیانہ ہو گیا

حال عالم آہ کیف و کم میں کیا تھا کیا ہوا
یا اولی الابصار دیکھو دم میں کیا تھا کیا ہوا

غدر میں بڈھے ہو چکے تھے اس لئے لکھتے ہیں

فصل خردی و جوانی تو کٹی اس چین سے
اب رہی پیری تو اس موسم میں کیا تھا کیا ہوا

پھر آپ ہی دل کو تسکین دیتے ہیں

اے دل ناداں تو اس بات کا شاکی نہ ہو
ربط باہم دیکھ جام وجم میں کیا تھا کیا ہوا

آخر دوستوں کے غم میں روتے روتے تھک جاتے ہیں

جز خداوند جہاں، حال دل اپنا عیش، اب
کس سے کہئے دوستوں کے غم میں کیا تھا کیا ہوا

عین غدر میں غزل کہی ہے. کوتوالی کے چبوترے پر پھانسیاں کھڑی ہوئی ہیں. لوگ ٹکائے جا رہے ہیں، حکیم صاحب دیکھ رہے اور رو رو کر کہہ رہے ہیں۔

کوچۂ زلف میں لاکھوں کے گئے دل مارے
سر زمین ہند کی کیا 'عیش' بلاخیز ہے آج

گھبرا گھبرا کر ادھر اُدھر دیکھتے ہیں. سمجھ میں نہیں آتا کہ الہی کیا سے کیا ہو گیا ایک مصیبت ہو تو صبر کریں، دو ہو تو صبر کریں آخر اس غم پر کیسے صبر کیا جائے۔

یا الٰہی یہ ہوا دنیا میں کیسا انقلاب
اک زمانہ گردش چرخ کہن میں آگیا

معلوم ہوتا ہے کہ غدر ہی میں دہلی سے نکل گئے تھے. امن وامان ہونے کے بعد دہلی آنا چاہتے ہیں. لیکن آنے کو جی نہیں چاہتا. جس گھر کو بھرا بھرایا چھوڑ گئے تھے. اس کو ویران کن آنکھوں سے دیکھیں. دوست نہیں رہے. جن میں مل بیٹھ کر غم غلط کریں یا کم سے کم آنسو بہا کر دل کو تسکین دیں۔

جب عندلیب چمن سے ہوا چمن خالی | تو آب سے اے پا، زاغ اور زغن خالی
بتاؤ آکے وطن میں، بھلا لگے دل کیا | جب عیشؔ ہوگیا یاروں ہی سے وطن خالی

دل لگی کہتے ہیں جس کو وہ تو ہے یاروں کے ساتھ
جب نہ وہ ہوں، تو لگے دل پھر وطن میں کس طرح

ظفرؔ کو یاد کرتے ہیں۔ اور دل پکڑ کر رہ جاتے ہیں۔ ایک شعر میں وہ کچھ کہہ گئے ہیں کہ ہزاروں مرثیے اس پر سے قربان ہیں۔ ہائے لکھتے ہیں۔

عیشؔ ہی کو کچھ نہیں صدمہ جدائی کا تری
مبتلائے غم ہے اک عالم ظفرؔ تیرے لئے

بادشاہ مر گئے۔ ان کی یاد میں آنسو بہاتے ہیں اور کہتے ہیں۔

رونق حضرت دہلی تھی اسی کے دم سے | بعد مرنے کے کھلی سب پہ ظفرؔ کی خوبی[1]

سچ ہے قدر نعمت بعد زوال۔

دہلی کا حال زار، اُنھوں نے اپنے دوسرے دیوان میں اس طرح رو رو کر بیان کیا ہے کہ پڑھنے سے رونا آتا ہے۔ فرماتے ہیں۔

---

[1] اس شعر سے معلوم ہوتا ہے کہ غدر کے بہت بعد تک حکیم صاحب زندہ رہے۔ ظفرؔ کا انتقال رنگون میں ۱۲۷۹ھ میں ہوا۔ غدر ۱۲۷۲ھ میں ہوا تھا۔ حکیم صاحب کے دوسرے دیوان میں ظفرؔ کے انتقال کی تاریخ درج ہے۔ غدر ہونے، بادشاہ کے قید ہونے، رنگون بھیجے جانے اور وہاں وفات پانے کو فارسی میں نظم کیا ہے۔ مگر افسوس ہے کہ دیوان میں یہ حصہ اس طرح پھٹ گیا ہے کہ اس کا نقل کرنا دشوار بھی ہے اور بے کار بھی۔

نہیں حال دہلی سنانے کے قابل ۔۔۔ یہ قصہ ہے آنسو بہانے کے قابل
اجاڑے ہیں وہ قصر ایک ایک اس کے ۔۔۔ جو تھے دیکھنے اور دکھانے کے قابل
نہ خوش آئی آبادی اس کی فلک کو ۔۔۔ نہ تھے ورنہ وہ تو مٹانے کے قابل
کیا آہ برباد چن چن کے ان کو ۔۔۔ نہ تھے جو کہ برباد جانے کے قابل
ملایا جنھیں خاک میں تو نے، وہ تو ۔۔۔ نہ تھے خاک میں یوں ملانے کے قابل
ستم سا ستم تو نے ڈھایا ہے ظالم ۔۔۔ نہیں بات یہ منہ پہ لانے کے قابل
کہیں ہیں سب احباب دہلی کو چلئے ۔۔۔ رہی ہے کہاں اب وہ جانے کے قابل
جسے دیکھ کہتے تھے سیاح عالم ۔۔۔ ق ۔۔۔ یہ ہے جائے آرام پانے کے قابل
اُسے دیکھ بلبل بھی کہتی ہے، یہ جا ۔۔۔ نہیں آشیاں اب بنانے کے قابل
سُنا جس نے یہ حال افسوس کھایا ۔۔۔ یہ ہے حال افسوس کھانے کے قابل
دُکھائے ہیں افسوس وہ دل فلک نے ۔۔۔ نہ تھے عیش، جو دل دکھانے کے قابل

اسی زمین میں ظفر کے دو شعر بھی سُن لیجئے۔ یہ رنگون میں انھوں نے کہے تھے۔ ان کے پوتے کی زبانی سُنے تھے۔ ہائے فرماتے ہیں۔

نہ گھر ہی رہا اُن کے آنے کے قابل ۔۔۔ نہ ہم ہی رہے واں کے جانے کے قابل
نہ گھر ہے نہ در ہے، رہا اک ظفر ہے ۔۔۔ فقط اشک حسرت بہانے کے قابل

حکیم صاحب خدا سے دعا کرتے ہیں اور مشورہ بھی دیتے ہیں۔

الٰہی بسا پھر تو اپنے کرم سے ۔۔۔ اسے، کیوں کہ ہے یہ بسانے کے قابل

اپنے کلام میں جا بجا لکھنؤ والوں پر چوٹیں کی ہیں مگر لکھنؤ کی تباہی نہ دیکھ سکے۔ دل بھر آیا۔ دلی کو رو رہے تھے، لکھنؤ کی مصیبت پر آنسو بہانے لگے۔ سچ ہے ٹوٹے ہوئے دل پر ٹھیس بہت جلدی لگتی ہے۔

ہوگیا ویران دہلی اور دیار لکھنؤ ۔۔۔ اب کہاں وہ لطف دہلی اور بہار لکھنؤ

جو تھے دہلی میں عمائد ہو گئے یکسر خراب　　اور تباہ سارے ہوئے صاحب وقار لکھنؤ
تھا خس و خاشاک دہلی غیرتِ صد لالہ زار　　رشکِ صد گلزار تھا ایک ایک خار لکھنؤ
غم میں دہلی کے گلوں کے تو گریباں چاک ہیں　　اور سوسن ہے چمن میں سوگوار لکھنؤ
ٹکڑے ہوتا ہے جگر دہلی کے صدمے سن کے عیش　　اور دل پھٹتا ہے سن کر حال زار لکھنؤ

حکیم صاحب کے دو شعر لکھتا ہوں ذرا دوسرے شعر پر غور کیجیے کیا بات پیدا کی ہے۔

ہند کہتے ہیں جسے ملک سلیمان ہے یہ　　مل گیا خاک میں اس پر بھی پرستان ہے یہ
بلبلیں کہتی ہیں، صیاد کا احسان ہے یہ　　کہ ہمیں چھوڑ دے یہ کہہ کے گلستان ہے یہ

دلی لٹ چکی ہے، یہ باہر کسی گاؤں میں پڑے ہیں۔ وہاں سے لکھتے ہیں۔ کہ اے صیاد بڑا احسان ہو گا اگر تو ہم کو اس اُجڑے دیار میں آنے ہی کی اجازت دیدے۔ یہ ہم کو معلوم ہے کہ دلّی اب دلّی نہیں رہی گلستان اُجڑ کر ویرانہ ہو گیا۔ مگر تو یہ کہہ کر ہم کو وہاں چھوڑ دے کہ "لو یہ تمھاری دلّی ہے" ہم خود یہ سوچ کر دل بہلانے کو پتہ چلا لیں گے کہ "یہاں غنچہ یہاں گل تھا"

غرض دوسرا دیوان سارے کا سارا ان ہی شہر آشوبوں سے بھرا ہوا ہے۔ روتے ہیں اور دعا کرتے ہیں پھر روتے ہیں پھر دعا کرتے ہیں۔

پھلے پھولے الٰہی پھر کے شاخِ گل تو اچھا ہو
پھرے پھر ابلی گیلی باغ میں بلبل تو اچھا ہو

دلّی پھر آباد ہوئی مگر حکیم صاحب کو دیکھنی نصیب نہ ہوئی۔

سلسلۂ شاگردی حکیم صاحب کے استاد کا نام قیامت تک معلوم نہ ہوتا اگر انھوں نے خود اپنی ایک غزل میں استاد ہی نہیں، اُستاد کے اُستاد

بلکہ ان کے بھی اُستاد کا ذکر نہ کر دیا ہوتا۔

لکھتے ہیں

مجرم[1] کا ہیں شاگرد وہ بیدار[2] کے شاگرد ہے عیش سلالہ مرا یوں درد[3] و اثر[4] تک

عجیب اتفاق ہے کہ مرے بھی تو دادا اُستاد ہی کی پائینتی جا پڑے۔

---

[1] مجرم تخلص۔ رحمت اللہ نام، آگرے کے رہنے والے تھے۔ کنڈہ کشی کرتے تھے۔ پھر فقیر ہو گئے۔ پھرتے پھراتے دہلی آئے۔ "بیدار" کے شاگرد ہوئے۔ کچھ دنوں دہلی میں رہے یہاں سے بریلی چلے گئے۔ بڑے ظریف اور طباع تھے۔ ان کی زبان اور طرز بیان کا رنگ دیکھ لیجئے۔

نگہ دزدیدہ کیوں پھینکے ہے تو اے امتِ عیسیٰ دل و سینہ کو توڑے ہے یہ پستول فرانسیسی
یہی ہے آرزو روز جزا میں اپنی اے مجرم علی کی غاشیہ داری ہو اور دلدل کی سائیسی

[2] میر محمدی نام "بیدار" تخلص، عرب سرائے دہلی میں رہتے تھے۔ خواجہ میر "درد" کے شاگرد تھے خواجہ "اثر" سے بھی اصلاح تھی۔ فارسی کلام مرتضیٰ علی بیگ۔ "فراق" کو دکھاتے تھے میر اور مرزا کے ہم عصر تھے اور ان لوگوں میں تھے جنھوں نے اُردو کو رعایت لفظی کے پھندوں سے نکال کر اور مانجھ کر بے ساختگی اور دلاویزی پیدا کی ان کے کلام میں صفائی اور تصوف کی جھلک ہے ۱۷۹۳ء میں آگرہ گئے اور وہیں ۱۷۹۶ء میں انتقال کیا ان کے کلام کا نمونہ یہ ہے۔

جو کچھ کہ تھا وظائف، دا اور اد۔ رہ گیا تیرا ہی ایک نام ہمیں یاد رہ گیا
بیدار، راہ عشق کسی سے نہ طے ہوئی صحرا میں قیس کوہ میں فرہاد رہ گیا

[3] درد تخلص خواجہ میر نام۔ بھلا ان پر کسی نوٹ لکھنے کی کیا ضرورت ہے۔

[4] سید محمد میر اثر خواجہ میر درد کے چھوٹے بھائی تھے۔ فن شعر میں ان ہی کے شاگرد ہوئے زبان صاف اور مضمون تصوف میں ڈوبے ہوئے۔ چھوٹی بحروں میں قیامت کی تحریر ہے ان کی مثنوی خواب و خیال پہلے کم ملتی تھی۔ اب انجمن ترقی اردو نے صحت کے ساتھ چھاپ کر زبان اُردو پر بڑا احسان کیا ہے ان کا دیوان لالہ سری رام صاحب دہلوی کے پاس ہے چھپوانے کے لئے لینے کی کوشش کر رہا ہوں۔ کسی نہ کسی دن دے ہی دیں گے۔

نالہ کرنا کہ آہ کرنا دل میں اثر اس کے راہ کرنا
کیا لطف ہے لیکے دل مکرنا اور الٹا مجھے گواہ کرنا
جی اب کے بچا خدا اگر پھر اور بتوں کی چاہ کرنا

طرح انھوں نے کہا ہے۔ ایسی کھلی چوٹ کرتے تھے کہ خدا کی پناہ فرماتے ہیں۔

صبا گزر ہو اگر تیرا لکھنؤ کی طرف ۔۔۔ تو اتنا کہیو تو واں کے زبان دانوں کو
کہ گر ہزار برس۔ اتنی بات یاد رکھو ۔۔۔ اس آرزو میں کھپاؤ گے اپنی جانوں کو
کہ اہل دہلی کی تقلید ہم زباں میں کریں ۔۔۔ تو، تم نہ پہنچو گے ان کی کبھی زبانوں کو

یہ تو ایک عام حملہ ہوا۔ اب شخصی حملہ دیکھیے۔

ناسخ و آتش سے یہ کہہ دو کوئی تم نے بھلا ۔۔۔ طرز عیش و حضرت ذوق و ظفر پائی کہاں

باوجود اس کے جب لکھنؤ تباہ ہوا تو یہ بغیر آنسو بہائے نہ رہ سکے، اور دہلی کے ساتھ لکھنؤ کا مرثیہ بھی لکھ گئے۔

میر تقی میر کی تعریف اور اس کی وجہ

میر صاحب کو سب ہی اُستاد مانتے چلے آئے ہیں۔ اور ایک آدھ شعر میں ہر ایک نے ان کی اُستادی کو تسلیم کیا ہے لیکن حکیم صاحب کا یہ حال ہے کہ ان کے دونوں دیوان میر صاحب کی تعریف سے بھرے پڑے ہیں۔ چند شعر پر اکتفا کرتا ہوں۔

ہے سچ تو یہ شعرائے جہاں میں عیش فقط ۔۔۔ کلام میر ہے البتہ دل پذیر اپنا

یوں تو سب مصری کی ڈلیاں ہیں عیش سُنا ۔۔۔ دل پسند اپنے ہیں ایک میر کے اشعار فقط

کیا زباں پائی تھی اس نے اور وہ کیا شخص تھا ۔۔۔ حق تعالیٰ شاد رکھے عیش روح میر کو

یوں تو سب اچھے ہیں پر مجھ سے جو تم پوچھتے ہو ۔۔۔ دل پسند اپنے ہے طرز سخن میر فقط

کلام | ان کا پہلا دیوان ان کے شاگرد میاں غمگین نے جمع کیا ہے۔ یہ وہ دیوان ہے جو لالہ سری رام صاحب دہلوی کے پاس ہے۔

سعیٔ 'غمگین' سے فراہم ہوا دیواں ورنہ
تھا پڑا یوں ہی کلام 'عیش' پریشاں اپنا

یہ ایک عجیب لطیفہ ہے کہ عیش کا دیوان اور غمگین جمع کریں۔

دوسرا دیوان جو ان کی پوتی کے پاس ہے۔ وہ خود ان کا مرتب کردہ ہے اس میں جا بجا خود ان کے قلم کی اصلاح بھی ہے اور اضافہ بھی۔ یہ دیوان نہایت خوش خط لکھا ہوا ہے۔ کہیں کہیں خود حکیم صاحب نے اپنے قلم سے ردو بدل کیا ہے۔ کہیں کوئی شعر ہو گیا تو وہ بڑھا دیا۔ ان کا خط ایسا ہے جیسا دہلی کے حکیموں کا ہوتا ہے۔ نہایت شکستہ۔ نقطے اس سرے سے اس سرے تک سب ندارد۔ اب اس دیوان کا اللہ ہی مالک ہے۔ کاغذ سخت ہو کر تڑخنے لگا ہے۔ ہاتھ لگا اور کاغذ کا ٹکڑا ہاتھ میں آ گیا۔ بعض صفحوں پر ان کے پڑپوتے میاں وحید الدین نے گلکاری کی ہے اور بعض پر جلی قلم سے اپنا نام اور :

تعریف اس خدا کی جس نے جہاں بنایا کیسی زمیں بنائی کیا آسماں بنایا

لکھا ہے آخر کے چند صفحے آڑے پھٹ کر آدھے رہ گئے ہیں۔ ظفر اور غالب کے انتقال کی تاریخیں بھی ان ہی پھٹے ہوئے ٹکڑوں کی نذر ہو گئی ہیں۔

لکھنؤ والوں سے بیزاری | خبر نہیں یہ کیا بات ہے کہ حکیم صاحب لکھنؤ والوں سے بڑے بیزار تھے۔ دہلی اور لکھنؤ کی یوں تو ہمیشہ چلتی رہی ہے مگر کسی نے اس طرح صاف صاف لکھنؤ والوں کو بُرا نہیں کہا جس

ایک جگہ ذرا چلتے چلتے سودا کی بھی تعریف کی ہے مگر اس میں بھی میر صاحب کو آدھے کا ساجھی کر دیا ہے۔

اے عیش، سنا جہاں میں اب شخص
پیدا نہیں میر و مرزا سے

اسی طرح صرف ایک شعر لکھ کر خواجہ میر درد۔ اور خواجہ اثر کی تعریف کر دی اور بس

آگاہ اس سے عیش، دل اہل درد ہیں
جو ہے کلام حضرت درد و اثر میں درد

میر صاحب کی اس تعریف میں بھی حکیم صاحب کی حکمت چھپی ہوئی تھی۔ اپنی تعریف کرتے اور کن انکھیوں سے میر صاحب کی طرف دیکھ لیتے۔ تمام دنیا سے تو لڑائی باندھ رکھی تھی۔ آخر کوئی تو تعریف کرنے والا ہوتا۔ اس لئے ایسے شخص سے تعریف کے طالب ہوئے جس کی سب تعریفیں کرتے ہیں۔

ہمعصر شعراء سے شکر رنجی پہلے ان کی اور ان کے ہمعصر شعراء کی شکر رنجیوں کا حال لکھ دوں۔ اس کے بعد ان کی تعلیوں کے اشعار لکھوں گا۔ شعراء ہمیشہ، زمانے کی نا قدری کا رونا روتے آئے ہیں۔ حکیم صاحب بھی اسی گروہ میں شریک ہیں۔ فرماتے ہیں۔

جو سخن سنج و سخن فہم تھے عالم میں سنا
حیف صد حیف کہ اے عیش وہ انساں نہ رہے

ذرا دیکھنا۔ کس خوبصورتی سے چوٹ کی ہے۔ شعر کے ایک معنی تو کھلے ہوئے ہیں کہ زمانے کے سخن سنج اور سخن فہم مر گئے۔ دوسرے معنی "انسان نہ رہے" کے یہ نکالے ہیں کہ وہ لوگ اب آدمی نہیں رہے۔ بلکہ سخن فہمی میں جانور ہو گئے ہیں۔ اسی مضمون کے دو شعر ایسے لکھے ہیں کہ سبحان اللہ۔ اور

دوسرے شعر میں قافیہ تو ایسا ڈھونڈ کر نکالا ہے کہ تعریف نہیں ہو سکتی۔

جہاں میں کیسی ہے بے قدری گُنی دیکھو
کبھی سُنی نہ تھی سو، اب وہ ان سُنی دیکھو
تھے آگے نوبت و نقارہ جن کے ہاں سحاب
لئے وہ پھرتے ہیں ہاتھوں میں ٹنٹنی دیکھو

ذاتی مخالفتوں کا حال آبِ حیات میں موجود ہے بعین مشاعرے میں غالب پر چوٹ کرنا اور ایسی چوٹ کرنا کہ مُنہ پھر جائے ہر ارد و داں کے پیش نظر ہے۔

اگر اپنا کہا تم آپ ہی سمجھے تو کیا سمجھے
مزا کہنے کا جب ہے اک کہے اور دوسرا سمجھے
زبانِ میر سمجھے اور کلامِ میرزا سمجھے
مگر ان کا کہا یہ آپ سمجھیں یا خدا سمجھے

ان کے علاوہ حکیم صاحب نے دیوان میں کئی جگہ اور بھی غالب پر حملہ کیا ہے۔

پسند کرلیں خواص اس کو سمجھ میں آئے عوام کی بھی
غرض ہو سب کے پسند خاطر یہی ہے خوبی کلام کی بھی

مومن خاں مومن کے نجوم پر بھی پردے پردے میں چوٹ کی ہے۔

وہ بے وقوف ہیں جو لکیروں کو ہاتھ کی
کہتے ہیں، ہے نوشتۂ تقدیر ہاتھ میں

اس کے علاوہ ملاحیاں تو خوب اڑائی ہیں۔ فرماتے ہیں۔

رُباعی

کیں مصلحتیں جو دشمنوں میں ہیں گی
ٹھیرائی جو باتیں ہمتوں میں ہیں گی
دل میں تو وہ کھوٹ اور ظاہر میں وہ لطف
یہ باتیں ہمارے ناخنوں میں ہیں گی

بظاہر کچھ تو باعث چاہیئے آپس کی اَن بَن کا
عداوت اہل فن سے کس لئے ہے صاحبِ فن کو

"بود ہم پیشہ با ہم پیشہ دشمن" اور "القاص لایحب القاص" کا معاملہ ہے۔

اے ہم نشیں معاملہ تو چاہیے تھا یوں
ہو مہر اہل مہر سے کیں اہل کیں کے ساتھ
یاں برخلاف اس کے ہے اہل جہاں کے رسم
ہے کینہ اہل مہر سے. مہر اہل کیں کے ساتھ

اسی مضمون میں فارسی کا ایک شعر ہے۔

دل را بدل رہیست دریں گنبد سپہر
از سوئے کینہ کینہ و از سوئے مہر مہر

عیش ابنائے جہاں میں ایک قلم — سب کے سب گندم نما و جو فروش

ذرا ملاحظہ ہو کہ قلم کا رُخ کس طرح اہل قلم کی طرف پھیرا ہے۔

تعلّی اب اس کے بعد دیکھئے کہ کس طرح حکیم صاحب تعلّی کی لیتے ہیں

اور میر صاحب کے پہلو میں جاکر چھپ جاتے ہیں۔

مرمٹا عاشق، رہا انکار ملنے سے تجھے
آفریں، صد آفریں، ظالم نہیں، اتنی تو ہو
عیش، سن یہ شعر روحِ میر بولی قبر میں
اے جزاک اللہ زباں سحر آفریں اتنی تو ہو

ایک غزل ہے جس کا مطلع ہے

چھدے نہ بلبل کا آہ کیونکر، بتاؤ تیر جفا سے پہلو
پڑی ہے گلشن میں دھوم دیکھو چھدا ہے گل کا صبا سے پہلو

اس غزل کے مقطع میں فرماتے ہیں

نہیں سخن فہم اب کوئی عیش جو میر ہوتا تو داد دیتا
وہی سمجھتا کہ اس غزل میں بندھا ہے کس کس ادا سے پہلو

تعلی کی اکثر لیتے ہیں۔ اور اپنے آپ کو بہت دور کھینچتے ہیں۔ ایک غزل کہی ہے جس کا مطلع ہے۔

سمجھ تو زیست کو اس عالم خراب میں خواب
زیادہ اس سے نہیں، زندگی ہے خواب میں خواب

ایک مشہور مقولہ ہے کہ زندگی ایک خواب ہے حشر کے دن آنکھ کھلے گی اسی کا یہ ترجمہ کیا ہے اور خوب کیا ہے۔ اس مضمون کو ایک دوسری جگہ بھی ادا کیا ہے۔ لکھتے ہیں۔

ہستی کا حال اپنے، بھلا تم سے کیا کہیں
دنیا میں آکے دیکھ گئے ایک خواب سا

اپنی اس کارگزاری پہ ناز کرکے مقطع کہتے ہیں۔

کہی ہے تو نے غزل جس ردیف و قافیہ میں
کہے تو عیؔش بھلا کوئی اب جواب میں خواب

اسی طرح ایک دوسری غزل میں فرماتے ہیں۔

یہ جس زمین میں تو نے غزل کہی اے عیؔش
کسی نے "طرح" کی ایسی کہی زمین تو ہو

اس غزل میں ایک شعر بڑے لطف کا ہے۔ محاورے کو اس طرح بٹھایا ہے جس طرح انگوٹھی میں نگینہ۔

سخی۔ سے سوم بھلا جو ٹکا سا دیدے جواب
طلب پہ بوسے کے گرہاں، نہیں نہیں، تو ہے

اس تعلی میں آخر بڑھتے بڑھتے حد سے بڑھ گئے ہیں۔

کلام غیر ملے کب ترے کلام سے عیؔش ہو ہم صفیر بھلا کیونکر زاغ بلبل کا

خدا نے کی ہے عنایت زباں جو عیؔش تجھے
کسی نے نینْدْ میں پائی کہاں زباں اتنی

کیا اچھا خیال ہے، نیند میں انسان اپنے آپ کو کیا کچھ نہیں دیکھتا۔ کہتے ہیں کوئی خواب میں بھی میری برابری کا خیال نہیں کرسکتا۔

لہ علامہ حیدر یار جنگ طباطبائی مرحوم نے لکھا ہے کہ دراصل یہ لفظ "ہند" تھا جس کو میاں فرحت نے "نیند" میں بدل کر اس شعر کو کہیں سے کہیں پہنچا دیا ہے۔ مگر میں صحیح کہتا ہوں کہ دیوان میں لفظ "نیند" ہی ہے۔ اور اس تعریف کے عیش ہی مستحق ہیں۔

سچ تو یہ بات ہے اے عیشؔ، کہ ہم پاتے ہیں
تیرے اشعار میں طرزِ سخنِ میرؔ کی بو

اس کے بعد جو قلانچ ماری تو میرؔ، اور میرزا، دونوں سے آگے نکل گئے۔ اور فرمانے لگے۔

وہ طرزِ میرؔ ہے اور طرزِ میرزا یہ ہے
محاورات و مضامین شستہ و رفتہ
تری زبان میں اعجاز اک نیا یہ ہے
سو عیشؔ پاتے ہیں تیرے کلام میں دونوں

کلام کے نمونے | اچھا اب میں ان جھگڑوں کو چھوڑتا ہوں اور حکیم صاحب کے کلام کے نمونے پیش کرتا ہوں قصیدوں کے کچھ نمونے اوپر دے چکا ہوں۔ صرف ایک قصیدے کا کچھ حصہ نقل کئے دیتا ہوں۔ اس لئے نہیں کہ یہ ان کا سب سے بہتر قصیدہ ہے بلکہ اس لئے کہ اُس سے اس زمانے کے جلوس شاہی کا حال معلوم ہوتا ہے۔ قصیدے میں واقعات کا لانا اور کسی مقام کا نقشہ کھینچنا مشکل ہے۔ اس کے لئے کچھ مثنوی ہی موزوں ہے۔ پھر بھی حکیم صاحب نے دربار کا نقشہ قصیدے میں کھینچا ہے اور خوب کھینچا ہے۔ ان کے کلام میں مجھے دو ہی چیزیں پسند آئیں۔ ایک قصیدے۔ دوسرے پہیلیاں۔ اچھا تو وہ قصیدہ سنئے:۔

جلوس شاہی | ہلال عید کو ہوتا کبھی نہ شرف کمال
رکاب سے ترے دیتے اگر نہ اس کو مثال
اسی سے خلق میں ہے احترام اس کا شہا
کہ آئے ہے ترے پابوس کے لئے ہر سال

اس کے بعد ہلال کی تعریف اور اس کی تشبیہیں دے کر ایک

شخص سے سوال کرا دیا۔

کہ بس ہلال کی تو سن چکا حقیقت میں
مگر بیان تو کر مجھ سے عید کا احوال
وہ عید کیا ہے کہ جس کی خوشی ہے عالم میں
وہ عید کیا ہے کہ جس سے ہر ایک ہے خوشحال

اب یہ اس شخص کے سوال کا جواب دیتے ہیں۔

تجھے خبر نہیں گر عید کی حقیقت کی
تو میں بیان کروں سن تو اے حمیدہ خصال
یہ عید جشن کا اس کے مقدمہ ہے۔ سنا
اب اس کے جشن کا بھی حال سن لے بالاجمال
کہ پہلے جشن سے ہوتی ہے تورہ بندی وہاں
جہاں میں پہنچے ہے ہر ایک کو اس کا خوان نوال
اور ایک رسم مقرر ہے پیشتر دو دن
جلوس جشن مبارک سے بھیجتی ہے دال
اور اسکے دوسرے دن اس کی بیس کڑھی
بڑا گروہ اسی میں ڈالے ہیں ملکے خیر سگال
اور اسکا تیسرا دن عین دن ہے شادی کا
کہ جمع ہوتے ہیں سب آکے دیکھنے کو جمال
اور حکم ہوتا ہے دربار عام کا اس دن
جو چاہے روکے کسی کو کوئی نہیں ہے مجال
ہے اس مکان کا دیوان خاص نام سنا
کہ جس میں ہوتا ہے یہ جلوۂ ظہور جمال
رکھے ہیں پہلے وہاں لاکے تخت طاؤسی
وہ تخت چرخ بھی جس کا ہے پایۂ اجلال
حضور آکے پھر اس تخت عرش عظمت پر
جلوس کرتے ہیں باصد شکوہ و عز و جلال
پھر اس کے بعد مقرر ہیں جو قریبی[1] وہاں
کھڑے ہوئے ہیں اسی طرح سب قرین و فضال
ہیں آگے سب سے ولیعہد عصر تخت کے پاس
بزیر سایۂ ظل خدائے با افضال
کھڑے ہوئے ہیں اسی طرح شاہ رخ مرزا
بصد متانت و تمکین و عزت و اجلال
اور اُن کے پاس کھڑے ہیں کے فخر دیں مرزا
بہ پیش تخت شہنشاہ دیں بریں منوال

۱؎ قریبی اُن لوگوں کو کہتے ہیں، جو خاندان شاہی سے ہوتے تھے، یا جن کو تخت کے پاس تک جانے کی اجازت ہوتی تھی۔

جناب میرزا فرخندہ شاہ عالی قدر
کہ ان پہ چشم عنایت حضور کی ہے کمال

کھڑے ہوئے ہیں وزیر الممالک اور بخشی
ہر ایک اپنی جگہ شاد۔ غم سے فارغ بال

حکیم اور اراکین سلطنت سارے
کھڑے ہوئے ہیں قرینے سے سب یمین و شمال

کھڑے ہوئے ہیں مؤدب کہیں نظارت خاں
کہیں ہیں شیدی زمرد کہیں کھڑے ہیں بلال

خواص اپنے قرینے سے سب کھڑے ہیں لئے
اوگالدان کوئی مورچھل کوئی رومال

ہیں ایک سمت کھڑے خوشنویس اور شاعر
کھڑے ہوئے ہیں نجومی کہیں کہیں۔ رمال

نجومیوں میں جو ہندو ہیں ان کا حال ہے یہ
بڑھا بڑھا کے قدم۔ ہاتھ کو نکال نکال

وہ اپنی بولی میں آشیرباد دیتے ہیں
کہ رکھے جلوہ یہ قائم سدا سری گوپال

اسی طرح سے غلامی میں اس کے حاضر ہیں
کہاں تلک کہوں ہر ایک فن کے اہل کمال

بجے ہے ایک طرف بین ایک طرف قانون
کوئی رباب بجاتا ہے اور کوئی کھڑتال

ہر ایک اپنی جگہ گاتے ناچتے ہیں کھڑے
چمک چمک کے خوشی سے طوائف و قوال

عجب طرح کا سماں بندھ رہا ہے کیا کہئے
کہیں ہیں بھانڈ کہیں بھگتے کہیں نقال

یہاں تلک کہ جو ہیں تخت پر بنے طاؤس
خوشی سے ناچتے ہیں وہ بھی کھول کر پر بال

قلار اپنی جگہ اس ہجوم خلقت میں
لئے کھڑے ہیں پے اہتمام چھڑیاں لال

ہر ایک کا ہوتا ہے آداب گاہ سے مجرا
بہ پیش گاہ شہنشاہ صاحب اقبال

کھڑے ہوئے ہیں وہاں چوبدار اور نقیب
خوشی سے اپنی جریب اور چھڑی سنبھال سنبھال

پکارتے ہیں کہ آداب سے کرو مجرا
جہاں پناہ سلامت کا ہو فزوں اقبال

ادھر سے گذرے ہے ملکوں کی پیشکش اور نذر
ادھر سے ہوتے ہیں خلعت علیٰ فراخور حال

کہیں کھڑی ہیں سلامی کے واسطے توپیں
کہیں کھڑی ہیں شتر نال اور کہیں گھڑ نال

اور اس کے صحن میں سب فیل کوہ پیکر بھی
ہوئے ہیں مجرے کو حاضر گلا لگا کر ڈھال

اسی طرح سے جو حاضر ہیں اسپ خوش رفتار
بھرے ہوئے ہیں سُنا۔ موتیوں سے ان کے ایال

اس کے بعد نہروں کا ذکر کر کے قصیدے کو دعا پر اس طرح ختم کیا ہے۔

الٰہی ہو دیں دعائیں یہ سب قبول مری   بحق سورۂ یٰسین و سورۂ انفال

ان کے کلام پر ریویو | حکیم صاحب کے کلام پر ریویو کرنا مجھ جیسے کا کام نہیں ہے میں، نہ شاعر، نہ سخن سنج، نہ سخن فہم، مضمون لکھنا شروع کر دیا ہے۔ اس لئے کلام کے متعلق بھی کچھ کہنا ہی پڑے گا اور تو اور آزاد مرحوم نے تسلیم کیا ہے کہ یہ ان لوگوں میں ہیں، جنھوں نے اردو زبان کو مانجھا اور اس میں روانی پیدا کی ہے۔ غزل صفائی کلام، شوخی مضامین اور حسن محاورہ سے پھولوں کی ایک چھڑی ہوتی تھی۔ اور زبان گویا لطافت اور ظرافت کی پھلجھڑی۔ مجھے آزاد مرحوم کے اس آخری جملے سے اتفاق نہیں ہے میرے خیال میں حکیم صاحب میں ظرافت کا مادہ تھا ہی نہیں۔ البتہ شعر میں محاورہ ایسا بٹھاتے تھے جیسے انگوٹھی میں نگینہ۔ کلام میں صفائی ہے اور مضمون خوب پیدا کئے ہیں۔

مرزا قادر بخش صابرؔ حکیم صاحب کے متعلق فرماتے ہیں کہ ان کا کلام صنائع لفظی سے آراستہ ہے۔ غزل میں محاورہ اور شستگی زبان کا بہت خیال رکھا ہے یہ بالکل سچی رائے ہے۔ اور ان کا کلام دیکھ کر آپ خود اس کا اندازہ کر لیں گے۔

رعایت لفظی | غدر سے پہلے دہلی والوں پر بھی لکھنؤ کا کچھ رنگ چڑھ گیا تھا اور رعایت لفظی ان کے کلام میں بھی داخل ہو گئی تھی۔ ذوقؔ کا کلام تو از اول تا آخر، ان رعایتوں سے بھرا پڑا ہے۔ البتہ غالب اس رنگ کو برا سمجھتے تھے۔ مگر وہ بھی اس ہوا سے نہ بچ سکے اور "ہیہات کیوں نہ ٹوٹ گئے پیرزن کے پاؤں" لکھ ہی گئے۔ حکیم صاحب کے

پہلے دیوان میں یہ رنگ موجود ہے مگر ایسا ہے کہ بُرا نہیں معلوم ہوتا۔ دوسرے دیوان میں بھی رعایت لفظی کہیں کہیں برت گئے ہیں۔

اس نے زخموں پہ کی نمک پاشی　　ہم سے حق نمک ادا نہ ہوا

خدا کے واسطے دیکھو تو یہ کیا کج ادائی ہے
سوال بوسہ پہ کہتے ہو میں سیدھی سناؤں گا

سیدھی سنانا یا سیدھیاں سنانا گالی دینے اور بُرا بھلا کہنے کے معنوں میں آتا ہے

جام گل، بادۂ عشرت سے جو لبریز ہے آج
چہچہا کرتی ہے، بلبل کو نشہ تیز ہے آج

بڑا خوب صورت مطلع ہے۔ ایک ایک لفظ ایسا جایا ہے کہ اپنی جگہ سے ہل نہیں سکتا۔ عام طور سے بلبل کا چہچہانا کہتے ہیں لیکن جو لوگ جانوروں کے شوقین ہیں۔ ان کے محاورے میں جب جانور بولنا شروع کرتا ہے اور تھوڑا تھوڑا بول کر چپکا ہو جاتا ہے اس کو ریز کرنا اور جب مسلسل بولے جاتا ہے تو اس کو چہچہا کرنا کہتے ہیں۔ ہد ہد کا ایک شعر ہے

جو آکے ریز کرے میرے آگے موسیقار　　تو اس کے کان مروڑوں کہ بے شمار کردوں

حکیم صاحب کے شعر میں ریز کے مقابلہ میں چہچہا موجود ہے مگر یہ رعایت لفظی اس طرح استعمال کر گئے ہیں کہ ذرا غور سے سمجھ میں آتی ہے۔

ہاتھ کو پہلے تو اپنے کھینچ لے　　پھر جدھر چاہے تو لمبے پیر کر

آتش نے بھی اس مضمون کو لیا ہے۔ مگر یہ لطف پیدا نہ کر سکے کہتے ہیں۔

ہے سزاوار اہل دولت سے فقیروں کا غرور
ہاتھ کو جو کھینچ لے گا پاؤں کو پھیلائے گا

شعر کے اچھے ہونے میں شک نہیں، مگر جدھر چاہے" کا زور نہیں آیا ہے۔ حکیم صاحب نے دو محاوروں کو ایک شعر میں اس خوبی سے جمع کیا ہے کہ تعریف نہیں ہو سکتی۔ اہل قناعت کی بڑی سچی تصویر ہے۔
اسی غزل میں ایک اور شعر کہا ہے۔ صبر کی بہترین تلقین ہے۔

قافلے والوں سے کہدو۔ تم چلو ہم بھی آتے ہیں کوئی دم ٹھیر کر

آئینہ صاف دھوکے کی ٹٹی ہے، دیکھنا باطن میں کوئی اس کے کدورت سے بھرا نہیں

آئینے کی رعایت سے صاف۔ ٹٹی۔ دیکھنا۔ کدورت غرض نئی لفظ استعمال کر گئے ہیں۔ ٹٹی کا آئینہ پتلے آئینے کو کہتے ہیں۔

قصۂ بے سرو پائی کو مرے سُن کے کہا
بات وہ کہئے کہ جس بات کا ہو کچھ سر پاؤں

دوسرا مصرعہ لاجواب ہے؛ پورے کا پورا محاورہ آگیا ہے مگر پہلے مصرع کی بے سرو پائی نے شعر کو بدمزہ کر دیا ہے ایک مکھیوں بھری غزل شاہ نصیر کی بھی ہے۔ حکیم صاحب نے بھی مکھیاں ماری ہیں۔ مفت کی دماغ سوزی ہے۔ حاصل کچھ نہیں۔ کہتے ہیں۔

دور بیں دیکھ کے کہتے ہیں زحل کی مکھی ہے حقیقت میں وہ پیغام اجل کی مکھی
کیا عجب عیش تراشن کے کلام شیریں رُوح فرہاد بنے تیری غزل کی مکھی

شیریں و فرہاد کو کسی نہ کسی طرح ملا دیا۔
محاورہ بندی یہ میں بھی مانتا ہوں کہ حکیم صاحب محاورے کے اُستاد

تھے۔ بعض جگہ تو محاورہ اس طرح باندھ گئے ہیں کہ بے اختیار تعریف کرنے کو جی چاہتا ہے۔ زبان کی روانی اور اس میں محاورے کی نشست بس یہ معلوم ہوتا ہے کہ چاندنی رات میں دریا کے پانی میں برف کے ٹکڑے بہے چلے جاتے ہیں۔ کوئی ان کا دیوان یاد کرلے تو محاوروں کا تو حافظ ہی ہوجائے غور سے پڑھئے اور داد دیجئے۔

عشق اور مشک چھپائے سے کہیں چھپتا ہے
درد دل لاکھ چھپایا، یہ چھپایا نہ گیا

خدا کے واسطے کر ضبط نالہ اے بلبل — یہ زخم دل مرے جائیں کہیں نہ کھل پھر کے

طبیعت آپ کی رہتی ہے کچھ اُداس اُداس — خدا کے واسطے بہلاؤ عیش چل پھر کے

سبحان اللہ کیا مقطع ہے کس کا منہ ہے جو اس کی تعریف کرسکے۔

طلب وہ کرتے تھے دل تم سے عیش یہ تو کہو
کہ اس معاملے میں تم سے اُن سے کیا ٹھیری

ایک غزل کی غزل محاوروں سے بھری پڑی ہے۔ مگر حکیم جی عاشق بھی عجیب تھے اور ان کا معشوق بھی عجیب تھا یہ شاعروں کا معشوق نہیں ہے بازاری لوگوں کا معشوق ہے۔

کہا جو رحم مرے حال پر ذرا کھاؤ — تو ہنس کے بولے کہ چلتے بنو۔ ہوا کھاؤ
کہو یہ حضرت ناصح سے قبلہ و کعبہ — خدا کے واسطے جاؤ۔ نہ سر مرا کھاؤ
جو اپنی شدت غم ان سے ہم لگے کہنے — تو بولے ہو کے خفا۔ جاؤ سنکھیا کھاؤ

حصول ان کی ملاقات سے نہیں کچھ اور مگر یہ بات کہ ہاں گالیاں سدا کھاؤ
بتاؤ تو سہی دبتے ہو اس سے کیوں اتنا بلا دبے ہے، کسی کا نہ جب دیا کھاؤ

ایک اور غزل میں بھی محاوروں کو خوب ٹھایا ہے۔ فرماتے ہیں۔

کہہ دو یہ حضرت واعظ سے کہ تم کام اپنا کر جاؤ۔ حضرت
بھوے لبسرے تو کبھی عیش کو بھی بزم میں اپنی بلاؤ۔ حضرت

شب خواب میں معاملہ اس مہ جبیں سے تھا
وہ پٹ گیا۔ جو اپنے نہ وہم و گماں میں تھا

معاملہ پٹنا دوکانداروں کی اصطلاح میں سودا بن جانے کو کہتے ہیں۔ ذرا دیکھنا کیا الٹ پھیر ہے۔

عیش زلف اس رخ پہ چھٹتی ہے تو ہو جاتی ہے شام
اور اُٹھتی ہے تو ہو جاتا ہے تڑکا نور کا

نور کا تڑکا۔ محاورے میں صبح صادق کو کہتے ہیں۔

اسی مضمون کو ایک دوسری جگہ باندھا ہے اور واقعی لاجواب باندھا ہے۔ فرماتے ہیں۔

ہے زلف سے مکھڑے پہ طلسمات کا عالم
گر چھوڑیں تو ہو شام، اٹھا دیں تو سحر ہو

ایک شعر سناتا ہوں تعریف کیجئے گا۔ محاورے کا محاورہ ایک مصرعہ میں آگیا ہے۔

کیا جب کو ترک اس سے پھر کام کیا کہ چھوڑے ہوئے گاؤں کا نام کیا

نسیم نے بھی اسی مضمون کا ایک شعر کہا۔ مگر

بے ادب شرط منہ نہ کھلوائیں

گھر بار سے لیا فقیر کو کام　　کیا کیجئے چھوڑے گاؤں کا نام

بس دھواں دیگا بکھیرا اس چرخ کج رفتار کا
چل گیا چھرا کوئی گر آہِ آتش بار کا

چھرا چلنے کا محاورہ حکیم صاحب نے بہت جگہ باندھا ہے۔ بندوق نکل آئی تھی۔ تیر کمان بے کار ہو گئے تھے پھر یہ کیوں آہ کے تیر کی بجائے، آہ کے چھرے نہ چلائیں۔

نہ رہا ایک سال کسی کا روپ　　کبھی ہے چھاؤں اور کبھی ہے دھوپ

اچھی دھوپ چھاؤں ہے۔

ایک اور محاورہ سنئے۔ عامیانہ ہے مگر بڑے مزے کا ہے۔

وے کے دل منہ نکیں ہیں جس تس کا　　نہ الٰہی کسی کو بے بس کر

عیش، یہ عاشقی ہے کھیل نہیں　　جو کرے کام ہو کے چوکس کر

تجارت پیشہ اشخاص کو آخری مصرع سے بہتر کوئی نصیحت نہیں ہو سکتی۔

دیکھ حالت ترے بیمارِ غمِ ہجراں کی　　رہ گئے دانتوں میں انگلی کو مسیحا لیکر

"کو" بھرتی کا لفظ ہے اصل محاورہ دانتوں میں انگلی لینا ہے۔

اُستاد ذوق نے بھی اسی مضمون کو اسی زمین میں خوب باندھا ہے۔

تیرا بیمار نہ سنبھلا جو سنبھالا لے کر　　چپکے ہی بیٹھ رہے دم کو مسیحا لے کر

اے عندلیب دعویٰ بیہودہ پر کہیں　　ایک آدھ گل کا منہ نہ مسل دیں چمن میں ہم

ایک جگہ اور اسی طرح گل کا مُنہ مسلا ہے۔ کہتے ہیں۔

ہمسری کی دہن یار سے گر غنچے نے تو ابھی باد صبا ڈالے گی مُنہ اس کا مسل

مگر یہ کچھ اچھی طرح منہ نہیں مسلا گیا۔ پہلا شعر لاجواب ہے۔ بندش بھی خوب ہے اور "ایک آدھ" کے الفاظ نے شعر میں جان ڈال دی ہے۔

ایک خاص دلّی کا اور محاورہ سنئے۔ بولتے سب ہیں لکھتا کوئی بھی نہیں

دم میں اُس کے کہیں نہ آجانا کیوں؟ وہ دل لیکے پھر دوال نہیں

اُس زمانہ میں 'کیوں' لفظ 'کیونکہ' کی بجائے اکثر استعمال ہوتا تھا۔ یہاں 'کیوں' نے استفہامیہ ہو کر ایک عجیب لطف پیدا کر دیا ہے۔ یار دوست کہتے ہیں اجی حضرت کہیں اس کے دم میں آکر دل نہ دے بیٹھنا یہ پوچھتے ہیں۔ کیوں وہ جواب دیتے ہیں، وہ دل لیکے پھر دیا نہیں کرتے۔

ایک غزل کی غزل مرصع ہے۔ کیا بلحاظ محاورے کے اور کیا بلحاظ زبان کے۔

جان ہم اپنی دے بیٹھے ہیں سر ہتیلی پہ لئے بیٹھے ہیں

بول سکتے نہیں اُن کے ڈر سے ہونٹ ہم اپنے سئے بیٹھے ہیں

مقطع کہا ہے

عیش، ہم کوچۂ قاتل ہیں فقط سرفروشی کے لئے بیٹھے ہیں

لفظ "فقط" کو دیکھئے۔ اس نے شعر کو کہاں سے کہاں پہنچا دیا ہے۔

گیا تھا میں تو انھیں درد دل سنانے کو
لگے سُنانے وہ اُلٹی مجھے ہی، لو باتیں

"لو" کا لفظ کیا پیارا آیا ہے۔ صرف ایک لفظ سے عاشق کی کیا کیا گھبراہٹ اور پریشانی ظاہر کر دی ہے۔

چھیڑ دے پھر ہاں ذرا او کاوش مژگانِ یار
زخم دل کچھ کچھ ہمارے آج بھر سے آئے ہیں

صرف اہل زبان ہی سمجھ سکتے ہیں کہ "کچھ کچھ" اور "سے" نے شعر کو کیا سے کیا کر دیا ہے۔ ہاں کیوں نہ ہو۔ اُستاد کا شعر ہے۔

ہے تیرے مریض غم ہجراں کی یہ حالت
مانگیں ہیں دعا سب۔ یہ اِدھر ہو کہ اُدھر ہو

ہائے کیا بیکسی کا عالم ہے اور کیا بُرا وقت ہے۔

تم ایک مجنوں کو پیٹتے ہو عشق میں "عیش" ہزاروں مجنوں سے رو بیٹھے اپنی جانوں کو

ایک شعر صرف محاورہ کے لئے کہا ہے۔ بندش بہت کمزور ہے۔

ہے جو یہ گھٹتی کا پہرا قدر سب کی گھٹ گئی
نقص اس باعث۔ فن ہر اہل فن میں آگیا

یہ شعر بھی ایسا ہی پھس پھسا ہے۔

اک عیب تو آئینے میں ہے پردہ دری کا
اور دوسرے لپکا ہے پریشاں نظری کا

دیکھنے والے ہیں اپنے ہی جہاں ہیں وہ بھی
قیس و فرہاد جو مشہور ہیں دیوانے دو

پیری مریدی کی اصطلاح ہیں "دیکھنے والے" مریدوں یا عقیدتمندوں کو کہتے ہیں۔

چاک دل سیویگا کیا تو آکے میرا بخیہ گر ڈھونڈنا اک اور پڑیگا بخیہ گر تیرے لئے
کان پر تیرے نہیں جوں بھی چلی ہے آج تک جان سے اپنے گئے لاکھوں گزر تیرے لئے

پہلا شعر تو ایسا ہے کہ واہ واہ۔ یہ نہیں کہا کہ میں نوچ کھسوٹ کر تیرے کپڑوں کی دھجیاں کر دوں گا۔ صرف یہ کہہ کر اشارہ کر دیا۔ کہ خود آپ کے لئے بخیہ گر بلوانا پڑے گا۔ دوسرے شعر میں دو محاورے آگئے ہیں، مگر پہلا محاورہ تو ایسا ہے کہ لکھنے سے اس کا نہ لکھنا ہی بہتر تھا۔ اسی طرح ایک قطعے میں کئی محاورے لائے ہیں۔ مگر بس ٹھوسم ٹھاس ہے۔

معلوم ہیں سب ان کے فریب ایسے وہ چھوٹے باتیں کہو کس روز بنایا نہیں کرتے
دکھلاتے نہیں باغ، بھلا سبزہ کس دن کب ہاتھ پہ سرسوں وہ جمایا نہیں کرتے

فارسی کا اثر | حکیم صاحب کے بعض شعر ایسے معلوم ہوتے ہیں گویا کسی فارسی شعر یا ضرب المثل کا ترجمہ کر دیا ہے۔ ایسا کیا تو کیا بُرا کیا۔ خدا کرے ایسے بہت سے لوگ پیدا ہوں، جو دوسری زبانوں کے خیالات سے اُردو کا مال خانہ بھر دیں۔ جب ہم ہر زبان کا لفظ اُردو میں لینے کو موجود ہیں تو پھر ان زبانوں کے خیالات لینے میں کیوں شرمائیں۔ لوگ اس کو چوری کہتے ہیں۔ میں کہتا ہوں۔ مال موذی نصیب غازی۔ تو ہاں اب حکیم صاحب کی چوری دیکھئے۔

میرے بہکانے کو بدلے لاکھ روپ اس نے مگر
میں نے پہچانا اسے وہ جس برن میں آگیا

فارسی کا شعر ہے

بہر رنگے کہ خواہی جامہ برپوش　　من انداز قدرت را می شناسم

یقیناً عیش کا شعر اس فارسی کے شعر سے بڑھا ہوا ہے۔ اس میں معشوق کی شناخت کا دار و مدار محض قد پر رکھا ہے، اور کیوں جی اگر وہ اونچی اڑی جوتا پہن کر آجائے تو یہ ایرانی صاحب اس کو کیونکر پہچانیں گے۔ حکیم صاحب کے ہاں روپ اور برن کے الفاظ نے مضمون کو بہت وسعت دیدی ہے پہچاننا دل سے ہوتا ہے نہ ظاہری قد و قامت سے۔

نکال منہ سے نہ تو اپنے دیکھ فال خراب　　نہ کیونکہ کرتی ہے فالِ خراب حال خراب

دوسرا مصرعہ "کہ چوں فال بد آورد حال بد" کا لفظی ترجمہ ہے۔

گر نصیب اچھے ہوں تو پھر خاک بھی ہو جائے زر
اور بُرے ہو دیں تو حلوا بھی ہو، گارا ہاتھ میں

سعدیؒ کے اس شعر کی وجہ سے یہ مضمون نصیب ہوا۔

بخت گر یاور شود سندان بدندان بشکند　　ور شود برگشتہ پالودہ، دنداں بشکند

مگر حکیم صاحب کو حلوے اور گارے کی مناسبت خوب سوجھی ہاں شکل تو دونوں کی ایک ہے۔ حلوا ہے کیا۔ روے، کھانڈ اور گھی کا گارا ہے۔

سچ ہے منہ سے نکلی اور کوٹھوں چڑھی
چھپ سکے کیونکر بھلا محفل کی بات

محاورے کی چاشنی دیگر حافظ کے مصرعے کا ترجمہ کر دیا ہے۔ ع

نہاں کے ماند آں رازے کزو سازند محفلہا

برائے کہئے جوانان رند مشرب کو معاف رکھئے انھیں. عالم شباب ہے یہ

سعدیؔ کا مشہور فقرہ ہے "در ایام جوانی چنانکہ افتد دانی.

معاف رکھئے۔ معاف دارید کا ترجمہ ہے۔ اب معاف کیجئے بولتے ہیں

کون پہچانے دلی کو جز ولی اہل دل جانے ہے اہل دل کی بات

فارسی کی مثل "دل را دلی می شناسد" کا صاف ترجمہ ہے۔

بہر استقبال آتا ہے قبول حق سنا جب دعا جاتی ہے یہاں سے بلبلاتی خلق کی

شیخ سعدی سے مضمون لیا ہے۔

بترس از آہ مظلوماں کہ ہنگام دعا کردن اجابت از درحق بہر استقبال می آید

حکیم صاحب کا پہلا مصرعہ بہت کمزور ہے۔ دوسرا مصرعہ لاجواب ہے اور میرے سے پوچھو تو شیخ سعدی کے پہلے مصرعے سے زیادہ زوردار ہے۔ راستے سے بھی کوئی بلبلاتا ہوا جاتا ہے، تو گھر والے دیکھنے نکل آتے ہیں۔ اگر دعا بلبلاتی ہوئی خدا کی درگاہ میں جائے تو کیا تعجب ہے کہ قبولیت استقبال کے لئے پردے سے باہر نکل آئے۔ شیخ کے ہاں یہ پہلو بالکل نہیں ہے، وہ ہر بات میں لوگوں کو ڈراتے ہیں۔ اس شعر میں بھی "ڈرا دیا"۔

جو نجی پیشہ ہیں وہ بانٹ کے کھاتے ہیں سدا ان کو ملتا ہے اگر نان جویں کا ٹکڑا

اس کا بھی شیخ سعدی کے شعر سے مضمون لیا ہے۔

نیم نانے گر خورد مردِ خدا بذلِ درویشاں کند نیمے دگر

رُخ اس کا دیکھ کے زلفوں میں دل لگا کہنے
کہ جس کو کہتے ہیں "کالبدر فی الدجا" یہ ہے
نشاط نے اس مضمون کو بڑی خوبصورتی سے ادا کیا ہے فرماتے ہیں
در زلف روئے ساقی و در شیشہ عکس مے
کالبدر فی الدجیۃ والبرق فی الغمام

ایلچی کو کہیں سنا ہے زوال وہاں ضرر پہلے نامہ بر کو ہے
فارسی کی مشہور مثل۔ ایلچی را چہ زوال؟

اطلاع و آگہی کے ایک ہی معنی ہیں عیش کہتے ہیں عربی زباں میں آگہی کو اطلاع
میں اس شعر کے معنی نہیں سمجھا۔ ہاں اس میں قاآنی کے ایک شعر کی سی اُلٹ پھیر ضرور ہے۔

بلا بلفظ عرب امتحاں بود یعنے کہ بندہ را بہ بلا امتحاں کند داور

ہاتھ آئے گر غبار مجھے اس کی راہ کا سرمہ بناؤں قوت نور نگاہ کا
یہ مضمون فارسی کے اس شعر سے انھوں نے بھی لیا ہے۔ اور بہت سے شعرا نے بھی لیا ہے۔

آرزو دارم کہ خاک آں قدم توتیائے چشم سازم دم بدم

ہاں حکیم صاحب نے "قوت نورِ نگاہ" کے الفاظ سے ظاہر کر دیا ہے کہ یہ کسی حکیم کا شعر ہے کسی عطائی کا نہیں ہے۔

ان کے اور شعرائے اُردو کے ہم معنی اشعار

بعض جگہ عیش کے خیالات اردو کے دوسرے شاعروں سے جا لڑے ہیں۔ تھوڑے سے نقل کئے دیتا ہوں۔

اے شمع صبح ہوتی ہے۔ روتی ہے کس لئے — تھوڑی سی رہ گئی ہے اسے بھی گزار دے

اُستاد ذوق فرماتے ہیں:

اے شمع تیری عمرِ طبعی ہے ایک رات — ہنس کر گزار یا اسے روکر گزار دے

"ذوق" کے ہاں "عمرِ طبعی" نے بڑا ثقل پیدا کر دیا ہے۔ عیش کا شعر یقیناً بہت بڑھا ہوا ہے۔ کیا نرم نرم الفاظ میں شمع کو سمجھایا ہے۔

اکڑنا سرو کا ہم دیکھ لیویں گے، اکڑنے دو
کبھی تو آئے گا گلشن میں وہ بھی خوش خرام آخر

اسی مضمون کو میر صاحب نے دوسرے پہلو سے باندھا ہے اور کمال کر دیا ہے۔

سرو و شمشاد چمن میں قد کشی کی ہے نزاع
تم ذرا واں چل کھڑے ہو، فیصلہ ہو جائے گا

خیر میر صاحب تو میر صاحب ہی ہیں، عیش کا شعر بھی بُرا نہیں۔

شغل کچھ چاہیئے بہلانے کی خاطر دل کے
نہیں گر وصل کی امید چلو یاس تو ہے

(غالب) چھیڑ خوباں سے چلی جائے اسد گر نہیں وصل تو حسرت ہی سہی

مار دی وہ دھول صبا نے کہ ہوا بس تڑ کا
ہمسری رخ سے جو اس کے گل شاداب نے کی

(ذوق) مقابل اس رخ روشن کے شمع گر ہو جائے
صبا وہ دھول لگائے کہ بس سحر ہو جائے

حکیم صاحب کے ہاں پورا محاورہ بندھا ہے ذوق نے محاورے میں ذرا تصرف کیا ہے۔ مگر اچھا کیا ہے۔ عامیانہ محاورے سے بھلے آدمیوں کا محاورہ ہو گیا۔

کسی اور کا بھی ایک شعر اسی مضمون کا ہے۔ کہتا ہے:-

یاں جو برگ گل خورشید کا کھڑ کا ہو جائے
دھول دستار فلک پر لگے تڑ کا ہو جائے

بھولا کہتے نہیں اس کو یہ مثل ہے مشہور شام کو آئے اگر کوئی سحر کا نکلا

(غالب) اس کو بھولا نہ چاہیئے کہنا صبح جو جائے اور آئے شام

عیش نے پورے محاورے کو لانے کی کوشش کی ہے۔ اس لئے شعر کی تکمیل بے ضرورت الفاظ بڑھائے بغیر نہ ہو سکی، غالبؔ نے اس کی پرواہ نہیں کی۔ پورا محاورہ نہیں آیا۔ نہ آئے۔ شعر تو مزیدار ہو گیا۔

عظمت اللہ خاں مرحوم اس بارے میں غالب سے بھی کچھ آگے بڑھ گئے۔ انھوں نے پورے محاورے کو قلابازی کھلا دی۔ کہتے ہیں۔

جسے ہے شوق جہاں میں تماش بینی کا
خبر وہ صبح کی لاتا ہے شام کا نکلا

اعتبار اس کے ہو کیا قول و قسم کا جو شخص
ابھی دم بھر میں کہئے "ہاں" ابھی دم بھر میں نہیں
(داغ) آپ کے لطف و عنایت کا بھروسہ کیا ہو
کہ گھڑی بھر میں اگر "ہے" تو گھڑی بھر میں "نہیں"

انصاف کی بات ہے کہ حکیم صاحب کا شعر بہت بڑھا ہوا ہے۔ دوسرا مصرعہ تو لاجواب ہے۔

کمال کی ہے یہاں تک کساد بازاری پھرے ہیں در بدر اصحاب کمال خراب
(ذوق) یوں پھریں اہل کمال آشفتہ حال افسوس ہے
اے کمال افسوس ہے، تجھ پر کمال افسوس ہے

واقعی کمال کا شعر ہے۔

ہے زبان خلق، نقارہ خدائے پاک کا منہ سے نکلی بات کب جاتی ہے خالی خلق کی
(ذوق) بجا کہے جسے عالم، اُسے بجا سمجھو
زبان خلق کو نقارۂ خدا سمجھو

ذوق کے ہاں پورا محاورہ آگیا ہے۔ حکیم صاحب نے تصرف کیا ہے۔ ذوق کے ہاں رعایت لفظی نے شعر کو بدمزہ کر دیا ہے۔ عیش کا

شعر اس کمزوری سے پاک ہے۔ ذوق کا شعر ایک رخا ہے "بجا" کا پہلو نکلتا ہے۔ "بیجا" کا پہلو گم ہے۔ عیش کے ہاں دونوں پہلو موجود ہیں۔

میں 'کی گردن پر چھری' یوں کہے خورشید فلک
سامنے میرے۔ رُخ یار کا ہمسر میں ہوں

تعقید اور بہت بری تعقید ہے۔ پڑھنے سے اُلجھن ہوتی ہے۔ اس کے مقابلہ میں ذوق کا شعر ملاحظہ ہو:۔

وہ کہے کون ہے قربان مری چتون پر
میں کہوں 'میں' تو کہے 'میں' کی چھری گردن پر

کس خوبصورتی سے عاشق و معشوق کے سوال و جواب میں محاورہ برتے گئے ہیں۔

آدمی کو شکل و صورت سے نہ کہئے آدمی آدمی جب آدمی میں آدمیت ہو تو ہو

اس شعر میں بھی بہت بری تعقید ہے۔ اسی مضمون میں ذوق کا شعر بھی سُن لیجئے۔

آدمیت سے ہے بالا آدمی کا مرتبہ
پست ہمت یہ نہ ہو اور پست قامت ہو تو ہو

کلام میں روانی | حکیم صاحب کے کلام میں روانی غضب کی ہے معلوم ہوتا ہے کہ ایک دریا اُمنڈا چلا آتا ہے۔ بہت سے نمونہ آپ پہلے دیکھ چکے چند شعر اور لکھتا ہوں۔ ملاحظہ ہوں۔

عاشق جسے کہتے ہیں وہ پیدا نہیں ہوتا
اور ہوئے بھی بالفرض تو مجھ سا نہیں ہوتا

پہلے ایک کلیہ قائم کیا۔ اس کے بعد قطع حجت کے لئے استثنا، قائم کیا۔ اور اس مستثنیٰ کے مستثنیٰ خود بن گئے۔

میں ہوں گو سخت جاں، لیکن بوقت ذبح اے ہمدم
یہ ممکن ہے کہ میں، اور بازوے نازک دُکھاؤں گا

الفاظ کیا جمائے ہیں موتی، پرو دیے ہیں۔

پھاڑ دامن مرا تو خار بیاباں! اچھا
منع کرتا نہیں میں، شوق سے، ہاں ہاں، اچھا

لاجواب شعر ہے۔ کس مزے سے خار بیاباں کو دامن پھاڑنے کی اجازت دی ہے۔ الفاظ کی نشست ایسی ہے کہ تعریف نہیں ہو سکتی۔ کیوں نہ ہو اُستاد ہیں۔

دل "مرا صرف تمنا ہو چکا — لو جی، لو، بس یہ بھی جھگڑا ہو چکا
اک قدم وحشت میں اُٹھا تھا کہ عیش، — دیکھتے کیا ہیں کہ صحرا ہو چکا

دوسرا شعر کیا بلحاظ زبان اور کیا بلحاظ مضمون بے مثل ہے۔ ابھی قدم بھر نہ چلے تھے کہ صحرا ختم ہو گیا۔ خدا معلوم اگر دوسرا قدم رکھتے تو کون سے بر اعظم میں جا پڑتا۔

بس آب دانہ کی یہ خوبیاں ہیں سب ورنہ — کہاں میں اور کہاں دام اور کہاں صیاد

رند کا ایک شعر بالکل اس جیسا ہے۔

دکھایا کنج قفس مجھ کو آب و دانہ نے
وگرنہ دام کہاں، میں کہاں، کہاں صیاد

حکیم صاحب کا شعر، میری رائے میں، رند سے بڑھا ہوا ہے۔ رند نے

"کُنجِ قفس" کے الفاظ سے مصیبت کو محدود کر دیا ہے۔ ان کے شعر میں" یہ خوبیاں ہیں" ایسے وسیع الفاظ ہیں کہ سب مصیبتیں اس میں آگئیں۔

کیوں چھپائیں کیا اجارا ہے کسی کا ہم نشیں
دیدیا ہے اپنا دل اس بت کو ہاں ہاں دیکھکر

توبہ تو کی ہے ہاتھ پہ واعظ کے ہاں مگر — ساقی پلادے مے تو کچھ انکار بھی نہیں
کس منہ سے ہم کریں گے بھلا یار کا گلہ — ہم کو تو عیش، شکوۂ اغیار بھی نہیں

پہلے شعر میں "ہاں" اور "مگر" کے الفاظ کو دیکھئے۔ کس طرح دل کی اُلجھن کو رفتہ رفتہ صاف کیا ہے۔ پہلے خیال آتا ہے کہ ہاں توبہ تو کی ہے، نہ پینی چاہیئے۔ پھر پلانے والے کا خیال آتا ہے۔ جھٹ شرط کر کے راضی ہو جاتے ہیں۔

دوسرا شعر تو ایسا ہے کہ ضرب المثل ہونے کے قابل ہے۔

زاہد نہ گڑگڑا، تجھے مے دیں تو کیونکر دیں
قسمت تری۔ اجازت پیرِ مغاں نہیں

سُبحان اللہ۔ وَاَمَّا السَّائِلَ فَلَا تَنْھَرْ (اور جو مانگتا ہے اُس کو نہ جھڑک) پر کس خوبی سے عمل کیا ہے۔ بس یہ سمجھ لو کہ کوئی فقیر خزانۂ سرکاری پر جاتا ہے۔ گڑگڑا۔ گڑگڑا کر پیسہ مانگتا ہے مہتمم کو رحم آتا ہے۔ لیکن کیا کریں خزانے میں سے کوڑی نہیں دے سکتے۔ کہتے ہیں، بھئی، کیا کریں ہم تو تھیلی کی تھیلی اُٹھا کر دیدیتے۔ سرکار کا حکم نہیں ہے۔ جا تیری قسمت۔ شعر میں الفاظ کیا بٹھائے ہیں موتی جڑ دیئے ہیں۔ ایک لفظ بیکار نہیں ہے۔ اور کوئی لفظ ایسا نہیں جو اپنی جگہ سے ہل سکے۔ صرف یہ ایک شعر حکیم صاحب کی

اُستادی کو منوانے کے لئے کافی ہے۔

سب عشق میں کہتے ترے، کیا کیا نہیں ہم کو
کہتے ہیں، کہیں، اس کی بھی پروا نہیں ہم کو

مضمون معمولی ہے، مگر بندش نے اس مطلع کو مطلع خورشید بنا دیا ہے۔

ہم کہے دیتے ہیں، تیر نگہ قاتل سے — اک ذرا بچ کے چلے تیر قضا سے کہدو
عیش جو ہو سو ہو، اب حال دل زار اپنا — وہ سنے یا نہ سنے تم تو بلا سے کہہ دو

"وہ سنے یا نہ سنے تم تو بلا سے کہہ دو" ایسا مصرعہ ہے کہ بڑے بڑے اُستادوں کو بھی نصیب نہیں ہوتا۔ معلوم ہوتا ہے جیسے کوئی باتیں کر رہا ہے۔ اس مصرعے کی جتنی تعریف کی جائے کم ہے۔

اُٹھایا ہاتھ جو عشق بتاں سے تم نے تو پھر — بسر کروگے بھلا عیش، عمر کیا کر کے

گویا دنیا میں بس یہی کام تھا اور اسی کام کے لئے آئے تھے۔ یہ نہ ہو تو جینا بے کار ہے۔

منع بکنے سے نہ کر، ناصح ناداں کو عیش،
اور گر کچھ نہیں، یہ ہی سہی، بکواس تو ہے

ناصح کی بکواس کو سب روکتے ہیں۔ حکیم صاحب کہتے ہیں۔ بکنے دو۔ تنہائی میں اس سے بھی دل بہلتا ہے۔ اس کی ماننے والے تو ہم کب ہیں چلو یونہی وقت کٹ جاتا ہے۔

حال دل ہم انھیں گر اپنا سنا دیویں گے — تو یہ لکھ رکھو کہ اُن کو بھی رُلا دیویں گے
دل کے دینے میں تو کچھ عذر نہیں بسم اللہ — لیجئے۔ اس کے عوض پر ہمیں کیا دیویں گے

ہاں صاحب معاملہ کی بات ہے۔ معاہدہ بغیر بدل کے پورا نہیں ہوتا۔

کچھ لو تو کچھ بھی دو۔

واعظ بیہودہ گو بکتا ہے، بکنے دو اُسے
وہ تو دیوانہ ہے تم اپنے رکھو کام سے کام

واعظ کی ایک رعایت اوپر کر چکے ہیں۔ یہ دوسری رعایت ہے۔ ارے میاں بکنے بھی دو۔ دیوانہ ہے۔ تم کو جو کچھ کرنا ہے۔ کئے جاؤ۔ سچ ہے

سنئے جو ہزار کچھ سنائے کیجئے وہی جو سمجھ میں آئے

جی ہاں۔ بس ان کی عاشقی دیوانہ پن کا کام نہیں ہے اور سب کام دیوانہ پن کے ہیں۔ جو نصیحت کرے وہ بھی دیوانہ اور جو سُنے وہ بھی دیوانہ۔ چلو چھٹی ہوئی۔ "اپنے کام سے کام رکھئے" کا محاورہ میر صاحب نے بھی باندھا ہے اور خوب باندھا ہے۔ فرماتے ہیں۔

بوسہ لے کر سرک گیا کل میں کچھ کہو۔ کام اپنے کام سے ہے

بخیہ گر اپنے گریبان کی تو خیر منا باز آ۔ دیکھ مرے چاک گریباں کو نہ چھیڑ
عیش انسان کو ہے حفظ مراتب لازم اس سے ہے ترک ادب، یار کے داماں کو نہ چھیڑ

شعر میں نے لکھ دیئے۔ تعریف آپ کر لیجئے۔

جو رات شمع کو پروانہ جل بجھا، چھو کر
تو شمع بولی۔ چلا تھا مجھے مُوا چھو کر

ذرا ردیف کو دیکھئے اور شعر کو دیکھئے، شمع کی پاکدامانی کو دیکھئے۔ اس کی شرمیلی زبان کو دیکھئے۔ کوئی بیسوا ہوتی تو صاف کہہ دیتی کہ ہاتھ ڈال کر چلا تھا۔ بچاری شمع نے شرماتے شرماتے "چھونے" کا لفظ استعمال کیا ہے۔ ایسے شعر کوئی کہنے لگے تو چلو بس اُستاد ہے۔ اس کی اُستادی

میں کون شک لا سکتا ہے۔

———N———

سئے گا مرا زخم دل چارہ گر کیا رہا ہی نہیں وہ سلانے کے قابل

سلانا خاص اہل زباں کا محاورہ ہے۔ عام طور سے سلوانا کہتے ہیں۔ اسی غزل کا ایک قطعہ ملاحظہ ہو۔ حکیم صاحب نے بس غضب ہی کر دیا ہے۔

کہیں حضرت دل کا کیا حال تم سے نہیں حال اُن کا سُنانے کے قابل
غرض ساتھ اپنے انھوں نے ہمیں بھی نہ رکھا کہیں آنے جانے کے قابل

یہ شعر وہ ہیں کہ پڑھئے اور مزے لیجئے۔ تعریف کی ضرورت نہیں۔ ایسے شعر تعریف سے مستغنی ہوتے ہیں۔ واہ حکیم جی واہ کیا کہنا ہے۔ خوب زبان پائی ہے۔ دل خوش ہوگیا۔

فارسی ترکیبیں

ان کے کلام میں جو روانی ہے وہ آپ نے ملاحظہ کر لی۔ اب دو چار شعر ایسے بھی پیش کرتا ہوں جن میں فارسی ترکیبوں سے انھوں نے کلام میں زور پیدا کر دیا۔

اک نظر اس کی عنایت کی محشر میں تو عیش
رشکِ صد طاعت زہاد ہو عصیاں میرا

———

کس کی چھاتی ہے کہ جو سامنے اس کے ٹھیرے
ہدفِ ناوکِ مژگان ستمگر ہیں ہوں

———

خرمنِ تاب و تواں کے واسطے اے ہمنشیں
غیرتِ صد برق اس کا مسکرانا ہوگیا

اپنی آہیں برق آتش ریز ہیں اور آنکھیں ابر طوفاں خیز ہیں
اے دل ان میٹھی نگاہوں پر نہ جا یہ نگاہیں مصلحت آمیز ہیں

رقیب کرتے ہیں باتیں سب اس کی بزم میں عیشؔ بس ایک ہوتے ہیں واں سر بسر در گلوے ہم

"ذوق" کی ایک مشہور غزل ہے، جس کا مطلع ہے۔

جو کھل کر اُن کا جوڑا بال آئیں سر سے پاؤں تک
بلائیں آکے لیں سو سو بلائیں سر سے پاؤں تک

"عیش" کی بھی اسی زمین میں ایک غزل ہے۔ فرماتے ہیں۔

جو چل کر اپنی وہ سج دھج دکھائیں سر سے پاؤں تک
تو اے فتنۂ محشر بلائیں سر سے پاؤں تک

بسان کاغذ آتش زدہ۔ یہ تفتہ جاں وہ ہیں
جلے پر بھی بہار اور ہی دکھائیں سر سے پاؤں تک

دوسرے شعر کے پہلے مصرعہ میں غالب کا رنگ آگیا ہے۔

انگریزی لفظ | کہیں کہیں انگریزی کے لفظ بھی باندھ گئے ہیں۔ کہتے ہیں۔

اس فرنگی بچہ سے میں نے جو بوسہ مانگا
ہاتھ پستول پر رکھ وہ لگا کہنے کہ ڈل ( )

کیوں نہ ہو، مجرم، کے شاگرد ہیں جنھوں نے "پستول فرانسیسی" چلایا ہے
ذرا ان شعروں کو دیکھئے، کیا مضمون ہے۔ کیا زبان ہے، اور کیا قافیہ ہے

کچھ اس روش سے ہوا ہے یہاں جلوس چمن کہ شاخ گل بھی ادب سے ہے پائے بوس چمن
شکست دینے کو فوج خزاں کو گلشن میں نہیں یہ غنچۂ گل، ہے یہ کارتوس چمن

نئے نئے الفاظ کے استعمال کا شوق | سچ فرمائیے گا، غنچۂ گل، کی تشبیہ کارتوس سے

کیسی خوبصورت دی ہے۔ انشاء اللہ خاں کا رنگ ہے۔ بات یہ ہے کہ حکیم صاحب کو نئے الفاظ استعمال کرنے کا بڑا شوق تھا۔ ملاحظہ ہو۔

اُچھل خزانے پہ اپنے نہ مثل فوارہ کرے گا دیکھ یہ تیرا تجھے اُچھال خراب

حکیم صاحب کے دھیان میں اُچھال کا قافیہ اس لیے آیا کہ دلی میں عورتیں جی متلانے کو اچھال کہتی ہیں اور حکیموں کے کانوں میں یہ لفظ اکثر پڑتا رہتا تھا۔

چشم گلگوں ہیں کہ انڈے ہیں یہ مستانے دو
یا بھرے ہیں مے گلرنگ کے پیمانے دو

انڈے سے ہوئے مستانوں سے شاید کسی نے چشم یار کو تشبیہ دی ہو تو دی ہو مجھے تو بالکل نئی معلوم ہوتی ہے۔

لگا کے اس بت غافل نے سرمہ آنکھوں میں چڑھائی اور بھی تیغ نگاہ سان پہ ہے
میں سمجھ بوجھ کا اے عیش اس کی قائل ہوں طبیعت آئی زلیخا کی کس جوان پہ ہے

ٹھیک ہے آدمی کو سمجھ بوجھ کر عاشق ہونا چاہئے۔ یہ نہیں کہ میاں مجنوں کی طرح کالی کلوٹی لیلی پر لوٹ ہو جائے

غزل کی غزل ملاحظہ فرمائیے کیا بے ڈھب قافئے برتے ہیں۔

باغ میں کرتی ہے عشق ذکر ارہ فاختہ پھر قطع ماسوا اللہ روز مرّہ فاختہ
ہے اسی کوکو پہ تجھ کو اپنے غرّہ فاختہ بلبل شیدا کے آگے جا نہ ٹرّا فاختہ
ہمسری کا اس کے گر دعویٰ کیا تو نے بس تا قیامت تجھ پہ ہوئے گا تبرا فاختہ

دیکھ بیارِ غم کو تیرے یہ بولے مسیح
فاتحہ پڑھ لو کڈھب ہے اس کی بیماری کی طرز

حکیم صاحب نے بڑا ہی کڈھب لفظ شعر میں ٹھونسا ہے۔ خود کسی مریض کے لئے کسی موقعے پر استعمال کیا ہوگا۔ گھر پہ آکر نظم کرلیا۔ خود مسیح بن گئے چلو شعر ہوگیا۔ ان کا ایک قصیدہ ہے۔

نسیم صبح نے دی آج وہ خوشی کی خبر
کہ غنچہ ہائے دل بستہ کھل گئے یکسر
رہا نہ نام کو عالم میں انقباض کا نام
یہ اب کے سال کھلا انبساط کا دفتر

آگے چل کر ایک سراپا دیا ہے۔ اس میں لکھتے ہیں۔

وہ لب کہ لعل جسے دیکھ ہونٹ چاٹے ہے
وہ لب کہ سامنے یاقوت جس کے ہے پتھر
وہ لب کہ جسکے ثنا خواں ہیں برگ گل سارے
وہ لب کہ حضرت عیسٰی ہوں دیکھ انھیں مضطر
قیامت ان میں یہ اعجاز ہے کہ جی اٹھیں
سبھی جہان کے مردے جو کردیں چھو منتر

چھو منتر خاص مداریوں کا محاورہ ہے اور بڑے مزے سے بندھا ہے

ایک دوسرا قصیدہ ہے

لکھے ہے باخط گلزار، اشتہار اب کے
زمین کے صفحہ پہ یوں واقعہ نگار اب کے
نسیم لائی ہے گلشن میں وہ بہار اب کے
کہ حکم گل کا رکھے ہے خار اب کے

ذرا آگے بڑھ کر فرماتے ہیں۔

میں کیا بیان کروں مستی بہار کا رنگ
غرض ... ہیں مست تا کبار اب کے
قیاس اس پہ کیا چاہیئے کہ صوفی کے
یہاں تلک ہے حواسوں میں انتشار اب کے
کہ ایک جرعۂ مے کے لئے سر بازار
وہ ساتھ رندوں کے کرتا ہے تو تکار اب کے

"تو تکار" اور "تو تو میں میں" ٹھیٹھ اردو کے محاورے ہیں۔ بولے بہت جاتے ہیں لکھنے میں کم آتے ہیں۔ حکیم صاحب کو قافیہ ملا۔ اب کہاں جانے دیتے تھے۔

لکھ گئے اور ایسا لکھ گئے کہ واہ واہ۔ صوفی کا رنگ دکھانے کے بعد زاہد کہاں بچنے والے تھے ان کو بھی دھر گھسیٹا۔

نہ ہو گا پاس اگر کچھ تو جام مے کے لئے
رکھے گا دیکھنا زاہد گرو ازار اب کے

جورو کی ازار گروی رکھنے کا محاورہ ہے۔ انھوں نے زاہد کی ازار گروی کرادی۔ زاہد کی تہمد اگر گروی کراتے تو اچھا تھا۔

اس کے بعد فرماتے ہیں کہ آسمان اب کسی کو اذیت نہیں دیتا۔ ترے ڈر سے اس کی گردش کو بھی سکون ہو گیا ہے۔ مگر مجھ سے اسے کچھ خاص دشمنی ہو گئی ہے۔

پر اک کھڑپینچ ہے مجھ سے کہ اس مہینے میں ۔۔۔ یہی کہے ہے کہ تو خرچ کر اُدھار اب کے
سو داد خواہ ہوں تجھ سے کہ اس کے کانوں کو ۔۔۔ مروڑ دے تو ذرا شاہ نامدار اب کے

واقعی بڑی خوبی سے تنخواہ نہ ملنے کی شکایت کی ہے۔ کھڑپینچ کا لفظ شاید آپ کسی دوسرے شاعر کے ہاں نہ دیکھیں گے۔

اپنے ایک قصیدے میں حکیم صاحب ایک ایسا لفظ استعمال کر گئے ہیں کہ شاید دہلی والوں کے سوا کسی اور نے سنا بھی نہ ہو گا۔ قصیدہ ہے۔

جہاں میں دیکھو تو اللہ رے فیض ابر بہار ۔۔۔ کہ دھو دیا ہے زمیں تو زمیں دلوں کا نجار
خواص باد بہاری کا میں اگر لکھوں ۔۔۔ تو ہوئے صفحۂ قرطاس غیرت گلزار
جہاں سے دور ہوئی یہاں تلک پریشانی ۔۔۔ کہ گھس لگانے کو ملتی نہیں جو ڈھونڈو ہزار

گھس لگانا اب دلی والے نہیں بولتے۔ حیدرآباد میں یہ محاورہ اب تک رائج ہے آگے ساقی کو پکارتے ہیں۔

پلا دے جلد وہ ساقی مجھے مئے گلنار ۔۔۔ کہ جس کے پینے سے گلگوں طبع ہو ر ہوار

شتاب دے مئے گلرنگ بھر کے ساغر میں — کہ سمت قبلہ سے اُٹھا ہے ابر دھوندو نکار

دھوندوں نکار کے لفظ کو دیکھئے اور ابر کی اضافت کو دیکھئے، دھوندو نکار ایسے ابر کو کہتے ہیں جو گرجے بھی بہت اور برسے بھی بہت. میری نظر سے صرف ایک شعر اور گزرا ہے جس میں یہ لفظ استعمال ہوا ہے. خدا معلوم بچارے کس میر شکار کی ہجو تھی کہ دلی کے بچے کی زبان پر رواں ہوگئی. ادھر گھرا ابر آیا ادھر بچوں نے غل مچایا.

کڑکے گی کڑک بجلی — برسیں گے دھوندو نکار
بہیں گے گو کے ٹوکرے — جائیں گے میر شکار

دھونکار کا لفظ یا وہاں سنا تھا یا اب حکیم صاحب کے قصیدے میں دیکھا.

ایک ہی تیر میں شاید ہوا کام عاشق — کیونکہ آواز نہیں آئی پھر اک آئے کے بعد

دوسرے شعر میں "آئے" کا لفظ حکیم صاحب نے غضب کا استعمال کیا ہے کوئی دوسرا ہوتا تو "ہائے" لکھتا. کیونکہ وہ بھی قافیہ تھا. انھوں نے بجائے "ہائے" کے "آئے" لکھا ہے. حکیم تھے، اس لئے ہائے، اور آئے، کا فرق جانتے تھے. جب کسی کو سخت تکلیف ہوتی ہے. یا ایسا کاری زخم لگتا ہے کہ پورا سانس پیٹ میں نہیں سماتا تو "ہائے" کا لفظ اس سے ادا نہیں ہوسکتا. کیونکہ "ہ" کے ادا کرنے کے لئے پورا منہ کھولنا پڑتا ہے. اور اس کے لئے سانس کی ضرورت ہے ایسے موقعے پر بیمار یا زخمی صرف ایک دلدوز "آئے" کرتا ہے اور ٹھنڈا ہو جاتا ہے. ہائے ہائے تو وہ بیمار کرتے ہیں جن کو تیمار داروں کو دن میں تکلیف دینی اور رات کو جگانا منظور ہوتا ہے یقین جانئے کہ اُردو لٹریچر میں صرف حکیم صاحب ہی نے یہ لفظ استعمال کیا ہے. اور اس طرح استعمال کیا ہے کہ تعریف نہیں ہوسکتی. فرماتے ہیں کہ شاید ایک ہی تیر میں عاشق کا

کام تمام ہوگیا۔ کیونکہ صرف ایک "آئے" کی آواز آنے کے بعد پھر کوئی آواز نہیں آئی۔ اگر تیر اُچٹتا ہوا لگتا تو ہائے ہائے سے اس نے آسمان سر پر اُٹھا لیا ہوتا۔

اسی شعر کے متعلق ایک عجیب لطیفہ ہوا۔ میں چند دوستوں میں بیٹھا اس "آئے" کی تعریف کر رہا تھا۔ سب دوستوں نے بھی تعریف کی اور کہا کہ واقعی "ہائے" کے لفظ سے شعر میں وہ خوبی نہ رہتی جو اب پیدا ہوگئی ہے۔ میرے ایک دوست سنتے رہے۔ کچھ سوچتے رہے۔ آخر کہنے لگے "کیوں بھئی اگر "آئے" کی جگہ "ہائے" ہوتا تو کیا ہرج تھا۔ آخر وہ بھی تو قافیہ ہے، اگر آپ کی بھی یہی رائے ہے۔ تو میں نے خواہ مخواہ آدھا صفحہ لکھ کر آپ کا اور اپنا دونوں کا وقت ضائع کیا۔ میری ہی غلطی سہی، حکیم صاحب کا دیوان خود ان کا صحیح کیا ہوا ہے۔ نہایت صاف خط ہے۔ "آئے" کے الف پر بڑا موٹا "مد" دیا ہوا ہے۔ اگر "ہائے" اسی طرح مد سے لکھتے ہیں تو آپ کی رائے صحیح اور میری غلط۔

جو ہیں دُھر سے گرفتار محبت اُٹھاتے ہیں وہی بیمار محبت

دُھر روز ازل کے معنی میں استعمال کیا ہے۔ دُھر محاورے میں پرے کنارے کو کہتے ہیں۔

مجھ سے بولے، کل نشہ میں خوب ہنکار رہے ہیں آپ
یہ نہ سمجھے اور ہی وہ بے حیا تھی میں نہ تھا

ایک قصہ مشہور ہے کہ آصف الدولہ ہاتھی پر سوار جا رہے تھے۔ ایک شرابی نشے میں چور سڑک کے کنارے لیٹے تھے۔ جب سواری پاس سے گذری تو آپ نے آواز لگائی "ابے۔ او، ہاتھی والے۔ ہاتھی والے۔ ہاتھی بیچتا ہے؟" نواب نے کوتوال کو اشارہ کیا۔ وہ شرابی صاحب کو اٹھا کر لے گئے۔ چاوڑی پر لے جا کر بہت کچھ مرمت کی، نشہ ہرن ہوگیا۔ جب ذرا درست ہوئے تو دربار میں لے جا کر پیش کیا۔ آصف الدولہ

نے مسکرا کر پوچھا "کہو بھئی، ہاتھی خریدتے ہو؟" شرابی نے کہا "سرکار بھلا میں اور ہاتھی خریدوں۔ کھانے کو کوڑی نہیں۔ ہاتھی خرید کر کس کے گھر باندھوں گا۔ چوہا بل میں سمائے نہیں اور دُم سے باندھے چھاج۔" نواب نے کہا "ارے بھئی۔ تھوڑی دیر تو ہوئی جو تم نے ہاتھی کی قیمت پوچھی تھی۔" شرابی نے کہا "حضور وہ خریدنے والا دوسرا تھا۔ وہ چلا گیا۔ میں رہ گیا۔" آصف الدولہ نے خوش ہو کر ہاتھی دے ڈالا۔ یہ جاتے جاتے بیچ کر شراب پی گئے۔ اس شعر کے لکھتے وقت حکیم صاحب کے پیش نظر یہ قصہ ضرور ہوگا۔ اسی زمانہ کی بات تھی، ایسی باتوں کے چرچے بہت ہو جاتے ہیں۔ شاعروں کو مضمون مل جاتا ہے۔ لیلیٰ مجنوں اور شیریں فرہاد کے قصّے نہ ہوتے تو اردو شاعری آدھی رہ جاتی۔

کس کو ملنے کا اس کے چاؤ نہیں	کس کو اُس شوخ سے لگاؤ نہیں

دل تھا اپنا دیا جسے چاہا	کچھ کسی کا ہمیں دباؤ نہیں

اُس کے رُخ کی وہ آب و تاب ہے عیشؔ	مہ و خورشید جس کے پاؤ نہیں

"پاؤ" کا خوب قافیہ نکالا ہے۔ اُس زمانہ میں نان پاؤ نہ نکل آنا تو کیا تعجب ہے کہ حکیم صاحب معشوق کے گالوں سے تشبیہ دے دیتے۔ ان کو تو نئے نئے قافیوں کی تلاش ہی رہتی تھی۔

سخت مضامین | حکیم صاحب کے دیوان میں بعض شعر ایسے ہیں کہ کسی فلسفہ یا حکمت کی کتاب میں شریک کر دیئے جائیں۔ تو بہتر ہے شعر ان حجتوں کی تاب نہیں لا سکتے۔

دل کی بیتابی ہے بالذات اور اس کی بالعرض
باعث جنبش سیماب ہے سیماب میں آب
ہو گئے اس سے قوی اور مقوی اجزا
ساتھ ان کے جو ملا کر یہ کھرل کی تھی

یاد مژگاں کی یہاں کیا ہے، کسی نے گویا
نیشتر ڈال کے اندر ہیں گھنگھے دل کے

نشتر گھنگون جراحوں کی اصطلاحوں میں زخم میں گھر انشتر لگا کر ادھر اُدھر کے خراب گوشت کے کاٹنے کو کہتے ہیں۔

جبر و قدر کا مسئلہ اس طرح حل کرتے ہیں۔

رباعی

انسان ہے اختیار میں بھی اپنے مجبور اس رمز کو سمجھیں وہ جو ہیں اہل شعور
بالفرض ہے اختیار و جبر اس کو حاصل بالذات نہیں ہے اس کو کچھ بھی مقدور

حکیم صاحب کے دیوان میں زبان کے ساتھ مضمون کی | مضمون کے ساتھ زبان
بھی کمی نہیں ہے، ایسے سیکڑوں شعر اوپر لکھ آیا ہوں۔ چند شعر اور لکھ دیتا ہوں مضمون بہت بڑھ گیا ہے۔ آپ پڑھتے پڑھتے گھبرا گئے ہوں گے۔ میں لکھتے لکھتے تھک گیا ہوں۔ اب اس قصے کا سمیٹ دینا ہی بہتر ہے۔

پوچھا جب منصور سے تو نے انا الحق کیوں کہا
یہ کہا اُس نے کہ وہ شان خدا تھی میں نہ تھا

انا الحق کی اس شان کی وجہ آپ نے بہت کم دیکھی ہوگی "شان خدا" نے شعر میں جان ڈال دی ہے۔ اور معنی میں عجب وسعت پیدا کر دی ہے۔ اسی غزل میں ایک اور بڑا چبھتا ہوا شعر ہے۔

میں نے کیا افشا کیا راز اس کا سوچ اے ہمنشیں
باعث افشار راز اس کی حیا تھی میں نہ تھا

بے حیائی تیرا ہی آسرا۔ فرماتے ہیں، میں نے ان کو کب رسوا کیا میری طرح وہ بھی بے حیا ہو جاتے تو کوئی خیال بھی نہ کرتا۔ ان کی شرمیلی شکل نے

بھانڈا پھوڑ دیا۔ سچ ہے "جس نے کی شرم اس کے پھوٹے کرم"۔
اسی مضمون کو ایک دوسرے شعر میں باندھا ہے۔

میری چاہت کو نہ ملنے سے سبھوں نے جانا   تم اگر ملتے تو یہ راز نہ افشار ہوتا

ادب آداب کے مضمون سنئے۔

آداب میکدہ سے نہیں بہرہ آپ کو   رستہ لو جاؤ شیخ جی تم، خانقاہ کا

فتوئے پیر مغاں ہے کہ ہے مے اس پہ حرام
آتے جس شخص کو مے پینے کے آداب نہیں

نصیحتیں | نصیحتیں ملاحظہ فرمایئے ماننا نہ ماننا ان کا فعل ہے۔

یہ عیش جائے غور ہے شکوہ ہو اس کا کیا
انسانیت سے اپنی جو انسان نکل گیا
"عیش سب اپنی برائی ہے۔ نہیں کوئی بُرا
سب بھلے ہیں یہ اگر آپ ہے انسان اچھا
شکوہ غیروں کا ہے اے عیش، عبث کیا کہئے
ان سے بدتر ہیں اگر دیکھئے احباب کے ڈھنگ
مدار دوستی و دشمنی کا اللہ نے
رکھا جہاں ہیں انسان کی زبان پر ہے

سچ فرماتے ہیں یہ دو انگل کی للو دشمن کو دوست اور دوست کو دشمن کر دیتی ہے۔

توڑ سکتا ہے تو بس نفس کو دے اپنے شکست   اور بنانا ہے تو قصر دل احباب اپنا

مشاعرے کی غزل ہے۔ ذوق کے شعر بھی اس زمین میں ہیں۔ وہ اسی قافیہ کو اس طرح باندھتے ہیں۔

سرمۂ چشم عزیزاں نہ بنایں اے چرخ! کیا بنا خاک غبار دل احباب بنا

مقابلہ کریجئے، حکیم صاحب کا شعر بڑھا ہوا ہے۔ دو نصیحتیں ایک شعر میں جمع کردی ہیں اور دونوں ایسی ہیں کہ آب زر سے لکھنے کے قابل ہیں۔

متفرق اشعار | عاشقانہ رنگ ملاحظہ ہو۔

ہے عیش تنک ظرفی معشوق سے یہ کہنا ہم جان فدا کرتے۔ گر وعدہ وفا ہوتا

اچھا شعر ہے۔ عاشق کو جان فدا کرنے کے لئے کسی سبب کی ضرورت نہیں۔ یہ تو ایرے غیروں کا کام ہے کہ بیمار پڑے بغیر نہیں مرتے۔

تھی وصیت سب سے اس ناکام الفت کی یہی
میں کبھی مرجاؤں لیکن کیجیو خالی میں پھول

ذیقعدہ کے مہینے کو دلی میں خالی کا مہینہ کہتے ہیں۔ جن کا آغوش تمنا ہمیشہ خالی رہا۔ ان کے پھول کچھ خالی ہی میں ہونے مناسب ہیں۔

کہاں مجنوں نے مجھ کو دیکھ کر، اے عیش حیرت سے
خداوند جہاں۔ آشفتہ جاں ایسے بھی ہوتے ہیں

دیکھنا کس خوبی سے اپنے کو مجنوں سے بڑھا دیا ہے۔ دوسرا مصرعہ بندش کا بہترین نمونہ ہے۔

پابندی ہے اے عیش، بری سب کے لئے، پر
سچ یوں ہے کہ پابندیٔ آزاد غضب ہے

کتنا سچا مضمون کس خوبصورتی سے نظم کیا ہے کہ سبحان اللہ۔ عورتیں گھر میں بیٹھنے سے نہیں گھبراتیں۔ کسی سیلانی جوڑے کو پردہ بٹھا دو تو مزا آئے۔

پوچھے وہ حال دل غمزدگاں کا کیونکر لب ہلانے کی بھی فرصت جسے انداز نہ دے

مرغ دل چپکے سے کیا تیر نگہ نے مارا خوبی تیر یہی ہے کہ وہ آواز نہ دے

بھلا اب ہندوستان والے اس دوسرے شعر کی خوبی کیا سمجھیں گے، جنہوں نے تیر چلانا تو کیا تیر دیکھا بھی نہ ہوگا۔ توپ چلتی دیکھی ہے اس کی یہ تعریف ہے کہ کان پھٹ جائیں۔

یہ نہیں جانتے یاروں کو خبر سب کچھ ہے ۔۔۔ وہ سمجھتے ہیں کہ کھلتا نہیں میرا احوال
ورنہ کرنے کو تو کرتا یہ بشر سب کچھ ہے ۔۔۔ ایک تقدیر کے ہاتھوں سے تو لاچار ہے یہ

شیخ تو اپنے گریباں میں منہ ڈال کے دیکھ
تیری تسبیح کو ہے رشتۂ زنار سے فیض

سچ ہے۔ تسبیح کیا ہے گرہ دار زنار ہے۔

ہائے کیا شعر کہہ گئے ہیں۔

ہم نہیں جانتے کہ کیا ہے دل ۔۔۔ سینہ میں اک کھٹک سی ہے بس اور

"کھٹک" کا لفظ ایسا آیا ہے کہ کسی کو نصیب نہیں ہوتا۔ شاعری کے لحاظ سے تو یہ شعر لاجواب ہے۔ ہاں اس سے حکیم صاحب کی حکمت پر حرف آتا ہے۔ اگر اتنا بھی نہیں جانتے کہ دل کیا ہے تو خاک حکمت کرتے ہوں گے۔ اسی رنگ کا ایک شعر شیفتہ نے کہا ہے۔ اور واقعی خوب کہا ہے۔

جو آگ سی ہے سینہ کے اندر لگی ہوئی ۔۔۔ شاید اسی کا نام محبت ہے "شیفتہ"

گردش ہے اس کی چشم کو مستی ہیں، یا کہیں
نرگس کا پھول تیر رہا ہے شراب میں

سبحان اللہ کس غضب کی تشبیہ دی ہے۔ شراب کے نشہ میں یار کی آنکھ کے کوئے گلابی ہو گئے ہیں۔ نشہ کی وجہ سے آنکھ قائم نہیں ہوتی۔ کچھ آنکھوں میں پانی بھر آیا ہے۔ بس یہ معلوم ہوتا ہے کہ "نرگس کا پھول تیر رہا ہے شراب میں" آنکھ کو نرگس سے ہی تشبیہ دیتے آئے ہیں۔ مگر ایسی تشبیہ نہ کبھی دیکھی نہ سنی۔ کوئی معشوق نشے

میں ہو، اس وقت اس کی آنکھیں دیکھو جب اس شعر کا مزا آئے گا۔

بخشش کی اُمید حکیم صاحب کو بڈھے ہو کر مرنے کا بڑا فکر ہو گیا تھا۔ اپنی بخشش کیلئے نئی نئی حجتیں سوچتے اور دل کو تسکین دیتے تھے۔ جوانی میں مرجاتے تو یہ شعران کے دیوان میں نہ ہوتے۔ بات یہ ہے کہ بڈھے مرنے سے بہت ڈرتے ہیں۔

اس قدر راہ عدم سیدھی ہے آعیش کہ واں — کئے بند آنکھ بھلے اور بُرے جاتے ہیں

نہ بھول زہد پہ لذت ہے بخشش حق کی — وہ بے نصیب ہے جب تک گنہگار نہ ہو

اس کے میں تو یہ معنی سمجھا ہوں کہ زہد پر اگر تیری بخشش ہوئی تو کیا کمال ہوا، جو کیا تھا اس کا پھل پایا۔ ارے میاں نصیبہ ور تو وہ ہیں جو گنہگار تھے اور پھر بخشش ہوئی بخشش تو گنہگاروں ہی کی ہوتی ہے۔ بھلا زاہدوں کی بخشش بھی کوئی بخشش ہے، یہ تو اوے کا بدلہ ہے۔

بھلا عیش، کیا خوف محشر ہے تم کو — وہ بخشندہ ہے اور گنہگار ہم ہیں

وہی اوپر والا مضمون ہے۔ صرف زاہد پر طعن نہیں ہے۔ عمر خیام نے اسی مضمون کو کس عمدگی سے ادا کیا ہے کہ سبحان اللہ فرماتے ہیں۔

یارب تو کریمی و کریمی کرم است — عاصی زچہ رہ بیروں زباغ ارم است

باطاعتم از بنجشی آں نیست کرم — بامعصیتم از بنجشی کرم است

قدسی کا بھی ایک شعر اس مضمون میں لاجواب ہے

'قدسی' ندانم چوں شود سودائے بازار جزا

او نقد آمرزش بکف من جنس عصیاں در بغل

پرانے زمانے کے مولوی اس شعر کے یوں معنی کرتے ہیں کہ خدا معلوم حشر میں کیسی گزرتی ہے۔ ہمارے پاس کھوٹی جنس ہے۔ اور اس کے پاس کھرے روپے۔ یقیناً منہ کالا ہوگا۔ دھکے دے کر نکلوا دئیے جائیں گے۔

آج کل کے زمانے کے پروفیسر اس شعر کے دوسرے معنی لیتے ہیں۔ وہ اس کا ترجمہ یوں کرتے ہیں کہ وہ جنس عصیاں خریدنے کو نقد آمرزش لئے بیٹھا ہے۔ اپنی پوٹلی نکال اس کو دی۔ نقد دام وصول کر گھر کو آ گئے۔ ہم کو نہیں معلوم کہ یہ بازار روز جزا جس کا لوگوں نے اتنا غل مچا رکھا تھا، ہے کیا بلا۔

قدسی کے شعر کے جو معنی ہیں بس وہی معنی حکیم صاحب کے شعر کے ہیں۔ "وہ بخشندہ ہے اور گنہگار ہم ہیں" کا مطلب یہی ہے کہ "اس ہاتھ دے اس ہاتھ لے" کا نقد سودا ہو جائے گا۔

سہرا | جواں بخت کا سہرا غالب نے بھی کہا تھا۔ ذوق نے بھی کہا تھا۔ بھلا حکیم صاحب کیوں پیچھے رہتے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ سہرا کہنے کا دستور اس زمانے میں عام تھا۔ کچھ مرزا غالب کی ایجاد نہیں ہے، جیسا کہ عام طور پر اس زمانے میں سمجھا جاتا ہے۔

آج تک چشم فلک نے بھی تو دیکھا ہی نہیں اس جواں بخت کے سہرے کے مقابل سہرا
ایسے نوشہ کے لئے ایسا ہی سہرا تھا ضرور بندھتے ہی کیا رخ نوشہ پہ گیا کھل سہرا

نیا مضمون | حکیم صاحب کے مکان میں باغیچہ تھا۔ کوئی مالی بھی ضرور ہوگا۔ اسی وجہ سے شاید تھوڑے بہت فن باغبانی سے بھی واقف ہو گئے تھے۔ ورنہ یہ شعر ان کے قلم سے نکلنا ممکن نہ تھا۔

ان دنوں نالۂ دل کو ہے اثر سے پیوند بے ثمر نخل ہوا نخل ثمر سے پیوند

یہ صرف جاننے والے ہی جانتے ہیں کہ بے ثمر درخت کی شاخ ثمردار درخت سے پیوند نہیں کھاتی۔ اتنا سمجھنے کے بعد شعر بالکل صاف ہو جاتا ہے کہ یا الٰہی آج کل یہ ناممکن بات کیسے ہو رہی ہے۔ کہ نالہ جیسی بے ثمر شے اثر جیسی ثمردار چیز سے پیوند کھا رہی ہے۔

متروک الفاظ ان کے دیوان میں بہت کم الفاظ ایسے آئے ہیں جو اب متروک ہو گئے ہیں۔ اسی سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ انھوں نے اردو کو مانجھنے میں کتنی کوشش کی ہے۔ نمونہ کے طور پر چند شعر لکھتا ہوں۔

جھفتے تو نہ پڑ جاتے کچھ شان میں اے ظالم کیا حال ہے کہہ تیرا۔ اتنا تو کہا ہوتا

شعر میں بُری تعقید ہے اور جھفتے پڑنے کا محاورہ بھی اب نہیں بولا جاتا پہلے عام طور پر خرابی کے معنی میں استعمال ہوتا تھا۔ اب صرف کپڑوں میں جھفتے پڑتے ہیں۔ دھوبیوں کی اصطلاح رہ گیا ہے۔

تھکانے سے غیروں کے کیا کیجیے اب اس کا ہر بات میں وہ مجھ سے تکرار اُٹھاتے ہیں

اب تکرار کرنا بولتے ہیں۔

چپ رہو بدزبانیاں نہ کرو ایسی باتیں دیوانیاں نہ کرو

خدا معلوم یہ جمع کا استعمال کیوں ترک کر دیا گیا ہے۔ اس سے تو زبان ایسی میٹھی لگتی تھی، کہ کیا کہا جائے۔ اب آپ خود ہی دیکھ لیجیے۔ پہلے کہتے تھے "ایسی باتیں دیوانیاں نہ کرو"۔ اب کہتے ہیں "ایسی دیوانی باتیں نہ کرو"۔ انصاف آپ کے ہاتھ ہے۔ سچ کہیے گا کہ پہلا فقرہ نرم نرم ہے یا دوسرا فقرہ۔

اس ہستیٔ موہوم پہ نازاں نہ ہو غافل کیوں، اس کی نمایش ہے تماشا گزری کا

اب ایسے موقعے پر کیوں کی جگہ کیوں استعمال ہوتا ہے۔

خانہ دل میں بسا کون سا گلرو ایسا کہ جو آتا ہے پسینہ تجھے خوشبو ایسا

آج کل خوشبودار کہتے ہیں۔ فارسی میں خوشبو اور بدبودار کو بدبو کہتے ہیں۔ حکیم غوث کی ہجو میں سودا نے کہا ہے۔

صورت و شکل اس کی ہے بدبو دقیر جیسا کہ جلاب کا دست اخیر

دار کی شاخ اُردو دانوں نے لگائی ہے۔ اچھا کیا۔ اپنا مال ہے

چاہے توڑیں چاہے جوڑ نے کی مثال تو یہ ہے۔ توڑنے کی مثال بھی دیکھ لیجئے۔

صدمۂ عشق جس بشر کو ہے — شابش اس کے دل وجگر کو ہے

شاد باش سے گھٹ کر شاد باش ہوا، ذوق فرماتے ہیں۔

کیا شاد کو خفیف کرے ہے زبان خلق — شاباش جس کو کہتے ہیں وہ شاد باش ہے

اب شاباش سے اور گھٹ کر شابش رہ گیا۔ لکھنے میں شاباش آتا ہے۔ مگر بولنے میں شابش ہی کہتے ہیں۔

کلام کی کمزوریاں | حکیم صاحب کی تعریفیں ہو چکیں۔ اب تھوڑی سی برائیاں ہو جائیں۔ تو اچھا ہے۔ سب سے زیادہ خرابی تو یہ ہے کہ ان کے کلام میں تعقید بہت ہے۔ ذرا غور سے دیکھئے گا۔ تو جو کلام آپ پڑھ آئے ہیں، اس میں ہی بیسوں ایسی مثالیں ملیں گی مثلاً یہ شعر۔

"میں" کی گردن پہ چھری۔ یوں کہے خورشید فلک

سامنے میرے رخ یار کا ہمسر میں ہوں

جب عندلیب چمن سے ہوا چمن خالی — تو آبسے اسے پا، زاغ اور زغن خالی

یا

آدمی کی شکل وصورت سے نہ کہئے آدمی — آدمی جب آدمی میں آدمیت ہو تو ہو

بات دراصل یہ ہے کہ باتیں کرنے میں تعقیدوں کا خیال نہیں رہتا۔ حکیم صاحب تقریر کو تحریر میں لاتے ہیں۔ اس لئے یہ الجھاؤ پڑ جاتا ہے۔ بولنے میں یہ چیز عیب نہیں، لکھنے میں عیب ہے۔

ان کے کلام میں سب سے زیادہ قابل اعتراض چیز لفظ "سنا" کا استعمال ہے۔ معلوم نہیں کہ یہ اُن کا تکیہ کلام تھا یا کیا تھا۔ ایسی ایسی جگہ "سنا" ٹھوس دیا ہے کہ سننے کو جی نہیں چاہتا۔ اوپر کے مضمون میں کئی مثالیں اس کی موجود

ہیں۔ دو تین اور دیکھ لیجئے۔

بحر ہیں عالم فانی کے دل اتنا نہ ابھر بلبلا کیونکہ ہے انسان، سنا، پانی کا

اسی مضمون کو کسی شاعر نے کیا خوب باندھا ہے۔

کیا بھروسہ ہے زندگانی کا آدمی بلبلا ہے پانی کا

وہی ہوگا تری قسمت میں جو لکھا ہے، سنا، بیقراری ہے تجھے اے دل بیتاب عبث

رباعی میں لکھتے ہیں

کل بزم میں بھر کے ایک پیالی مے کی کرنے لگے یہ صفت کلالی مے کی

اس دور میں سب کے دعوے جھوٹے ہیں، سنا، ثابت ہے فقط نمک حلالی مے کی

نمک ڈالنے سے شراب سرکہ بن جاتی ہے اور سرکہ حلال ہے اس طرح شراب کی نمک حلالی ثابت کی ہے۔ اس رباعی میں بھی لفظ "سنا" موجود ہے خیر یہاں "سنتے ہو" کے معنی تو دیتا ہے۔ دوسری جگہ تو محض بھرتی کا لفظ ہے۔

قصیدہ میں لکھتے ہیں۔

یہ عید جشن کا اس کے مقدمہ ہے سُنا اب اس کے جشن کا بھی حال سُن لو بالاجمال

ہر ایک دکھائے ہے باتوں میں باغ سبز سُنا جہاں میں باد بہاری کا فیض ہے یہ کثیر

غرض رباعی ہو، قصیدہ ہو، غزل ہو، حکیم صاحب کا "سُنا" کہیں نہ کہیں ضرور موجود ہوگا۔ اگر ہد ہد کے کلام میں ایک جگہ بھی یہ لفظ آیا ہوتا تو میں تسلیم کرلیتا کہ اس کو حکیم صاحب ہی غزلیں لکھ دیا کرتے تھے۔

حکیم صاحب اردو اور فارسی الفاظ میں داو عطف اور اضافت نہایت بے تکلف طور پر استعمال کر جاتے ہیں۔ بعض اصحاب اس کو ناجائز سمجھتے ہیں میری سمجھ میں نہیں آتا کہ آخر یہ کیوں۔ جب ہم نے فارسی سے الفاظ لئے اور ان کے ساتھ اضافت اور داو عطف بھی آگئے تو پھر اختیار ہے جس طرح

چاہیں ان کو استعمال کریں۔ اُردو میں آنے کے بعد وہ الفاظ اردو کے ہو گئے۔ فارسی کی ترکیبوں سے ان کو کیا غرض۔ ہمارا مال ہے جس طرح چاہیں استعمال کریں۔ نہیں تو وہ ساس والی مثل ہوگی کہ بہو سے فرماتی ہیں کہ "بیٹا گھر بار تیرا ہے، کوٹھری کٹھلے کو ہاتھ نہ لگائیو" آتش نے ایسے اعتراض کرنے والوں کا جواب خوب دیا تھا۔ آپ کا ایک شعر ہے۔

دختر رز میری مونس ہے میری ہمدم ہے　　میں جہاں گیر ہوں وہ نور جہاں بیگم ہے

ایک صاحب نے کہا "استاد بیگم ترکی لفظ ہے، اس کے "گ" پر پیش ہے۔ گ کو زبر سے باندھنا غلط ہے" آپ بھنّائے ہوئے بیٹھے تھے جواب دیا "ہاں ٹھیک ہے۔ ترکستان جائیں گے تو بیگم ہی بولیں گے" حکیم صاحب نے تو یہ غضب کیا ہے کہ ہندی اور فارسی الفاظ کے بیچ میں اضافت دینا تو کیا۔ اُردو کے فقروں اور لفظ میں اضافت ڈال دی ہے۔ فرماتے ہیں۔

ایک ہی تیر میں شاید ہوا کام عاشق　　کیونکہ آواز نہیں آئی بس ایک آئے کے بعد

"کام ہونا" کے معنی ہیں، "کام تمام ہونا" یہ ٹھیٹھ اُردو محاورہ ہے۔ انھوں نے اس میں اور عاشق میں اضافت ٹھونک دی ہے، بہت اچھا کیا۔

شتاب دے مئے گلرنگ بھر کے ساغر مے　　کہ سمت قبلہ سے اُٹھا ہے ابر دھونڈوں کار

عنصر خاک سردو دل یہ گرم　　کون سی خاک سے بنا ہے دل

غرض کہاں تک لکھوں سیکڑوں مثالیں ہیں۔ ذرا اہل زبان پھر غور فرمالیں کہ ہندی اور فارسی الفاظ میں اضافت دینے کو آخر کیوں ترک کیا جائے۔ ہماری زبان میں آکر دوسری زبان کا لفظ ہمارا ہو گیا ہے۔ ہم نے گروی نہیں لیا کہ مال پوٹلی میں بندھا، دھرا کیا ہوا رکھا ہے۔ اگر استعمال کرنا ہو تو پوٹلی گلے میں لٹکائیں اور یہ نہ کر سکیں کہ پوٹلی کھول کر جس مال کو

جس طرح چاہیں کام میں لائیں۔ اس قسم کے شرائط اردو کی راہ ترقی میں روڑے ہیں، ان کا ہٹا دینا ہی اچھا ہے۔

پہیلیاں | حکیم صاحب کے جودت طبع کا اندازہ ان کی پہیلیوں سے ہو سکتا ہے۔ بہت ہیں۔ اور سب ہندی میں ہیں، سودا اور انشاء نے بھی پہیلیاں کہی ہیں۔ مگر ان میں اور حکیم صاحب کی پہیلیوں میں کوئی نسبت ہی نہیں۔ حضرت امیر خسروؒ کے بعد اگر مزیدار پہیلیاں ہیں تو بس ان کی ہیں، نمونے کے طور پر چند سن لیجیے۔

نور بصر

ایک پورکھ وہ سب کو دیکھے　　اندھے ہیں سب واکے لیکھے
سات پردوں کے اندر رہے　　سب کچھ آنکھیں دیکھیں کہے

پرچھائیں

ایک ناری کا میلو رنگ　　لگی رہی وہ پیا کے سنگ
اجیارے میں وہ سنگ براجے　　اندھیارے میں چھوڑ کے بھاجے

چراغ

لال مکٹ سر پہ، منہ کالا　　ہے وہ اندھیرے گھر کا اُجالا

چھتہ مگس

ایک مندر کے سہنسر در　　ہر گھر میں تریا کا گھر
بیچ میں اس کے امرت تال　　بوجھ ہے اس کی بڑی محال

امیر خسرو کا رنگ ہے پہیلی کی بوجھ خود بتا دی ہے، محال مکھیوں کے چھتے کو کہتے ہیں۔

آسمان

ایک تھال موتی سوں بھرا سب کے سر پہ اوندھا دھرا
چاروں اوڑھ وہ تھال پھرے موتی اس سے ایک نا گرے

دسپنا (دست پناہ)

ایک پورکھ کا، کالو رنگ گول سیس، دو لمبی ٹنگ
نار کو آئے لیت اُٹھائے پیار کرے اور چمٹا جائے

اس میں بوجھ بتادی ہے۔ چمٹا بھی دسپنے کو کہتے ہیں۔ لفظ نار لکھ کر کیا خوبی سے اشارہ کر گئے ہیں۔

بٹوہ

وا پورکھ جو ہاتھ لگے تم اس سے اور نہ بولو ہاتھ پکڑ کے بند کرو۔ اور کان پکڑ کے کھولو

قمری

ایک ناری نت رہوے جوگن پی کے کارن بھئی بروگن
رہوے انگ بھبوت رمائے جھک جھک پی کو کوک سنائے
عربی ہندی کراک ٹھاوں "اُٹھ ری" سکھی کہ اس کا ناوں

حضرت امیر خسروؒ کی بھی بعض پہیلیاں اسی رنگ کی ہیں۔ اُٹھ کی عربی قُم ہے۔ اس کو ہندی کے لفظ "ری" سے ملاؤ، قمری ہوگیا۔

تاریخیں | حکیم صاحب نے تاریخیں بھی کہی ہیں۔ ان کا نمونہ بھی دیکھ لیجیے۔

تاریخ وفات فخر الشعرا "میر ممنون"

جگت اُستاد تھا فخر الشعرا ر اس نے فرمائی جہاں سے رحلت
جو سخن سنج تھے عالم میں اُنھیں ناگوار ہوئی اس کی فرصت
عیش بھی رکھتا تھا ازبسکہ کمال ان سے اخلاص و محبت و اُلفت

فکر تاریخ میں اس نے جو ذرا — عالم غیب سے چاہی ہمت
تو سر لحد سے ہاتف نے کہا — میر ممنون علیہ الرحمت
(۱۲۶۰) ہجری

مرے جب مہاراجہ ہندو راؤ — تو مغموم سارے حواشی ہوئے
اور احباب بھی ان کے غمناک سب — یہ دلی سے تا بہ کاشی ہوئے
اسی غم میں جب سال تاریخ کے — تہ دل سے ہم بھی تلاشی ہوئے
تو ہاتف سر رہ سے بولا کہ عیشؔ — مہاراج بیکنٹھ باشی ہوئے
(۱۲۷۱ ہجری)

اُستاد ذوق کی تاریخ لکھی ہے۔

بگفت از سر درد ہاتف کہ گشتہ — زباد اجل شمع بزم گل
(۱۲۷۳) ہجری

سید نثار اللہ صاحب کی تاریخ ہوئی ہے

برآورد دودے زجان وبگفت — بجاں آفریں جان شیریں سپرد
(۱۲۱۳) ہجری

اپنے پیر غلام محمد شاہ صاحب المعروف بہ مسکین شاہ کی تاریخ وفات کہی ہے۔

کرد رحلت از جہاں چوں حضرت مسکین شاہ — خار غم در دل خلید از رحلتِ آں نیکذات
عیش چوں سال وفاتش خواست از پیر خرد — "در اصل ذات الٰہی" گفت تاریخ وفات
(۱۲۷۵) ہجری

عمر بخش صاحب کے مکان کی تاریخ "حویلی عمر بخش" (۱۲۷۶) ہجری سے نکالی ہے۔

غالب کی تاریخ وفات کہی ہے۔

رکھتے دل خوش تھے وہ سو بادل خوش　　داخل جنت نعیم ہوئے
(۱۲۸۹) ہجری

حکیم صاحب کے دیوان میں مستزاد بھی ہے۔ مخمس بھی ہیں۔ مسدس بھی ہیں۔ مسدس کا نمونہ شہر آشوب میں دیکھ لیا ہوگا؛ مخمس کے بھی دو بند لکھے دیتا ہوں۔

خمسہ کا نمونہ | حضرت جنید بغدادیؒ کی مناجات۔

"الٰہی واقفی از حالِ زارم　　تو میدانی کہ جز تو کس ندارم"

پر بند لگائے ہیں۔ فرماتے ہیں۔

جہاں میں جو کہ ہیں ہوشیار یا مست　　ضعیف و ناتواں ہیں یا زبردست
عدم کی رہ میں ہمت سب کی ہے پست　　الٰہی راہ مردن سخت راہ است
تو آساں بگذراں زیں رہگذارم

نہیں ہے کوئی ہر گز تیرا ثانی　　ہے بس ارض و سما کا تو ہی بانی
سوا اس کے ہے باقی سب کہانی　　الٰہی گر برانی در بخوانی
تو دانی بندۂ بے اختیارم

قدسی کی مشہور نعت۔

مرحبا سیدِ مکی مدنی العربی　　دل و جاں باد فدایت چہ عجب خوش لقبی

کو خمسہ کیا ہے، فرماتے ہیں:۔

کیا کہوں ذاتِ مقدس تری ایسی ہے نبی　　کہ ترے شان سے ہر ایک کی شوکت ہے دبی
انبیاء کا ہے یہ ورد سحر و نیم شبی　　مرحبا سیدِ مکی مدنی العربی
دل و جاں باد فدایت چہ عجب خوش لقبی

عرش سے فرش تلک ایک تیرا فیض ہے عام　　ہیں گے گل ابر کرم سے تیرے شاداب تمام
مہر الطاف سے شیریں ترے ہر میوۂ خام　　نخلِ بستانِ مدینہ ز تو سر سبز مدام

زاں شدہ شہرۂ آفاق بہ شیریں رطبی

دل میں شرمندہ نہ کیونکر ہوں میں آگاہ ام
کیوں نہ ہو بار خجالت سے مری گردن خم
چھوٹا منہ اور بڑی بات، کیا میں نے ستم
نسبت خود بسگت کردم و بس منفعلم
زاں کہ نسبت بہ سگ کوئے تو شد بے ادبی

مستزاد کا نمونہ ملاحظہ ہو۔

سب مرے ظاہر و باطن سے خبردار ہے تو
اے مرے بار الٰہ
گرچہ عاصی ہوں وے خوش ہوں کہ غفار ہے تو
ہے ترے ہاتھ پناہ
گرچہ ناکارہ و ناچیز ہوں، پر تیرا ہوں
تو ہے معبود میرا
بندہ تیرا ہوں مرا پیدا کرن ہار ہے تو
رکھیو رحمت کی نگاہ

اس تمام مضمون میں میں نے حکیم صاحب کے کلام کے سیکڑوں مختلف نمونے دیدیے ہیں۔ اس سے ان کی طبیعت کا اندازہ ہو سکتا ہے۔ لیکن بعض صاحبوں کا خیال ہے کہ جب تک کسی شاعر کی پوری غزل نہ دی جائے اُس وقت تک اُس کے کلام کے متعلق صحیح رائے قائم نہیں ہو سکتی۔ مجھے اس سے اختلاف ہے۔ کوئی خوش نصیب ہی شاعر ہوتا ہے۔ جس کے دیوان بھر میں کوئی ساری کی ساری غزل مرصع نکل آتی ہو۔ ورنہ یہی ہوتا ہے کہ غزل میں ایک دو شعر اچھے ہوئے اور باقی سب بھرتی کے۔ خذ ما صفا دع ماکدر پر عمل کرکے اچھے شعر چن لو، بُرے چھوڑ دو۔ مولانا روم نے تو کلام مجید کے متعلق بھی یہی عمل کیا ہے۔ فرماتے ہیں۔

من ز قرآں مغز را برداشتم
استخواں پیش سگاں انداختم

پھر بھی دو تین غزلیں پوری کی پوری لکھ دیتا ہوں تاکہ یہ کہنے کی گنجائش نہ رہے کہ مضمون ادھورا رہ گیا۔ غزلیں وہ لیتا ہوں، جو دوسرے بڑے

شاعروں کی غزلوں پر لکھی ہیں، تاکہ یہ الزام نہ لگایا جائے، کہ اچھی اچھی غزلیں چھانٹ کر لکھدیں۔

غالب کی غزل ہے۔

ملتی ہے خوئے یار سے نار التہاب میں ۔۔۔ کافر ہوں گر نہ ملتی ہو راحت عذاب میں

ذوق فرماتے ہیں۔

یاں لب پہ لاکھ لاکھ سخن اضطراب میں ۔۔۔ واں ایک خامشی تیری سب کے جواب میں

مومن کہتے ہیں۔

کیا جانے لکھدیا اُسے کیا اضطراب میں ۔۔۔ قاصد کی لاش آئی ہے خط کے جواب میں

حکیم صاحب کی اسی زمین میں غزل ہے:۔

وہ نالۂ لائے چرخ کو جو انقلاب میں ۔۔۔ مسکن ہے اُس کا اس دلِ خانہ خراب میں
کیفیت ایسی ہے نگۂ مست خواب میں ۔۔۔ زاہد بھی دیکھ لے تو نہائے شراب میں
کیوں، کیا کہیں گے حضرت یوسف جواب میں ۔۔۔ چوری گیا ہے دل جو زلیخا کے خواب میں
شاید کہ عزم کوچۂ جاناں ہے دل کو آج ۔۔۔ بھیجا ہے پہلے جان کو جو اضطراب میں
گردش ہے اس کی چشم کو مستی میں یا کہیں ۔۔۔ نرگس کا پھول تیر رہا ہے شراب میں
اپنا بھی وقت یاد کرو تم نے شیخ جی ۔۔۔ کیا کیا مزے اُڑائے ہیں عہد شباب میں
ضبط فغاں سے ڈر یہ مجھے ہے کہ دل کہیں ۔۔۔ سینے کے باہر آنہ پڑے اضطراب میں
قاتل ابیں عاشقِ مژہ چشمِ مست ہوں ۔۔۔ خنجر گلے پہ پھیر بجھا کر شراب میں
اس کی گلی میں لاکھوں کی جانیں ہیں پائمال ۔۔۔ اے دل بھلا ہیں آپ وہاں کس حساب میں
افشائے راز عشق کے باعث تمھیں تو ہو ۔۔۔ سو بے حجابیاں ہیں تمھارے حجاب میں

پڑھ اس زمین میں اور غزل عیش، اب تو وہ
گوشِ فلک نے بھی نہ سنی ہو جو خواب میں

لکھے ہیں زلفوں کو لام اس کے مناسبت دیں شام کی بھی
بناتے یار سیاہ بھی ہیں، کہے، ہیں ہے شکل دام کی بھی
پسند کرلیں خواص اس کو، سمجھ میں آئے عوام کی بھی
غرض ہو سب کے پسند خاطر، یہی ہے خوبی کلام کی بھی
دیا ہے جس مہروش کو ہم نے دل اپنا، نام خدا وہ وہ ہے
جو دیکھے اس کو تو گم ہو ستی فلک پہ ماہ تمام کی بھی
نزول غم ان کو، پہلے ہی تھا خزاں کے موسم میں، اور اب اس پر
گلوں کی صحبت میں بلبلوں کو ہوئی ہے شدت زکام کی بھی
چلے تو ہو پر سمجھ کے جانا۔ گلی میں اس بت کے حضرت دل
جتا دیا ہے یہ ہم نے تم کو، وہاں ہے رسم اتہام کی بھی
چلے ہیں کعبے کو شیخ صاحب، کہیں ہیں بیت الصنم میں ایسا
کہ واں تو جائیں گے وہ، ولیکن خبر ہے یہاں ایک مقام کی بھی
یقین ہو وعدہ پہ کیونکہ ان کے کیا نہ ایفا کبھی انھوں نے
ہزاروں قسمیں وہ کھا چکے ہیں گے پہلے تیسوں کلام کی بھی
نگیں کو حاصل ہے روسیاہی، جہاں میں ہر چند ہم نے مانا
یہ واقعی ہے، وے جو دیکھو تو بات ہے اس میں نام کی بھی
گیا جو قاصد پیام لے کر ہماری جانب سے پاس اس کے
پیام کیسا، ہوئی اجازت نہ اس کو ہرگز سلام کی بھی
تیرا بھی وحشت زدہ ہے ایسا کہ جو کڑی گم ہو آہوؤں کی
جو دشت وحشت میں دیکھ لیں چال تیرے وحشت خرام کی بھی
لکھے ہیں اے عیش جس زمین میں یہ شعر، تو نے سُنا ہے ہم نے

کہ اس سے پہلے غزل اسی میں ہے میرؔ عالی مقام کی بھی

مقابل اس درِ دنداں کے یہ گہر کیا ہے
اور عیشؔ لعل کی اس لب کے آگے در کیا ہے

خیال یار میں ہوں، محوِ بے خودی ایسا
مجھے خبر نہیں دل کیا ہے اور جگر کیا ہے

کہے ہے عشق میں ناصح کہ ہے ضرر دل کا
جو واقعی ہے ضرر یہی، تو ضرر کیا ہے

کیا ہے نوح کے طوفاں کو تو نے شرمندہ
ارادہ اب ترا کہہ اور چشمِ تر کیا ہے

تو میری آہ سے سینہ سپر نہ ہوا ے چرخ
تجھے خبر نہیں اس آہ میں اثر کیا ہے

تو راہِ عشق کے صدموں سے مت ڈرا واعظ
جو سر فروش ہیں اس رہ میں اُن کو ڈر کیا ہے

تو کس گھمنڈ پہ مثلِ شرر اُچھلتا ہے
خیال دل میں تو کر ہستیِ شرر کیا ہے

خدا نے کھولا ہے یہ راز جن پہ عالم میں
وہ جانتے ہیں کہ ماہیتِ بشر کیا ہے

بتوں کے سجدۂ در کے سوا بتا اے عیشؔ
جہاں میں تو نے کیا اور عمر بھر کیا ہے

مجھ سے پوچھیں ہیں وہ کہ کیا ہے دل
کیا کہوں، خانۂ خدا ہے دل

تیری فرقت میں اے بتِ دمساز
ہو کے آنکھوں سے خوں بہا ہے دل

بل کے اُس سے ہوا مرادِ دشمن
دیکھو کیا سخت بے وفا ہے دل

عنصرِ خاک سرد و دل یہ گرم
کون سی خاک سے بنا ہے دل

اے مہوس جو یار کے در پر
خاک ہووے تو کیمیا ہے دل

غمِ ہجراں میں ہو کے قطرۂ خوں
نوکِ مژگاں پہ آ رہا ہے دل

سینہ میں ایک کھٹک سی ہے اور بس
ہم نہیں جانتے کہ کیا ہے دل

یاد میں اس کے تیرِ مژگاں کے
ہدفِ ناوکِ بلا ہے دل

تجھ سے کوئی بھلا ملے کیونکر
تیرا ہر حرف خود جدا ہے دل

قدر دل کوئی 'عیش' کیا جانے
مخزن رازِ کبریا ہے دل

لیجئے یہ ہیں حکیم آغا جان 'عیش' دہلوی اور یہ ہے اُن کا کلام۔ اچھے بُرے کا آپ اندازہ کر لیجئے۔ ہم تو یہی کہتے ہیں کہ زبان اُردو پر اُن کا بڑا احسان ہے۔ ان ہی لوگوں نے زبان کو مانجھا، محاوروں کا صحیح استعمال بتایا۔ رعایت لفظی سے زبان کو پاک صاف کیا۔ شوخی مضامین سے کلام کو آراستہ کیا۔ اسی دشت نوردی میں ساری عمر گزار دی۔ اور چلتے چلاتے اپنی کمائی بنڈل میں باندھ ہم کو دے گئے۔ کہ لو بھئی یہ تمھارا مال ہے۔ اب تم جانو اور تمھارا کام جانے۔ سنبھال کر رکھا اور اس مال میں اضافہ کیا تو ہمارا بھی نام رہ جائے گا۔ تمھارا بھی نام ہوگا۔ نہیں تو جس طرح دہلی کھو بیٹھے اسی طرح زبان سے بھی ہاتھ دھو بیٹھو گے۔